علی سفیان آفاقی

مقبول اکیڈمی شاہراہ قائداعظم لاہور

کسی زمانے میں بیروت ایک ایسا شہر تھا جس کے تصور ہی سے راتوں کی نیند اڑجایا کرتی تھی۔ نیند تو اب بھی اڑ جاتی ہے مگر پہلے اشتیاق اور خوشی کے مارے اڑتی تھی۔ اب خوف اور دہشت سے اڑتی ہے۔ یہ وہ شہر تھا جسے شہر خوباں کہا جاتا تھا اور یہ عالم میں انتخاب تھا۔ خدا جانے اسے کس کی نظر لگ گئی۔ پرانے زمانے کے لوگ کہتے ہیں کہ اس شہر پر قدرت کا عذاب نازل ہوا ہے۔ کوئی کہتا ہے کسی پہنچے ہوئے فقیر کی بددعا اسے لے بیٹھی۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہو بیروت وہ نہیں رہا جو کبھی تھا اور جس کی شہرت اور خوشبو چار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے زیادہ سفر تو نہیں کئے تھے مگر چند بار ملک سے باہر جانے کا موقع مل چکا تھا اور باہر کی دنیا کا تھوڑا بہت مشاہدہ بھی تھا یہ ۱۹۷۰ء کے آغاز کا ذکر ہے۔ جب مجھے کاروباری سلسلے میں بیروت جانے کا موقع ملا۔ بیروت جانے کے تصور ہی سے میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ ہاتھ پیر سنسنانے لگے۔ ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ یہ عالم وارفتگی طاری ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ چند ماہ قبل میں بیروت کے ائرپورٹ سے گزر کر یورپ گیا تھا۔ ائرپورٹ دیکھ کر دل تو بہت مچلا تھا مگر سفر جاری رکھنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ ہمارے ایک کاروباری ساتھی نے جب یہ خوشخبری سنائی کہ ہمیں یورپ جانا ہے اور راہ میں شائد ہمیں بیروت رکنے کا موقع بھی ملے تو خوشی کے مارے باچھیں کھل گئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب ابھی ہماشما نے جہاں گشتی کا سلسلہ شروع نہیں کیا تھا۔ بیرونی سفر کی نعمت بہت کم لوگوں کے حصے میں آیا کرتی تھی۔ پاکستان نے دنیا کو زیر و زبر کرنا شروع نہیں کیا تھا اور ملک سے باہر خال خال ہی پاکستانی نظر آتے تھے۔ سستا زمانہ تھا۔ اس لحاظ سے کہ اشیاء سستی تھیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ڈالر کی قیمت صرف پانچ روپے تھی۔ اس لئے باہر کے ملکوں میں ڈالر خرچ کرتے ہوئے جان پر نہیں بنتی تھی۔ یہ

بات اور ہے کہ بعض لوگ ان دنوں بھی ہر چیز خریدنے سے پہلے اس کی قیمت کو ڈالروں اور پھر پاکستانی روپوں میں تبدیل کر کے یہ دکھڑا رونا شروع کر دیا کرتے تھے۔ کہ افوہ' یہاں تو بہت مہنگائی ہے۔

پاسپورٹ تیار تھا۔ ویزا لگوانے کی دیر تھی۔ اس دور میں ویزا حاصل کرنا بھی ایسا مشکل نہیں تھا۔ نہ باہر والوں کو پاکستانیوں کے ملنے کا سامنا کرنے کا موقع ملا تھا اور نہ ہی وہ پاکستانیوں سے شاکی ہوئے تھے۔ اس لئے ویزا آسانی سے مل جایا کرتا تھا۔ البتہ غیر ملکی کرنسی حاصل کرنا کارے دارد والا معاملہ تھا۔ حکومت کی طرف سے انتہائی کنجوسی کا مظاہرہ کیا جاتا تھا۔ بہت پوچھ گچھ اور چھان بین کی جاتی تھی۔ بہت سی یقین دہانیاں اور وعدے کرنے پڑتے تھے۔ تب کہیں جا کر ڈالر یا پونڈ کی صورت دیکھنی نصیب ہوتی تھی۔ اگر ہنڈی یا چور بازار سے خریدو تو پونڈ اور ڈالر بہت مہنگا پڑتا تھا مگر جو لوگ مصمم ارادہ کر لیا کرتے تھے اور انہیں مہنگے سستے سے کوئی غرض نہیں تھی۔ تعلقات اور ذاتی رسوخ استعمال کر کے ہم نے بھی کسی غیر ملکی فضائی کمپنی کے ذریعے سفر کرنے کی اجازت حاصل کر لی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ کون سی ائرلائن سے سفر کریں؟ برطانوی کمپنی بی۔ او۔ اے۔ سی کی بھی خاصی شہرت تھی۔ امریکن پین ایم کا بھی شہرہ تھا۔ سوئس ایئر اور ائیر فرانس کی بھی دھوم تھی۔ جرمن کی لفتھانسا کے بارے میں بھی اچھی اچھی باتیں سنی تھیں۔ جب اتنی بہت سی غیر ملکی کمپنیاں فضائی مہمان بنانے پر آمادہ ہوں تو بندہ سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ کس ائرلائن کو پکڑے اور کسے چھوڑے؟

ہماری یہ مشکل ایک دوست نے آسان کر دی۔ انہیں بھی کام کے سلسلے میں یورپ جانا تھا۔ تھے تو تعلیم یافتہ مگر انگریزی میں پیدل ہی تھے۔ کتابی انگریزی پڑھ تو لیتے تھے مگر سمجھنے اور بولنے کا معاملہ ہو تو سانپ سونگھ جاتا تھا۔ یا پھر یوں اٹک اٹک کر بولتے تھے جیسے سبق یاد کر رہے ہوں۔ فقرے غلط سلط' لہجہ قاتلانہ' یعنی ہر لفظ کو قتل کئے بغیر نہ رہتے۔

انہوں نے جب سنا کہ ہم بھی یورپ جانے والے ہیں تو فوراً تشریف لائے۔ بہت مبارک باد پیش کی اور ڈرایا دھمکایا بھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم پاکستانیوں کا یورپ جانا خاصا خطرناک معاملہ ہے' بہت ہوشیاری کی ضرورت ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تنہا سفر کرنا

تو سخت جان جوکھوں میں ڈالنے والی بات ہے۔ ان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ تاریخ روانگی میں تھوڑی سی ترمیم کر کے ہم دونوں کو ایک ساتھ سفر کرنا چاہئے۔ مزید مورال سپورٹ کے لئے انہوں نے بتایا کہ وہ ہم سے پہلے بھی ایک صاحب سے معاملہ طے کر چکے ہیں۔ وہ ٹھیکدار قسم کے نوجوان آدمی ہیں اور پہلی بار ملک سے باہر قدم نکال رہے ہیں' مگر مشکل یہ ہے کہ انگریزی میں ذرا کمزور ہیں۔ کمزوری ان میں یہ تھی کہ میونسپل کمیٹی کے اسکول سے میٹرک پاس کیا تھا' لہٰذا انگریزی سے بالکل نابلد تھے۔ خصوصاً" بولنا اور سمجھنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ "کیا خیال ہے شاہ جی' ہم تینوں کیوں نہ ایک ساتھ سفر کریں؟" انہوں نے اپنی تقریر کا اختتام اس سوال پر کیا۔

"مگر اس سے مجھے کیا فائدہ ہو گا؟" ہم نے پوچھا۔

"اجی فائدہ اور نقصان کی کیا بات ہے۔ اتنے اچھے لوگ سفر میں آپکے ساتھ ہوں گے۔ یہ کوئی کم فائدہ ہے اور پھر وہ بٹ خاصا مضبوط اور جھگڑالو آدمی ہے' اگر کہیں سینگ پھنس گئے تو بہت کام آئے گا۔ شاہ جی وہ تو بندے کی کلائی پکڑ لے تو چھڑانا مشکل ہوتا ہے۔"

ہم نے کہا۔ "خان صاحب! ہم کاروبار کے سلسلے میں یورپ جا رہے ہیں۔ کسی دنگل یا فری اسٹائل مقابلے میں شریک ہونے کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ اور پھر یورپ والے تو بہت مہذب لوگ ہیں۔ لڑائی جھگڑے سے دور بھاگتے ہیں۔ قانون کا احترام کرتے ہیں۔ وہاں ہمیں کسی باڈی گارڈ کی ضرورت نہیں ہو گی۔"

"پھر بھی برا وقت آنے میں دیر نہیں لگتی۔" انہوں نے دانشمندی سے مشورہ دیا۔ "میری مانیں تو ہم دونوں کے ساتھ ہی چلیں۔ ہر طرح کا آرام رہے گا۔"

"مگر میں تو پی آئی اے سے نہیں جا رہا کسی غیر ملکی فضائی کمپنی سے سفر کروں گا۔"

"اپنا بھی یہی خیال ہے۔" وہ بولے۔ پھر کان کے پاس اپنا منہ لا کر کہنے لگے "ایمان سے بات یہ ہے کہ گوروں کے جہاز میں بیٹھ کر اکیلا سفر کرنا اور بھی مصیبت کی بات ہے۔ وہ کم بخت تو ہماری زبان ہی نہیں سمجھتے۔"

لیجئے انہوں نے سارا الزام گوروں پر تھوپ دیا۔ ہم نے کہا "اچھا سوچ کر جواب

دیں گے۔"

مگر سوچنے کے لئے کوئی مہلت نہیں ملی۔ اسی شام کو ہمارے گھر کی گھنٹیاں مسلسل بجنی شروع ہو گئیں اور ساتھ ہی دروازے پر دھم دھم ہونے لگی۔ لگتا تھا کوئی شخص دروازہ توڑنا چاہتا ہے۔ سب گھر والے سہم گئے۔ ہم پولیس کو فون کرنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ باہر سے خان صاحب کی پاٹ دار آواز سنائی دی "شاہ صاحب! دروازہ کھولو۔ دیکھو میں کیا چیز لے کر آیا ہوں۔"

ہمارے دروازہ کھولتے ہی خان صاحب ہماری باہوں میں سما گئے۔ پھر انہوں نے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے ایک لمبے چوڑے' مضبوط سے نوجوان آدمی کی طرف اشارہ کیا اور ہماری بانہوں میں جگہ خالی کر دی۔ وہ پہلوان نما شخص ہم پر حملہ آور ہو گیا۔ پہلے تو اس نے ہمیں بغلگیر کیا اور ہماری ہڈیاں' پسلیاں پناہ مانگنے لگیں۔ پھر انہوں نے نام نہاد مصافحہ کے بہانے ہمارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر ایسا دبایا کہ ہماری چیخیں نکل گئیں۔"

"کیا بات ہے' کوئی تکلیف ہے آپ کو؟" انہوں نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

ہم کیا جواب دیتے۔ آہ بھر کر رہ گئے۔ اندر آ کر وہ ایک صوفے پر گر گئے اور کن انکھیوں سے ہمیں دیکھ کر مسکرانے لگے۔ خان صاحب نے کہا "پہچانو یہ کون ہیں؟"

ہم نے نفی میں سر ہلایا تو وہ پہلوان صاحب دوبارہ صوفے سے اٹھ کر ہماری طرف لپکے۔ ہم نے فوراً کہا "بالکل پہچان لیا' خوب اچھی طرح پہچان لیا۔"

وہ فخریہ انداز میں خان صاحب کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور کہنے لگے "دیکھ لیا میں نہ کہتا تھا کہ وہ مجھے بچپن سے جانتے ہیں۔" وہ دوبارہ صوفے پر گر گئے اور ہمیں پہلی بار اپنے صوفے کی مضبوطی کا احساس ہوا۔

خان صاحب گویا ہوئے "میں نے آپ سے ذکر کیا تھا نا' یہ وہی شوکت بٹ صاحب ہیں۔ ہمارے ساتھ یورپ تک جائیں گے ذرا۔"

بٹ صاحب مسکرائے "بڑا مزہ آئے گا جی' میں بہت مخولیا آدمی ہوں۔ سارے راستے آپ کو خوش رکھوں گا۔"

خان صاحب نے دوستانہ انداز میں انہیں دیکھا اور ہم سے مخاطب ہو کر بولے "یہ بہت اچھا بندہ ہے جی۔ دوستوں کا دوست ہے اور دشمنوں کا دشمن۔ دوست کو تو کبھی بھلا

بھی دیتا ہے مگر دشمن کو کبھی ایک منٹ کے لئے بھی نہیں بھولتا اور دل میں بات رکھ لیتا ہے تو مرتے دم تک نہیں نکالتا۔"

"ٹھیک کہا انہوں نے۔" بٹ صاحب نے خان صاحب کی تصدیق کرتے ہوئے سر ہلایا۔ "خیر چھوڑو جی۔ یہ ہمارے دوست بن گئے۔ سب گل ای مک گئی۔ اب یہ بتاؤ جی کہ ہم کب چل رہے ہیں اور کون سے جہاز سے چل رہے ہیں؟"

گویا انہوں نے اپنا یک طرفہ فیصلہ صادر کر دیا۔ ہم نے خان صاحب کی جانب دیکھا تو وہ انجان بن کر آنکھیں چرا گئے۔ اتنی دیر میں ہم پر یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو چکی تھی کہ بٹ صاحب سے جھگڑا مول لے کر ہمیں نقصان ہی نقصان ہو گا البتہ انہیں ہمراہ لے جانے میں کسی فائدے کا امکان تھا۔

"تو پھر کون سی ائرلائن ٹھیک رہے گی؟" بٹ صاحب نے مجھ سے سوال کیا۔ "پین ایم کیسی ہے۔ سنا ہے امریکہ والوں کی ہے۔ یار امریکی تو بہت پیسے والے اور اچھے لوگ ہوتے ہیں۔ ساری دنیا ان سے ڈرتی ہے۔ سنا ہے کہ خوبصورتی بھی وہاں بہت زیادہ ہوتی ہے۔"

"جی ہاں' ان کے کالے تو ساری دنیا میں اپنی خوبصورتی کے لئے مشہور ہیں۔" ہم نے طنزاً کہا۔

"وہ بھی ٹھیک ہیں۔ کالے ہیں تو کیا ہوا دل والے ہیں۔ اور گلوکاری میں تو ان کا جواب نہیں ہے۔ سنا نہیں وہ..... وہ جو مشہور گانے والی ہے۔ اچھا سا نام ہے اس کا وہ بلیک ہی تو ہے۔"

"بلیک کوئین بھی بہت مشہور ہے۔" بٹ صاحب نے لقمہ دیا اور بلیک ڈاگ کا تو جواب ہی نہیں ہے۔ ان کے ہاں تو گورے بھی بہت زیادہ گورے ہوتے ہیں۔"

تھوڑی دیر اور یہی بحث جاری رہی' بحث کیا تھی یک طرفہ تقریریں تھیں جو وہ دونوں حضرات ہمیں سنا رہے تھے۔ انہوں نے آئندہ نصف گھنٹے میں ہماری جانب سے بھی تمام فیصلے کر لئے۔ طے پا گیا کہ ہم تینوں پین ایم کے ذریعے سفر کریں گے۔ سفر کے لئے دن بھی چن لیا گیا جو خاصا مشکل مرحلہ تھا۔ وہ اس لئے کہ جمعہ مبارک دن تھا اس لئے دونوں حضرات اس متبرک دن سفر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہفتہ کے دن اس لئے کوئی فائدہ

نہیں تھا کہ وہ یورپ میں ویک اینڈ ہوتا ہے۔ ہم نے بہت احتجاج کیا کہ اس سے ہمارے سفر کو کیا فرق پڑے گا۔ لیکن کسی نے نہیں سنی۔ اتوار تو تھا ہی عیسائیوں کا دن اس لئے وہ بھی کاٹ دیا گیا۔ پیر منگل کے روز بٹ صاحب کوئی سفر کرنے کے حق میں نہیں تھے اور بدھ ویسے ہی نحس دن ہوتا ہے۔ اب رہ گئی جمعرات تو دونوں اس بات پر متفق تھے کہ یہ بہت مبارک دن ہوتا ہے۔ خاص طور پر سفر کے لئے اور غیر ملکی سفر کے لئے اس سے زیادہ مبارک دن کوئی ہوتا ہی نہیں چنانچہ ایک جمعرات چھوڑ کر دوسری جمعرات کو کراچی سے روانگی کا فیصلہ ہو گیا۔

تمام فیصلے وہ دونوں حضرات کرتے رہے۔ ہمارا کام صرف ان پر انگوٹھا لگانا تھا۔ خان صاحب کیونکہ پڑھے لکھے اور رسوخ والے آدمی تھے اس لئے انہوں نے یہ پیشکش کی کہ پاسپورٹ ویزا اور غیر ملکی کرنسی کے حصول کی منزلیں وہ طے کرا دیں گے۔ چنانچہ ہم دونوں نے نقد روپے نکال کر ان کے حوالے کر دیئے۔

وہ چار دن کے بعد خوشی سے جھومتے ہوئے آئے اور بتایا کہ سب کام حسب دلخواہ ہو گئے ہیں۔ سیٹیں بھی بک ہو گئی ہیں اور ڈالر بھی مل گئے ہیں۔ ہم نے ڈالر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے کہا "کیا پہلے کبھی ڈالر نہیں دیکھے؟

"دیکھے تو ہیں مگر....."

"دیکھئے شاہ صاحب!" وہ بولے۔ "آپ بہت قابل اور دماغ والے آدمی ہیں مگر یہ روپے پیسے کا معاملہ آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔"

میں نے وہ سب کے سب ڈالر ایک آدمی کو دے دیئے ہیں۔ ریٹ بھی اچھا مل گیا ہے۔ جب ہم یورپ پہنچیں گے تو وہ ہمیں منافع کے ساتھ یہ ڈالر لوٹا دے گا۔"

میں حیران ہو کر ان کی شکل دیکھنے لگا "تو پھر ہم لوگ کیا کریں گے۔"

"ارے کرنا کیا ہے۔ روم پہنچ کر ان کے آدمی سے مل لیں گے۔ وہ ہمیں ڈالر دے دے گا اور ساتھ میں منافع بھی۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ سفر میں بغیر پیسوں کے ہم کیا کریں گے بھلا؟"

"ارے راستے میں ہمیں پیسوں کی ضرورت ہی کیا ہے؟ بھئی کراچی سے ہوائی جہاز میں بیٹھے تو سیدھے روم پہنچ جائیں گے۔ ہوائی جہاز والے کھانا چائے وغیرہ مفت دیتے ہیں۔"

"خود ہی بتایا ہے کہ راستے میں ہمیں چند گھنٹے بیروت میں بھی ٹھہرنا ہو گا۔"

"وہاں صرف ائرپورٹ پر رہیں گے۔ ہمارے خرچے کی ذمہ داری کمپنی پر ہو گی۔ اور امریکہ والے تو بہت رئیس لوگ ہیں۔ کھانا بھی بہت اچھا کھلاتے ہیں۔"

ظاہر ہے اس کے بعد بحث کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ ویسے بات بھی معقول ہی تھی۔ ہم نے سوچا کہ اگر پانچ سو ڈالر پاکستان میں دے کر روم میں ہمیں پانچ سو چالیس ڈالر مل جائیں تو حرج ہی کیا ہے؟ اور پھر اس زمانے میں ہر مسافر اپنے ہمراہ بیس پاکستانی روپے لے جانے کا مجاز تھا۔ اس طرح برے وقت کے لئے ہمارے پاس ساٹھ پاکستانی روپے تو ہوں گے۔ روانگی سے ایک دن پہلے ایک دوست نے ہمیں یہ مشورہ دیا کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے اپنے ساتھ چند ڈالر ضرور رکھنا۔ ایمرجنسی میں کام آئیں گے۔

"مگر ڈالر آئیں گے کہاں سے؟" ہم نے پوچھا۔ "یہ رہے۔" انہوں نے بیس ڈالر کا ایک نوٹ ہماری طرف بڑھا دیا۔ نوٹ دیکھ کر دل تو بہت خوش ہوا مگر پھر یہ سوچ کر خوشی رخصت ہو گئی کہ ہم یہ نوٹ رکھیں گے کہاں؟ اگر تلاشی کے وقت برآمد ہو گیا تو اگلے دن سارے اخباروں میں خبریں اور تصویریں چھپ جائیں گی کہ کرنسی اسمگلنگ کرنے والوں کا ایک گینگ پکڑا گیا ہے جن کے قبضہ سے بیس ڈالر برآمد ہوئے ہیں۔ اس جرم کی سزا بھی سخت ہوتی ہے۔ نہ بابا' یہ کام ہمارے بس کا نہیں ہے۔ کیوں نہ ہم یہ ڈالر خاں صاحب یا بٹ کے پاس رکھوا دیں تاکہ اگر پکڑے جائیں تو وہ پکڑے جائیں اور ہم صاف بچ جائیں' مگر ہمارے دوست نے تجربہ کاری کے پیش نظر اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ ان ڈالروں کی اپنے دوستوں کو ہوا بھی نہیں لگنے دینا ورنہ وہ فوراً خرچ کرا دیں گے۔ انہوں نے ایسے خلوص سے مشورہ دیا کہ ہم بھی مان گئے ہم نے کہا کہ بیس ڈالر کا یہ نوٹ ہم جوتے کے اندر رکھ لیں گے یا پھر کوٹ کی آستین میں سی لیں گے تاکہ تلاشی میں بھی برآمد نہ ہو سکے۔ انہوں نے ہمیں ڈانٹ دیا "فضول باتیں مت کرو بیس ڈالر کوئی ایسی رقم نہیں ہے جس کے نکلنے کے جرم میں گرفتاری کا خطرہ ہو۔ بیس تیس ڈالر پر تو وہ لوگ اعتراض بھی نہیں کرتے۔"

ہمیں ڈر تو بہت لگ رہا تھا مگر پھر سوچا کہ اگر پکڑے گئے تو وہ دونوں بھی ساتھ ہی

پکڑے جائیں گے۔ یہ سوچ کر دل کو تسلی ہوئی۔ انسان کی فطرت بھی کتنی عجب ہے اپنے ساتھ دوسروں کو بھی مبتلائے آلام کر کے وہ مطمئن ہو جاتا ہے۔

بظاہر ہماری تمام مشکلیں آسان ہو گئی تھیں۔ سوائے دو مشکلوں کے' جو خان صاحب اور بٹ صاحب کی شکل میں ہمارے سامنے تھیں۔ بٹ صاحب طاقت میں زیادہ ضرور تھے مگر کم عمر تھے۔ اس لئے ہمارا بہت احترام کرتے تھے۔ خان صاحب ہم عمر اور بے تکلف تھے اس لئے سفر کے دوران کسی پریشانی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ البتہ مسئلہ یہ تھا کہ بٹ صاحب صرف "یس" اور "نو" کی حد تک انگریزی جانتے تھے اور خان صاحب بقول خود اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود انگریزی بس واجبی ہی جانتے تھے۔ ان کا بیان تھا کہ بزنس کی مصروفیات کے سبب انہیں انگریزی کی مشق کرنے کا موقع نہیں مل سکا اس لئے ان کی انگریزی میں "روانی" نہیں تھی۔ چنانچہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے ہماری خدمات بطور مترجم حاصل کر لی تھیں۔ وہ بار بار کہہ رہے تھے کہ میں انگریزی سے نہیں ڈرتا' مگر امریکیوں کی انگریزی سے ڈر لگتا ہے' کیونکہ وہ بہت غلط انگریزی بولتے ہیں اور پھر بولنے کا انداز اتنا بے ہودہ ہے کہ سن کر شرم آتی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ لوگ تو ایک دوسرے کی انگریزی بھی بہت مشکل سے سمجھتے ہیں۔

جمعرات کو ہم تینوں کراچی ائرپورٹ پر یکجا ہوئے۔ بٹ صاحب کی ساری طاقت پسینہ بن کر بہہ نکلی تھی۔ معلوم ہوا کہ انہیں فضائی سفر سے بہت ڈر لگتا ہے۔

"وہ کیوں؟" ہم نے پوچھا۔

"کیونکہ اس سے پہلے کبھی ہوائی جہاز کا سفر نہیں کیا۔"

"پھر تو ڈرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔"

"یہ بات آپ نہیں سمجھیں گے۔" وہ فلسفیانہ لہجے میں بولے۔ "جس چیز کا پہلے سے پتا نہ ہو اس سے بہت زیادہ ڈر لگتا ہے۔"

خان صاحب نے انہیں سمجھایا کہ کلمہ پڑھ کر ہوائی جہاز میں بیٹھ جانا' کوئی برا خیال یا بد روح قریب نہیں آئے گی۔

ادھر خان صاحب کو یہ فکر تھی کہ ہوائی جہاز میں تو سارے مسافر انگریز ہوں گے۔ یہاں تک کہ ائرہوسٹس بھی' تو پھر وہ دوسروں سے بات چیت کیسے کریں گے؟

"بات چیت کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بس نیند کی گولی کھا کر سو جانا' میری طرح۔" یہ بٹ صاحب کا مشورہ تھا۔

"بکو مت یار! ایک تو تم نے باکسنگ میں مکے کھا کھا کر اپنے دماغ کو بھی پتھر بنا لیا ہے۔ بیوقوف آدمی! اگر ہوائی جہاز میں سو ہی جانا ہے تو پھر پین ایم میں سفر کرنے کا کیا فائدہ؟"

یہ نکتہ بٹ صاحب کی بھی سمجھ میں آگیا اور انہوں نے نیند کی گولی کھا کر سونے کا ارادہ فوراً ملتوی کر دیا۔ ہم امیگریشن سے گزر کر ڈیپارچر لاؤنج میں چلے گئے۔ یہاں خاصی ٹھنڈک تھی اور ماحول بھی خاصا خوشگوار تھا۔ آس پاس کچھ گورے بھی نظر آ رہے تھے جس کی وجہ سے دونوں کا موڈ کچھ بہتر ہو گیا ہم نے خان صاحب سے کہا "یہ اچھا موقع ہے۔"

وہ ایک حسینہ فرنگ کی پنڈلیاں دیکھنے میں کھوئے ہوئے تھے۔ بے خیالی میں کہنے لگے۔ "کس بات کے لئے۔"

"انگریزی کی پریکٹس کرنے کے لئے۔"

وہ ایک دم مسکرانے لگے "تو پھر شروع ہو جاؤں؟"

ہمارے اشارے پر وہ بڑے محتاط انداز میں اس انگریز خاتون کی طرف بڑھے جو ایک دکان کے سامنے کھڑی پاکستانی دستکاری کے نمونے دیکھ رہی تھی۔ خان صاحب میں لاکھ برائیاں سہی مگر لاکھ روپے کی ایک خوبی یہ ہے کہ ان میں احساس کمتری نام کو نہیں ہے۔ کسی سے جھجکتے نہیں۔

وہ چند قدم آگے بڑھ کر انگریز خاتون کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ ایک لمحہ انہوں نے بات کرنے کا کوئی بہانہ سوچا اور پھر اس نتیجے پر پہنچے کہ انہیں گفتگو کا آغاز اسی فقرے سے کرنا چاہئے جو ہم نے انہیں بتایا تھا۔

" ایکسکیوز می۔" انہوں نے خاتون کو مخاطب کیا۔

اس نے مڑ کر اپنی ہری ہری خوبصورت آنکھوں سے انہیں دیکھا تو خان صاحب اس اچانک حملے سے بوکھلا گئے۔ بولے "یو اسپیک انگلش؟"

جواب ملا "آف کورس..... آئی ایم انگلش۔"

اس مرحلے پر خان صاحب کی انگریزی جواب دے گئی۔ اور وہ "آئی ایم سوری" کہہ کر واپس چلے آئے۔

وہ بے چاری حیران کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔ جب انہوں نے یہ واقعہ ہمیں سنایا اور کہا کہ اچانک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ بات کیسے شروع کروں تو بٹ صاحب مسکرائے اور کہنے لگے "یہ کون سی مشکل بات ہے خان جی' سیدھے سیدھے پوچھ لیتے' ماچس ہے آپ کے پاس؟"

خان صاحب نے انہیں گھورا۔ "یار عقل کی بات کرو' وہ عورت ہے۔"

"تو پھر کیا ہوا؟ کیا عورتیں سگریٹ نہیں پیتیں؟" ارے یہ گوری میمیں تو شراب بھی پی لیتی ہیں۔"

خان صاحب کھسیانے ہو کر بولے "واقعی یار یہ بات تو میں بھول ہی گیا تھا دوبارہ جاؤں؟"

مگر ہم نے انہیں روک لیا "خان صاحب اسٹارٹ لینے کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ ابھی تو بہت لمبا سفر کرنا ہے۔ سارا جہاز انہی میموں اور گوروں سے بھرا ہو گا' خوب انگریزی پر ہاتھ صاف کرنا۔"

بٹ صاحب اس اثنا میں دیوار پر بنا ہوا دنیا کا نقشہ دیکھ رہے تھے۔ کہنے لگے "ہمارے استاد بھی بہت غلط تھے۔"

"کیا ہوا؟ تمہیں اس وقت استاد کیسے یاد آ گئے؟"

"ہمیں کہا کرتے تھے کہ دنیا گول ہے۔ اب ذرا سامنے والا نقشہ دیکھئے' اس میں کوئی گولائی نظر آ رہی ہے آپ کو؟"

خان صاحب نے انہیں ڈانٹا "تم چپ کرو۔ جس بات کا پتا نہ ہو اس میں نہیں بولتے۔ کیا تم نے کبھی اسکول میں گلوب نہیں دیکھا؟ فٹ بال کی طرح گول مٹول ہوتا ہے۔"

بٹ صاحب شرمندہ ہو کر بغلیں جھانکنے لگے اور خان صاحب نے فاتحانہ انداز میں ہماری طرف دیکھا۔ ہم نے بھی نظروں ہی نظروں میں انہیں خوب داد دی۔

ہوائی جہاز میں سوار ہونے سے پہلے خان صاحب نے بار بار مسافروں کی گنتی کی

اور ہم دونوں کو بتایا کہ ہوائی جہاز میں عورتوں کی تعداد کتنی ہے جو سب کی سب میمیں ہیں۔

"اور ان کے علاوہ سسٹرز بھی تو ہوں گی۔" بٹ نے لقمہ دیا۔

"سسٹرز! ارے ہم اسپتال میں تو داخل نہیں ہو رہے ہوائی جہاز میں سفر کریں گے۔"

"ہوائی جہاز میں بھی تو سسٹرز ہوتی ہیں۔ مسافروں کا سارا کام کرتی ہیں۔"

"جاہل ہو' بالکل۔" خان صاحب ناک سکوڑ کر بولے "انہیں ایئرہوسٹس کہتے ہیں۔"

"یار نام سے کیا فرق پڑتا ہے' جو چاہے کہہ دو۔ دیکھ بھال تو کرتی ہیں نا۔"

خان صاحب دانت پیس کر رہ گئے۔ ہم نے ان کی توجہ ہٹانے کے لئے کہا "اچھا اب آپ لوگ اپنے اپنے بیس روپے میرے حوالے کریں۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لئے کہ میں تمہارے قافلے کا سالار ہوں۔"

"ہم نے تو نہیں بنایا۔"

"تو پھر خود ہی انگریزی میں بات کرنا میں کوئی مدد نہیں کروں گا۔" وہ دونوں فوراً گھگھیانے لگے اور جیب سے بیس بیس روپے نکال کر ہمارے حوالے کر دیئے۔ خیال رہے کہ یہ بیس سال پہلے کا ذکر ہو رہا ہے جب بیس روپے واقعی کچھ رقم سمجھی جاتی تھی۔

ہم نے کہا "اس کے علاوہ بھی کچھ ہو تو بالکل دو۔"

"کوئی ڈالر' پونڈ وغیرہ؟"

"ارے ہمیں مرنا ہے ڈالر یا پونڈ رکھ کر۔ ہم کوئی اسمگلر ہیں؟"

"خیر خیر' کوئی بات نہیں ہے۔" ہم نے اپنی پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کی کیونکہ اس حساب سے تو اسمگلر ہم ہی تھے اور جو پکڑے گئے تو؟ پیشانی پر پسینہ آ گیا۔ پھر سوچا کہ کسٹم سے تو ہم گزر آئے ہیں' اب کون پکڑے گا۔

مگر وہ اخباری خبریں یاد آ گئیں جب پرواز کرنے سے پہلے ہوائی جہاز کے اندر واقعی بعض لوگوں کی تلاشی پر ان کے پاس سے ڈالرز برآمد ہوئے تھے۔ ڈر تو بہت لگا مگر ہم نے

دل کو بہلایا۔ آس پاس کا سماں واقعی بہت پیارا تھا۔ خوبصورت چیزوں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ چمکتے ہوئے چہرے' روشن آنکھیں' مہکتے ہوئے بال' اسکرٹ میں سے جھانکتی ہوئی ٹانگیں اور ناکافی بلاؤزوں میں دمکتے ہوئے حسین جسم ایسے میں پکڑے جانے کی فکر کون کافر کرتا۔ بہت جلد دل بہل گیا۔ مسافروں کے لئے جہاز میں سوار ہونے کا اعلان ہوا تو بٹ صاحب کا چہرہ فق ہو گیا۔ انہوں نے فوراً جیب میں ہاتھ ڈال کر خواب آور گولی نکالنے کا ارادہ کیا مگر خان صاحب نے ان کا ہاتھ تھام لیا "یار بے وقوفی مت کرو۔ ایسا موقع بار بار زندگی میں نہیں ملتا۔ آج تو جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے کا مزہ ہے۔"

بٹ صاحب حالانکہ خوف زدہ تھے۔ مگر حسینوں کے جھرمٹ نے ان کا ڈر کم کر دیا اور انہوں نے نیند کی گولی کھانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ ہوائی جہاز میں داخل ہوئے تو ماحول اور زیادہ خشک اور رومان انگیز تھا۔ جہاز میں سوار ہونے والے جسموں سے اٹھنے والی مختلف خوشبوؤں سے پورا ہوائی جہاز مہک رہا تھا۔ خان صاحب نے اتنے بہت سے خوبصورت یورپین چہرے زندگی میں کبھی یکجا نہیں دیکھے ہوں گے۔ بٹ صاحب کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ دونوں کا یہ عالم تھا جیسے کوئی بچہ کھلونوں کی بھری ہوئی دکان میں داخل ہو جائے اور اس کی سمجھ میں یہ نہ آئے کہ کون سا کھلونا اٹھاؤں۔ دونوں حضرات کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا دیکھیں اور کیا نہ دیکھیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارا حال بھی کچھ زیادہ مختلف نہ تھا مگر ہم ذرا تمیز اور شائستگی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ جبکہ وہ دونوں حضرات ندیدوں کی طرح منہ کھولے ہر طرف تک رہے تھے۔ ہم نے انہیں کہنیاں مار کر متوجہ کیا اور بتایا کہ اس قسم کی حرکتیں بدتمیزی میں شمار ہوتی ہیں۔

"مگر ہم کیا کریں؟ یہاں تو مینا بازار لگا ہوا ہے۔" انہوں نے یہ فقرہ اتنی بلند آواز میں کہا کہ آس پاس کے لوگ گردنیں موڑ کر دیکھنے لگے۔ ہم نے انہیں سمجھایا کہ اونچی آواز میں باتیں کرنا بھی بدتہذیبی ہے اور یہ انگریز اسے بہت ناپسند کرتے ہیں۔ تم نے دیکھا نہیں کتنی نرمی اور آہستگی سے بات کرتے ہیں ہمارا مشورہ شائد رائیگاں ہی جاتا مگر خوش قسمتی سے وہ دونوں انگریزوں کی ناراضگی کا خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھے۔

ایک دراز قد' متناسب جسم کی ائرہوسٹس مسکراتی ہوئی سامنے سے گزری اور جاتے جاتے ہم تینوں کو بیلٹ باندھنے کا مشورہ دے گئی۔ میں نے اور خان صاحب نے تو بیلٹ باندھ لئے مگر بٹ صاحب جوں کے توں بیٹھے رہے۔ خان صاحب نے انہیں ٹھوکا دیا "پیٹی باندھ لو وہ پھر آ رہی ہے۔"

بولے "آنے دو۔ دو چار بار کہے گی تو پیٹی باندھ لیں گے۔"

ائیرہوسٹس پھر آئی اور موج خرام کی مانند گزر گئی۔

بٹ صاحب مایوسی سے بولے "اس نے پیٹی باندھنے کو نہیں کہا۔"

وہ تیسری بار پاس سے گزری تو بٹ صاحب نے اسے پکارا "سسٹر!"

وہ اچانک رک گئی اور حیران ہو کر بٹ صاحب کی جانب بڑھی۔ "معافی چاہتی ہوں۔" وہ تبسم کی بجلیاں گراتے ہوئے انگریزی میں بولی "آپ نے مجھے پکارا۔"

بٹ صاحب اسے تکتے رہ گئے اور وہ مسکرا کر چلی گئی۔

خان صاحب بہت گرم ہوئے "یار بہت بدتمیز ہو۔ وہ بھی کیا سوچے گی۔ کوئی جواب تو دیا ہوتا۔"

"جواب کیا دیتا؟" میں جواب سوچ ہی رہا تھا کہ وہ چلی گئی؟"

"آپ کا کیا خیال ہے' وہ ساری رات ہاتھ باندھے آپ کے سامنے کھڑی رہتی؟"

مسافر بیٹھ گئے اور ہوائی جہاز نے پرواز کے لئے رن وے پر دوڑنا شروع کیا تو بٹ صاحب کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ خان صاحب نے تسلی دی "حوصلہ رکھو میموں کے سامنے بزدلی کا مظاہرہ مت کرنا ورنہ ناک کٹ جائے گی' ہماری قوم کی۔"

کچھ دیر بعد ہوائی جہاز کی پرواز میں یکسانیت پیدا ہوئی تو جان میں جان آئی۔ بٹ صاحب تو خاموش بیٹھ گئے مگر خان صاحب نے اردو ملی پنجابی میں ائیرہوسٹسوں کے بارے میں رننگ کمنٹری شروع کر دی۔ "کیسی لمبی تڑنگی اور خوبصورت لڑکیاں ہیں اور ایک بھی سانولے رنگ کی نہیں ہے۔ کیسی گوری چٹی ہیں۔" خان صاحب کو حسب حال کچھ اشعار بھی یاد آ رہے تھے جو انہوں نے مجھے سنائے اور فرمائش کی کہ ان کا ترجمہ ائیرہوسٹس کو سنا دوں۔

"اسے شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" میں نے جان بوجھ کر چڑانے کے لئے کہا۔

بٹ صاحب بولے "وہ تو خود ہی شعر ہے۔ میں اک بات بتاؤں۔ شعر کی آج تک

مجھے سمجھ نہیں آئی، مگر ان کی خوب سمجھ آ رہی ہے۔"

"ماشاء اللہ، بہت سمجھدار ہو گئے ہو۔"

ایئر ہوسٹس کو بلانے کے لئے وہ دونوں بار بار فرمائشیں کر رہے تھے۔ اور مجھ سے مطالبہ کر رہے تھے کہ ترجمہ کر کے "گوری" کو بتا دوں۔

مجھے بار بار اسے بلانا اچھا نہیں لگا تو خان صاحب نے خود کفالت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انگریزی کی ٹانگ توڑنی شروع کر دی میں نے شرمندگی سے کہا۔ "خان صاحب! اتنی غلط انگریزی بول رہے ہو۔ وہ کیا سوچتی ہو گی؟"

وہ ڈھٹائی سے بولے "کیا سوچے گی؟ ہم تو اس کی زبان بول بھی لیتے ہیں۔ وہ تو ہماری زبان کا ایک لفظ بھی نہیں بول سکتی۔"

بٹ صاحب نے کہا "ہم بھی تو پاکستانی ہیں مگر انگریزی بول رہے ہیں۔"

"انگریزی بول رہے ہو یا اسے ذلیل کر رہے ہو؟" بٹ صاحب نے کہا۔

اتنی دیر میں ایئر ہوسٹس پھر خوشبو میں بسی ہوئی سامنے سے گزری اور جاتے ہوئے ہم تینوں کو اپنی مسکراہٹ سے شرابور کر گئی۔

"دیکھا۔" خان صاحب بولے۔ "میری انگریزی سن کر کتنی خوش ہے۔"

تھوڑی دیر بعد ناشتے کی تیاری شروع ہو گئی۔

"یہ لوگ رات کو ناشتا کرتے ہیں؟"

"جی نہیں، ذرا باہر جھانک کر دیکھو۔ صبح ہو رہی ہے۔"

ان دونوں..... نے پردہ ہٹا کر باہر جھانکا اور حیران رہ گئے۔ "یار اتنی جلدی صبح ہو گئی؟" انہیں صبح ہونے کی جتنی حیرت تھی اس سے کہیں زیادہ حیران وہ اس بات پر تھے کہ ایئر ہوسٹس بدستور ترو تازہ اور بنی سنوری نظر آ رہی تھیں اور تازہ دم بھی تھیں بلکہ انہوں نے میک اپ وغیرہ ری ٹچ کرنے کے بعد مزید سینٹ اپنے جسموں پر انڈیل لیا تھا۔

بٹ صاحب آنکھیں مل رہے تھے۔ بولے "ابھی تو میں سونے کا ارادہ ہی کر رہا تھا اور میم نے ناشتا بنا دیا ان سے پوچھو ناشتے میں کیا کیا ہے؟"

خان صاحب نے کہا "انڈا، پراٹھا، حلوہ، پوری، جو چاہو مل جائے گا۔"

اتنی دیر میں ایئر ہوسٹس نے جھٹ پٹ سامنے جھک کر میزیں درست کر دیں اور

حسب عادت مسکراتے ہوئے ہم سب کو دیکھا تو بٹ صاحب کی رہی سہی نیند بھی غائب ہو گئی۔ یہ بات ماننی پڑے گی کہ ان چار خواتین نے پلک جھپکنے میں سارے ہوائی جہاز کے مسافروں کو ناشتا مہیا کر دیا۔ ہوا کے جھونکوں کی طرح وہ ایک ایک طرف سے گذرتی ہوئی دوسری طرف جاتیں اور خوشبو کے ساتھ ساتھ مسکراہٹوں کی روشنی بھی پھیلا جاتیں۔

خان صاحب اور بٹ صاحب کی توجہ زیادہ تر انہی پر تھی۔ جب ہمارے توجہ دلانے پر انہوں نے ناشتے کی طرف نظر کی تو فرائیڈ انڈا اور ٹوسٹ دیکھ کر خوش ہو گئے۔ ہر پلیٹ میں فرائیڈ انڈوں کے برابر نہایت خوبصورتی سے کٹے ہوئے گوشت کے ٹکڑے بھی رکھے ہوئے تھے۔

خان صاحب کہنے لگے "دیکھا آپ نے کس قدر اعلیٰ درجے کا گوشت ہے اور سرخ کتنا ہے۔"

بٹ صاحب نے مصرع اٹھایا "اجی انگریزی گوشت ہے کیا بات ہے ان انگریزوں کی، سسٹر سے کہہ دیجئے کہ آپ کا گوشت بہت عمدہ ہے۔"

بٹ صاحب نے سسٹر کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ بہت تیزی میں تھی۔ بٹ صاحب اس کی پنڈلیاں اور کلائیاں دیکھنے میں محو ہو گئے، مگر پھر خان صاحب کو یکایک خیال آیا کہ کہیں یہ سرخ و سفید گوشت سور نہ ہو۔ "میرا خیال ہے یہ حرام گوشت ہے۔" انہوں نے مجھ سے سرگوشی کی۔

"خیال تو میرا بھی یہی ہے۔"

"تم پوچھو اس میم سے۔"

ہم نے ایئر ہوسٹس کو متوجہ کیا اور وہ مسکراہٹ کی بجلیاں گراتی ہوئی پاس آ کر ٹھہر گئی۔ ہمارے دریافت کرنے پر اس نے تصدیق کر دی کہ ہماری پلیٹ میں واقعی حرام گوشت رکھا ہوا ہے۔ بٹ صاحب کے ہاتھ سے چھری کانٹا گر گیا اور خان صاحب بھی لاحول پڑھتے ہوئے کرسی سے کھڑے ہونے کی کوشش میں ایئر ہوسٹس سے ٹکرا گئے۔ ہم تینوں کی یہ حالت دیکھ کر وہ گھبرا گئی اور بولی "آپ کو ڈاکٹر کی ضرورت ہے؟"

ہم نے کہا "یہ پلیٹیں فوراً یہاں سے اٹھا کر لے جاؤ ورنہ۔"

اس نے حیران ہو کر ہم تینوں کو دیکھا "ورنہ کیا؟"

"ورنہ..... ورنہ" ہم سوچ میں پڑ گئے۔ خان صاحب نے کہا "کہہ دو کہ ورنہ یہاں خون خرابہ ہو جائے گا۔"

بٹ صاحب چلا کر بولے "ارے تم ہمیں حرام گوشت کھلا رہی ہو اور اوپر سے باتیں بھی بناتی ہو۔ جانتی ہو یہ ہمارے مذہب میں گناہ ہے لعنت بھیجتے ہیں' ہم اس پر اور کھلانے والے پر۔

اب آس پاس کے مسافر بھی ہماری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ دوسری ایئرہوسٹس بھی یہ ہنگامہ سن کر پاس آ گئی۔ "سم تھنگ رانگ ہنی۔"

خان صاحب بولے "اے ٹو زیڈ آل رانگ یو نو؟"

الفاظ تو سارے انگریزی کے تھے مگر خان صاحب کی زبان سے وہ کوئی اجنبی زبان لگ رہی تھی۔ ایئرہوسٹس نے مزید حیران ہو کر پوچھا۔ "میں آپکے لئے کیا کر سکتی ہوں؟"

سارے مسافروں کی توجہ اب ہماری جانب مرکوز تھی اور ہم مزید تماشا نہیں بننا چاہتے تھے' چنانچہ ہم نے اشارے سے اسے کان ہمارے منہ کے پاس لانے کو کہا اور اسکا بھبوکا چہرہ ہم سے محض چھ انچ کے فاصلے پر آ گیا۔ ہم نے کہا "بات یہ ہے کہ ہم لوگ مسلمان ہیں اور یہ چیز ہمارے مذہب میں حرام ہے۔ ہم بھوکا مرنا پسند کرتے ہیں مگر اسے چھونا بھی پسند نہیں کرتے۔"

اس نے اپنی خوبصورت براؤن آنکھیں گھمائیں اور بولی "مگر یہ بات آپ لوگوں کو پہلے بتانی چاہئے تھی۔ اب ہمارے پاس نہ تو آپ کے لئے ناشتا ہے اور نہ کھانا۔"

خان صاحب فوراً اردو میں بولے "تو کیا ہمیں بھوکا مرنا پڑے گا؟"

ہم نے کہا "مر جائیں گے تو کیا ہے' شہادت کا درجہ پائیں گے۔"

"بٹ نے لقمہ دیا "انشاء اللہ۔"

مگر خان صاحب کا چہرہ فق ہو گیا' بولے "یار میں تو السر کا مریض ہوں' خالی پیٹ رہنے سے نقصان ہو جاتا ہے۔"

"تو پھر کھالو' یہ حرام ہے۔" بٹ نے جل کر کہا۔

دونوں ایئرہوسٹس ہماری گفتگو کے دوران حیران و پریشان کھڑی ہمیں دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے صورت حال کا اندازہ لگا لیا اور پھر ہری آنکھوں والی خاتون نے کہا

"فکر نہ کریں ہم آپ کے لئے کچھ نہ کچھ بندوبست کر دیں گے' مگر آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا ہو گا۔ اس عرصے میں آپ چائے یا کافی پئیں۔"

ہمیں یہ مشورہ پسند آیا اور ہمارے ساتھیوں کو بھی۔ جب تک ناشتے کے برتن میزوں پر رہے وہ لڑکیاں ادھر سے ادھر آتی جاتی رہیں اور ناشتے کے انتظار میں ہم تینوں انہیں للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہے۔ جب سب لوگ ناشتا ختم کر چکے اور دوبارہ آنکھیں بند کر کے دراز ہو گئے تو براؤن چشم ہوسٹس ہمارے لئے ایک ٹرے بھر کر پھل' بسکٹ' پنیر' مکھن اور ٹوسٹ لے آئی۔ ساتھ ہی معذرت خواہ بھی ہوئی کہ ہمیں باقاعدہ ناشتا انہیں فراہم کیا جا رہا۔ باقاعدہ ناشتے کی اس کے سامنے کیا حیثیت تھی۔ بھلا انڈا اور ٹوسٹ ایسی کون سی نعمت ہیں البتہ یہ پھولوں اور فوکہات سے بھری ہوئی ٹرے ایک نئی چیز تھی۔

بٹ صاحب نے بڑے خلوص سے کہا "تھینک یو۔ سسٹر!"

خان صاحب جل کر بولے "بند کرو یہ بکواس بار بار سسٹر کہو گے تو اس سے نکاح ناجائز ہو جائے گا کم بخت۔"

بٹ صاحب نے فوراً اپنا منہ بند کر لیا۔ ہم تینوں نے جی بھر کر ناشتا کیا۔ اس کے بعد کافی کا دور چلا۔ بٹ صاحب کو رہ رہ کر کشمیری چائے یاد آ رہی تھی اور اپنی منگیتر کا بھی خیال آ رہا تھا جو بقول ان کے ان میموں سے بھی زیادہ خوبصورت تھی۔

ناشتے کی ٹرے اٹھانے کے بعد ایئرہوسٹس دوبارہ ہماری جانب چلی آئی اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ ہم لوگوں نے جو ڈراما کیا تھا اس سے وہ بہت لطف اندوز ہوئی تھی "آپ لوگ عرب ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ ہم پاکستانی ہیں۔"

"تو پھر اتنے کٹر ملا کیوں بن گئے؟"

"ہمیں بچپن ہی سے مذہب کی تعلیم دی جاتی ہے۔"

خان صاحب تو یہ گفتگو تھوڑی تھوڑی سمجھ رہے تھے مگر بٹ صاحب کے پلے ایک لفظ بھی نہیں پڑ رہا تھا۔ آخر ان سے نہ رہا گیا تو بولے "یار! آخر تم کیا باتیں کر رہے ہو؟ شرم تو نہیں آتی۔"

ایئرہوسٹس نے پوچھا "تمہارا دوست کیا کہہ رہا ہے۔"

ہم نے کہا "تمہاری تعریف کر رہا ہے۔"

"اور واقعی۔" وہ بٹ صاحب کی جانب دیکھ کر اتنے گرمجوشی انداز میں مسکرائی کہ بٹ صاحب کی ساری شکائتیں دور ہو گئیں۔

اتنی دیر میں یہ اعلان کیا گیا کہ تھوڑی دیر میں ہم بیروت پہنچنے والے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہوائی جہاز نے چند جھٹکے کھائے۔ خان صاحب اور بٹ صاحب پریشانی سے بولے

"خیر تو ہے۔ یہ کیا کہہ رہی ہے۔"

ہم نے انہیں بتایا کہ بیروت آنے والا ہے۔

"مگر جہاز جھٹکے کیوں کھا رہا ہے؟""

"زمین سے ٹکرانے کے لئے۔"

"میرے اللہ۔" انہوں نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ مسافروں نے بیلٹ باندھنے شروع کر دیئے تھے جس نے ان دونوں کو اور زیادہ پریشان کر دیا اور ان کا اندیشہ پختہ ہو گیا کہ ہو نہ ہو کوئی خرابی ہو گئی ہے۔ ہم نے انہیں سمجھایا کہ تھوڑی دیر میں ہم بیروت کے ایئرپورٹ پر اتریں گے۔ وہاں ہمیں چند گھنٹے انتظار کرنا ہو گا۔

"کس کا؟" بٹ صاحب نے بے وقوفی سے سوال کیا۔

"دوسرے جہاز کا' یہ ہوائی جہاز کسی اور ملک کی طرف جا رہا ہے۔ ہمیں لینے کے لئے ایک اور جہاز آئے گا۔"

"اچھا اچھا۔" بٹ صاحب بولے "یعنی بیروت میں جہازوں کا جنکشن ہے۔"

ہم نے کھڑکی سے باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ دھند سی چھائی ہوئی تھی مگر پھر بھی زمین اور سمندر نظر آ رہا تھا۔ رات کا وقت ہوتا تو شائد روشنیوں کا سمندر بھی نظر آتا۔ زمین مٹیالی جیسی تھی مگر آسمان شفاف اور نیلا تھا۔ لینڈنگ بہت اچھی تھی اور جب ہم لوگ ہوائی جہاز سے باہر نکلے تو بیروت ایئرپورٹ کی خوبصورت اور شاندار عمارت ہماری نگاہوں کے سامنے تھی۔ بہت بارعب عمارت تھی مگر جب اندر قدم رکھا تو پتا چلا کہ اندر سے اور بھی زیادہ دلکش ہے۔ بیروت کی رونقیں اس زمانے میں اپنے عروج پر تھیں' جگمگاتی ہوئی روشنیاں' شاندار کرسیاں اور صوفے' چمکتے ہوئے فرش اور پھر سب سے بڑھ

کر گورے گورے مسافروں کی بہتات۔ بٹ صاحب اور خان صاحب نے شائد زندگی میں اتنے بہت سے گورے اور میمیں کبھی یکجا نہیں دیکھے ہوں گے۔ ہر طرف حسن و نور کی تابانیاں بکھری ہوئی تھیں۔ خوشبوئیں' حسن و جمال' شائستگی اور نظم و ضبط۔ ہم لوگوں کے لئے تو یہ سارا منظر ہی بہت عجیب اور انوکھا تھا۔ سامان ہم ہوائی جہاز میں چھوڑ آئے تھے جو خود بخود دوسرے جہاز پر منتقل ہو جانے والا تھا۔ ہاتھ میں دستی بیگ کے سوا کچھ نہ تھا۔ گویا بالکل آزاد اور ہلکے پھلکے تھے۔ کام بھی کوئی نہیں تھا سوائے نظربازی اور نظارہ بازی کے۔ چنانچہ تینوں اس ضروری کام میں مصروف ہو گئے۔ کراچی ایئرپورٹ کے مقابلے میں یہ کہیں زیادہ وسیع و عریض' پرشکوہ اور خوبصورت لاؤنج تھا۔ ہم نے کچھ دیر ادھر ادھر گشت لگایا اور عمارت کا کونا کونا دیکھ لیا۔ شیشوں کے پر دوسرا لاؤنج نظر آ رہا تھا۔ خان صاحب نے اس طرف جانے کی کوشش بھی کی مگر ایک سرخ و سفید تنومند گارڈ نے انہیں روک دیا۔ ہم نے انہیں سمجھایا کہ اس لاؤنج سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔"

"تو کیا ہم قیدی ہیں؟" "یہی سمجھ لو۔"

"مگر کتنا حسین قید خانہ ہے۔" یہ بٹ صاحاب کی آواز تھی۔ جن کی حیران نگاہیں ہر طرف بھٹک رہی تھیں۔ بیروت کے ایئرپورٹ لاؤنج میں غالباً" ہم تینوں کے علاوہ سارے کے سارے مسافر یورپین اور عرب تھے۔ ایئرپورٹ اسٹاف بھی گورا چٹا تھا۔ بیروت کے لوگ بھی حسن و جمال میں یورپ والوں سے کم نہیں ہوتے بلکہ کچھ زیادہ ہیں۔ رنگ گلابی اور سفید' بال عموماً" سیاہ اور آنکھیں بھی بڑی بڑی اور سیاہ۔ کچھ لوگوں کے بال اور آنکھیں براؤن بھی ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ان میں اور یورپین لوگوں میں تمیز کرنا بہت مشکل ہے۔ فرق یہ ہے کہ بیروت کے لوگ عربی لہجے میں (یا اطالوی انداز میں) انگریزی بولتے ہیں اور اکثر عربی کا استعمال بھی کرتے ہیں۔

بٹ صاحب کچھ دیر تو اس منظر میں کھوئے رہے۔ پھر ایک لمبی سانس لے کر بولے

"ایمان سے' یہ تو جنت ہے جنت۔"

"جنت ہوتی تو ہم یہاں نہ ہوتے' خان صاحب نے فقرہ چست کیا۔ کچھ دیر تو دیکھنے اور ایک دوسرے پر فقرے چست کرنے میں مصروف رہے۔ پھر بھوک پیاس ستانے لگی خاص طور پر چائے کی طلب محسوس ہونے لگی' ہال کے ایک گوشے میں انتہائی خوبصورت

اور شاندار کافی بار موجود تھا چائے' کافی کا تو محض نام تھا۔ زیادہ مقدار انواع و اقسام کی شرابوں کی تھی۔ ایسی ایسی شکل و صورت اور نسل کی بوتلیں الماریوں میں سجی ہوئی تھیں کہ بس دیکھتے ہی رہو۔ دو تین انتہائی دلکش لڑکیاں خوبصورت لباس پہنے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی تھیں۔ ہمیں دیکھا تو مسکراہٹ کی بجلیاں گراتی ہوئی ایک بار گرل ہماری جانب بڑھی اور عربی میں مخاطب ہو کر پوچھا "میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟" کم از کم ہم نے اس کے فقرے سے یہی مطلب سمجھا تھا۔

خان صاحب نے فوراً موقعے سے فائدہ اٹھایا اور انگریزی کی مشق شروع کر دی۔

"یو اسپیک انگلش؟"

"آف کورس؟"

"یو انگلش؟ میرا مطلب ہے انگریز؟"

وہ حیران ہو کر دیکھنے لگی۔ ہم نے کہا "یہ ہمارا دوست تمہیں یورپین سمجھ رہا ہے۔"

وہ ہنسنے لگی اور بولی "میں لبنانی ہوں' لبنان کی بیٹی ہوں۔"

"آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں۔؟"

ہم نے کہا "پاکستان سے۔"

خان صاحب نے فوراً لقمہ دیا "فرینڈز۔"

لڑکی پھر مسکرائی اور بولی "میں آپ کو عرب سمجھ رہی تھی۔"

"کوئی بات نہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد عرب ہی تھے۔"

شائد اتنی لمبی بات چیت سے لڑکی اکتا گئی تھی "کیا پسند کریں گے؟" یہ کہہ کر اس نے شراب سے لدی پھندی الماریوں کی طرف نگاہ ڈالی۔

ہم نے کہا "چائے مل سکتی ہے؟"

اس نے بڑی مایوسی سے ہمیں دیکھا "کیوں نہیں؟"

ہم نے کہا "مگر ہمارے پاس پاکستان کرنسی ہے۔"

"نو پاکستانی کرنسی۔" وہ اپنے مخصوص لہجے میں کہنے لگی "اونلی ڈالرز۔ پونڈز۔"

"سوری نو ڈالرز۔"

"اوکے گڈ بائی۔" اور وہ مڑ کر دوسری طرف چلی گئی۔

ہماری گفتگو کا مفہوم ساتھیوں کو بھی معلوم ہو گیا تھا "بڑے افسوس کی بات ہے' مسلمان ہو کر شراب بیچ رہی ہے۔" خان صاحب نے کہا۔

بٹ صاحب بھی کچھ ناراض تھے بولے "اور ہمارے پاکستانی روپوں کو تو کچھ سمجھی ہی نہیں۔ تم تو کہتے تھے کہ عرب ہمارے بھائی ہیں؟" یہ بات انہوں نے خان صاحب سے مخاطب ہو کر کہی۔

وہ جھلا کر بولے "یار بھائی بہن کا سوال نہیں ہے۔ یہ کاروبار ہے۔"

"یہ اچھا کاروبار ہے کہ اپنے بھائی بندوں کا بھی لحاظ نہیں ہے۔ آخر اخلاق اور مروت بھی کوئی چیز ہے۔"

ہم لوگ پھر لاؤنج کے آرام دہ صوفوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ بٹ صاحب چاروں طرف گھورتے رہے' پھر بولے "آخر یہ لوگ اتنے خوبصورت کیوں ہوتے ہیں؟"

"سفید چمڑی سے تو خوبصورتی نہیں ہوتی۔" خان صاحب ابھی تک غصے میں تھے۔

"ہمارے ہاں بھی ایک سے ایک حسین پڑا ہے۔"

"اور کیا' ہمارے کشمیر میں جا کر دیکھو تو ان کو بھول جاؤ گے۔"

"ٹھیک ہے یار۔" خان صاحب مسکرائے۔ "اگلی بار تمہارے کشمیر چلیں گے۔"

ایک وردی پوش اسمارٹ خوبصورت لڑکی ہمارے سامنے والے صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ سینے پر ایک بیج سا لگا ہوا تھا۔ سر پر ایک ٹوپی نما کوئی چیز رکھی ہوئی تھی جس نے اس کے حسن میں کچھ اور اضافہ کر دیا تھا۔ ہم سے آنکھیں چار ہوئیں تو مسکرائی۔ ہم بھی مسکرائے۔ جب تین چار بار ایسا ہوا تو خان صاحب بولے "لگتا ہے ہماری جاننے والی ہے۔"

"کیوں کیا آپ کے رشتے دار بیروت میں بھی رہتے ہیں؟"

وہ جھینپ سے گئے مگر مسکراہٹوں کے تبادلے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لڑکی اٹھ کر ہمارے برابر آ گئی۔ خان صاحب اور بٹ صاحب تو بالکل بوکھلا گئے۔ ہمیں بھی کچھ پریشانی ہونے لگی۔

"آر یو فرام ترکی؟" اس نے سریلی آواز میں پوچھا۔

"نو' فرام پاکستان۔"

"گڈ...." پھر وہ پاکستانیوں کی بہادری کی تعریف کرنے لگی۔ خان صاحب خلاصہ سمجھ گئے اور فخر سے سینہ پھلا لیا' مگر بٹ صاحب کی سمجھ میں نہ آیا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو؟" وہ بولے۔

"چپ کرو' بعد میں بتا دیں گے۔" خان صاحب نے ڈانٹا۔

یہ لڑکی بھی لبنانی تھی اور سیکورٹی گارڈ میں شامل تھی۔ بٹ صاحب کو اس کی بے باکی پر اعتراض تھا۔ لباس بھی ان کے خیال میں مناسب نہیں تھا۔ اس پر اس کا انداز بے تکلفی "یہ اچھی لڑکی نہیں ہے۔" انہوں نے فوراً فیصلہ سنا دیا۔

اس اثنا میں خان صاحب نے اپنی انگریزی کی مشق شروع کر دی اور ہمیں مطلع کیا کہ اس کا نام حرا ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" بٹ صاحب نے سوال کیا۔

"ارے ابھی اس نے بتایا ہے۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے۔ نام اور پتے تک پہنچ گئے ہو۔ خیر واپس چل کر بھابی کو بتاؤں گا۔"

خان صاحب حرا کے حسن و جمال میں کھوئے ہوئے تھے۔ اس دھمکی کو بھلا کیا خاطر میں لاتے۔ حرا خاصی باتونی لڑکی تھی..... تھوڑی دیر میں خاصی بے تکلف ہو گئی' اور ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی۔ "شرط لگا لو' یہ یہودن ہے؟" بٹ صاحب نے رائے ظاہر کی۔

خان صاحب نے پوچھا "آر یو مسلم؟"

"نو۔" اس نے ہنس کر دلکش انداز میں گردن کو جھٹکا دیا۔ "کرسچن۔"

بٹ صاحب کا دھیان اسی طرف لگا ہوا تھا' "دیکھا میں نہ کہتا تھا' یہ مسلمان نہیں ہے۔ یار اس سے کہو کہ ہمیں چائے ہی پلوا دے۔ ان لوگوں میں مروت تو نام کو نہیں ہوتی۔"

حرا نے بتایا کہ اس کی عمر بائیس سال ہے۔ امریکن یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد پہلے ایک کلب میں ملازمت کی اور پھر ائیرپورٹ سیکورٹی میں شامل ہو گئی۔

پوچھا "کلب کی نوکری کیوں چھوڑی؟"

وہ بے باکی سے مسکرائی "بے لباسی سے تنگ آ گئی تھی۔"

"تم کیا ڈانسر تھیں؟"

"تھوڑا بہت سیکھ لیا تھا' مگر کپڑے اتارنا ہی میرا خاص آئٹم ہوا کرتا تھا۔"

خان صاحب میرے نزدیک ہو کر بیٹھ گئے۔ ان کی گرم سانسیں میری گردن کو جھلسانے لگیں۔ بولے "اس سے پوچھو' نائٹ کلب میں اور کیا کرتی تھی؟"

"یار فضول باتیں مت کرو۔ خاموش بیٹھے رہو۔"

"یہ آپ کون سی زبان بول رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"یہ ہماری پاکستانی زبان ہے' اردو۔ یہ عربی سے ملتی جلتی ہے۔"

"بہت اچھی زبان ہے۔" اس نے غالباً "اخلاقاً" کہا۔ پھر بولی۔

"مگر مجھے فرنچ زیادہ پسند ہے۔ عربی بھی اچھی ہے۔ مگر فرنچ کی کیا بات ہے۔ کتنی میٹھی زبان ہے۔" اس نے سرور میں آ کر آنکھیں بند کر لیں۔

"آخر نکلی نا کرسچن۔" خان صاحب نے زیر لب کہا مگر اس کے ماہتابی چہرے پر سے نگاہیں نہیں ہٹائیں۔ ہمارے آس پاس لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی جن میں آدھی سے زیادہ تعداد خواتین کی تھی۔ کبھی کبھی نظریں ادھر بھی بھٹک جاتی تھیں مگر ہم سب کی توجہ کا اصل مرکز حرا تھی۔ یکایک قدرے ہلچل سی محسوس ہوئی۔ دیکھا تو ایک باریش بزرگ' جسم پر قبا پہنے ہاتھ میں تسبیح تھامے تشریف لا رہے تھے۔ درمیانی عمر کے صحت مند اور خوش شکل آدمی تھے اور چہرہ بے حد پر نور تھا۔ بٹ صاحب تو گھبرا کر مودب کھڑے ہو گئے اور سلام بھی عرض کیا۔ جس کے جواب میں کچھ نہ ملا۔ بزرگ برابر والے صوفے پر حرا کے پاس بیٹھ گئے اور پیر اس طرح پھیلائے کہ اس کی اسکرٹ میں سے جھانکتی ہوئی پنڈلیوں تک پہنچ گئے۔ ہم سب چونک گئے مگر وہ بڑے مطمئن انداز میں بیٹھے تسبیح گھماتے رہے۔ پھر وہ حرا سے مخاطب ہوئے اور عربی زبان میں گفتگو فرمانے لگے۔ وہ بھی عربی بول رہی تھی۔ دو عربوں کو عربی بولتے ہوئے پہلی بار سنا تھا اور پہلی بار ہی یہ احساس ہوا تھا کہ عربی کس قدر شیریں زبان ہے۔ جی چاہتا تھا بس سنتے رہو۔ گفتگو کے دوران بزرگ کی نگاہیں حرا کے برہنہ شانوں اور کھلے گلے پر مرکوز رہیں' مگر اس نے اس بات کا کوئی خاص

نوٹس نہیں لیا۔ بات چیت کے دوران بھی وہ تسبیح گھماتے رہے۔ خدا جانے کون سا وظیفہ تھا جو کسی چیز سے بھی ڈسٹرب نہیں ہو رہا تھا۔

چند لمحے بعد حرا دوبارہ ہماری جانب متوجہ ہوئی اور مسکرا کر معذرت کرنے لگی۔ ہمارے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ یہ تھوڑی دیر بعد ایک فلائٹ سے استنبول جا رہے ہیں۔

شائد کسی مذہبی کانفرنس میں شرکت کے لئے ہم نے سوچا۔ پھر ہم نے حرا سے کہا "ہم سب کو تمہارا شہر بیروت دیکھنے کا بے حد اشتیاق ہے۔ مگر شیشے کی دیواروں کے سامنے والے پہاڑوں کے سوا کچھ اور نہیں دیکھ سکتے۔"

"یہ تو مجبوری ہے۔" وہ بولی پھر سوچ کر کہنے لگی "میرے ساتھ آئیں' میں آپ کو بیروت کی ایک جھلک دکھاتی ہوں۔"

ہم فوراً اٹھ کر چل پڑے۔ بزرگ کی نگاہیں بھی حرا کے ساتھ ہی مصروف سفر ہو گئیں۔ تسبیح کی گردش قدرے تیز ہو گئی۔

حرا نے ایک طرف بیٹھے ہوئے سیکورٹی والے سے عربی میں تبادلہ خیال کیا اور پھر ہنستی ہوئی یہ خبر لے آئی کہ ہم ساتھ والی بلڈنگ کی چھت پر جا کر بیروت دیکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ اس کی قیادت میں ہم چل پڑے راہ کی تمام رکاوٹیں اس کی بدولت دور ہو گئیں اور ہم سنگ مرمر کی سیڑھیاں چڑھ کر ایک بالکونی میں جا پہنچے۔ ہمارے سامنے ایک طرف پہاڑ تھے جنہیں دیکھ کر ہمیں ایبٹ آباد اور کاکول یاد آ گیا۔ دوسری جانب دور فاصلے پر آبادی کے نشان تھے جو صاف نظر نہیں آ رہے تھے۔

"اگر رات کا وقت ہو تو سامنے کی روشنیاں صاف جگمگاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔"

فضا میں تازگی تھی اور ہوا جانی پہچانی لگ رہی تھی' بلکہ مہکی ہوئی تھی۔ وہ حرا کے سینٹ کی خوشبو تھی یا اس کے قرب کا جادو حرا کو قطعی احساس نہیں تھا کہ ہم تینوں پر اس کی قربت نے کیا کیفیت طاری کر دی ہے یا تو وہ اس کی عادی تھی یا پھر اس کیفیت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ نائٹ کلب میں برہنہ رقص کرنے والی ایک لڑکی تھی مسافروں کی گرم نگاہی کا کیونکر اثر لے سکتی تھی۔ اس اثنا میں ہم کچھ اور بے تکلف ہو گئے۔ یہاں تک کہ ہمارے بازو سے لگنے اور شانے پر اپنا دست حنائی رکھنے میں بھی اسے کوئی تامل نہ رہا۔ خان صاحب اور زیادہ تیزی سے سانس لینے لگے۔ بولے "یار سنو!

ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم لوگ اگلی فلائٹ سے چلے جائیں۔"

بٹ صاحب نے بھی تائید کی "کوئی حرج نہیں ہے۔"

میں نے کہا "یہاں سے دو تین دن کے بعد فلائٹ ملے گی' پھر بھی خدا جانے سیٹ ملے یا نہ ملے اور پھر تمہارے پاس خرچ کے لئے پیسے کہاں ہیں؟"

یہ سن کر ان کا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

حرا کی معیت میں کچھ دیر بیروت کی فضاؤں میں معطر سانس لینے کے بعد ہم واپس لوٹے تو اس کا رخ ڈیوٹی فری شاپس کی جانب تھا۔ ہم بھی دکانوں کی سجاوٹ دیکھنے لگے۔ اچانک ایک نرم سی چیز ہمارے پہلو سے ٹکرائی۔ دیکھا تو حرا کہنی مار کر ہمیں متوجہ کر رہی تھی۔ اور وہ ہم سے اتنی نزدیک تھی کہ اس کے چہرے کا سنہری رواں بھی نظر آ رہا تھا۔

"وہ دیکھو' کتنا خوبصورت بریسلیٹ ہے۔" اس نے سامنے اشارہ کیا۔ واقعی بہت خوبصورت تھا ہم نے جھک کر دیکھا تو قیمت بھی نظر آ گئی۔ دو سو بیس ڈالرز۔ ہمارے پاس تو خفیہ طور پر رکھے گئے صرف بیس ڈالر ہی تھے۔ بھلا ہم کیا متوجہ ہوتے۔ ہماری خاموشی اور بے نیازی دیکھ کر وہ کچھ ملول سی ہو گئی۔ بعد میں اس نے ہمیں کچھ اور چیزیں بھی دکھائیں' مگر ہم نے ڈیوٹی فری شاپس سے دور ہو جانا ہی بہتر جانا۔ حرا کی مسکراتی ہوئی روشن آنکھوں کی چمک ایک دم ماند پڑ گئی اور چہرے پر جھنجھلاہٹ کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس نے اپنی خوبصورت کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی جانب دیکھا اور ہم سے رخصت کی اجازت چاہی۔ ہمارے جواب دینے سے پہلے ہی وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی رخصت ہو گئی۔

ہم تینوں اس کے متناسب اور لچکدار' جسم کو متحرک دیکھتے رہے۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو خان صاحب نے ایک لمبی آہ بھری۔ بٹ صاحب نے بڑی ناگواری سے ہمیں دیکھا اور کہنے لگے "اگر تھوڑی دیر اس کے ساتھ دکانوں کی سیر کر لیتے تو کیا حرج تھا۔ بلاوجہ اسے ناراض کر دیا۔"

خان صاحب نے دانائی کا مظاہرہ کیا "وہ سیر کرنے کے لئے نہیں آئی تھی وہ چاہتی تھی ہم اسے تحائف خرید کر دیں۔"

"مگر کس خوشی میں۔"

"اپنے ساتھ تھوڑا سا وقت گزارنے کا معاوضہ طلب کر رہی تھی۔"

"مگر یار خوبصورت بہت ہے۔" بٹ صاحب نے تبصرہ کیا۔

"خوبصورتی تو ہمارے چاروں طرف بکھری ہوئی ہے۔ جتنی چاہے دیکھ لو۔"

واقعی ہمارے اطراف میں رنگ و رنگت کی بارش ہو رہی تھی۔ بقول خان صاحب کسی جگہ نظر ہی نہیں ٹھہرتی تھی۔ ہم پھر لاؤنج میں ٹہلنے لگے۔ بار کاؤنٹر کی طرف گئے تو دیکھا کہ وہی تسبیح گھمانے والے باریش بزرگ حرا کے ساتھ کافی نوش فرما رہے تھے اور دونوں میں نہایت روانی سے کسی موضوع پر گفتگو جاری تھی۔ بزرگ کی انگلیاں تسبیح پر اور نگاہیں حرا کے چہرے پر تھیں۔ بٹ صاحب نے فوراً ہم لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا پھر پوچھنے لگے "یہ کونسا وظیفہ پڑھتے ہیں جو باتیں کرنے کے دوران بھی جاری رہتا ہے؟"

خان صاحب بولے "وظیفہ وہ دل ہی دل میں پڑھتے ہیں۔ باتیں زبان سے کرتے ہیں۔"

"مگر یہ تو بے حرمتی ہے تسبیح کی۔"

ہم لوگ ایک بار پھر لاؤنج کے بالکل آخری کنارے پر رکھے ہوئے نرم اور آرام دہ صوفوں پر جا کر نیم دراز ہو گئے۔ نیند پوری نہ ہو سکی تھی اس لئے غنودگی طاری تھی۔ ہم نے گھڑی کی جانب دیکھا ابھی ہماری روانگی میں کم سے کم دو گھنٹے باقی تھے۔

میں نے جمائی لیتے ہوئے کہا "اچھا بھئی، آپ لوگ جو جی میں آئے کریں مجھے نیند آ رہی ہے اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ فوراً ہی آنکھ لگ گئی۔

کچھ دیر بعد خان صاحب نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔

"کیا بات ہے؟ کیا فلائٹ کا وقت ہو گیا؟" میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"ارے نہیں بھئی۔ بات کچھ اور ہے۔" میں نے ان کا چہرہ دیکھا تو عجیب سی تبدیلی نظر آئی۔ انکی آنکھوں میں سرخ ڈورے کھنچے ہوئے تھے اور سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔

"قصہ کیا ہے؟ کوئی نشہ تو نہیں کر لیا؟"

انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔ ذرا میرے ساتھ آؤ۔ تم بھی حیران رہ جاؤ گے۔" وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے اپنے ساتھ لے گئے۔

لاؤنج کے مغربی کنارے پر جہاں ڈیوٹی فری شاپس کی دکانیں ختم ہوئی تھیں، کتابوں اور رسالوں کا ایک کاؤنٹر بنا ہوا تھا۔ ایک پختہ عمر کی نہایت طرح دار خاتون گھومنے والی الماری کے برابر میں کھڑی آنے والوں کو دیکھ رہی تھیں۔ لباس ان کا بھی اسکرٹ اور بلاؤز تھا اور جو ان کے بھرپور جسم پر بہت بھلا لگ رہا تھا۔ ان کے سنہری بالوں کی زلفیں شانوں پر لہرا رہی تھیں اور وہ اپنی کمر پر دونوں ہاتھ رکھے مجسم تصویر بنی کھڑی تھیں۔

"وہ دیکھا تم نے۔"

"ہاں ہاں۔ ایک عورت ہے۔"

"وہ تو ہے وہ کھڑی کہاں ہے؟"

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا "وہ سامنے تو کھڑی ہے۔ کتابوں اور رسالوں کی دکان کے ساتھ۔"

"ایک بات بتاؤں۔" وہ چاروں طرف کا جائزہ لینے کے بعد سرگوشی میں گویا ہوئے "وہاں بہت سی بیہودہ گندی کتابیں رکھی ہوئی ہیں اور ننگے ننگے رسالے بھی۔"

"کیا واقعی؟" ہماری آواز میں حیرت سے زیادہ اشتیاق غالب تھا۔

"ایمان سے، پلے بوائے اور اسی قسم کے گندے گندے رسالے مجھے تو عریاں تصویریں دیکھ کر شرم آ گئی۔"

"مگر تم نے تصویریں دیکھی کیوں تھیں؟"

"بس میں تو یونہی نظر مار رہا تھا اور بے شرمی دیکھو کہ ایک عورت کھلے بندوں ایسے ننگے رسالے بیچ رہی ہے۔ یار ان کے گھر والے نہیں ہوتے کیا؟"

"کیوں نہیں ہوتے، مگر یہ ماڈرن لوگ ہیں۔ ان باتوں کو برا نہیں سمجھتے۔"

"مگر بے حد شرم کی بات ہے اچھا تم سو جاؤ۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"وہیں کتابوں کی دکان پر۔ شائد کوئی کام کی کتاب نظر آ جائے۔" وہ بے تابی سے ادھر لپکے۔

"مگر تمہارے پاس پیسے کہاں ہیں؟"

وہ ڈھٹائی سے بولے "پیسے نہیں ہیں تو کیا ہوا؟ کتابوں کا ذوق تو ہے نا۔" اور تیزی سے رخصت ہو گئے۔ ہم نے بٹ صاحب کی تلاش میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں مگر وہ کہیں نظر نہ آئے۔ دل میں کہا "خیر جہاں بھی رہو' خوش رہو۔"

اور واپس آ کر دوبارہ صوفے پر گر کر..... آنکھیں موند لیں۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ خان صاحب دوبارہ وارد ہو گئے۔ اس بار ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

"نہایت واہیات عورت ہے۔" وہ دانت پیس کر بولے۔

"کون؟"

"ارے وہی' جو کتابوں کی دکان پر کھڑی ہے۔ پتا نہیں اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے؟"

"ہوا کیا کچھ بتاؤ تو؟"

یار کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں بس ویسے ہی کتابیں الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ سچ کہتا ہوں میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مسلمانوں کے ملک میں ایسی فضول کتابیں سربازار فروخت ہو سکتی ہیں۔"

"اچھا لیکچر بازی رہنے دو۔ یہ بتاؤ ہوا کیا؟"

"ہوا یہ کہ میں کتابوں کی ورق گردانی کر رہا تھا اور مارے شرم و غیرت کے پسینے پسینے ہو رہا تھا کہ وہ میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ مارے شرم کے میرے کان سرخ ہو گئے۔ تم خود غور کرو اتنی بے ہودہ کتاب اور ایک عورت آ کر سر پر کھڑی ہو جائے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر اس نے مجھ سے پوچھا: کیا آپ یہ کتاب خریدیں گے؟ کاش مجھے پوری طرح انگریزی آتی ہوتی تو اسے بتاتا کہ اس قدر بے ہودہ کتاب خرید کر میں کیوں گناہ گار بنوں مگر میں نے صرف اتنا کہا کہ میں تو بس پڑھ رہا ہوں۔ بولی' یہ لائبریری نہیں ہے اور کتاب میرے ہاتھ سے لے لی۔ یار بڑے افسوس کی بات ہے کہ پردیس میں ایک خوبصورت عورت نے..... بے عزتی کر دی وہ تو ذرا میری انگریزی کمزور ہے۔ ورنہ اسے مزہ چکھا دیتا۔ پھر سوچا کہ یہ تو مجھے کنگال سمجھ رہی ہو گی۔ اس لئے پوچھ لیا کہ کتاب کی قیمت کیا ہے؟ کہنے لگی دو ڈالر۔ پھر خیال آیا کہ ہمارے پاس پاکستانی روپے بھی تو ہیں۔ اسے شرمندہ کرنے کے لئے ایک کتاب خرید لیتے ہیں پوچھا "ہاؤ مینی پاکستانی روپیز؟" بڑی..... بے مروتی سے کہنے لگی "نو پاکستانی روپیز' اونلی امریکن ڈالرز۔" یار ذرا غور کرو۔ ایک مسلمان ملک میں ہماری یہ قدر ہے۔ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔"

"ہے تو سہی۔" ہم نے کہا۔

بولے "میں نے بھی پوچھ ہی لیا کہ کیا تم مسلم ہو؟ تو بولی میں کرسچن ہوں۔ یار میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہاں سارے کے سارے کرسچن ہی ہوتے ہیں۔ آخر مسلمان کیوں نہیں نظر آتے؟"

ہم نے کہا "وہ بزرگ جو تسبیح گھما رہے تھے۔ ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

کہنے لگے "مجھے تو ان کے بارے میں بھی شک ہے۔"

دراصل حسیناؤں کی بے مروتی نے خان صاحب کا اعتماد ہی مجروح کر دیا تھا۔ بٹ صاحب ابھی تک نہیں آئے تھے اور ادھر اعلان ہو رہا تھا کہ روم جانے والی پین ایم کی فلائٹ روانگی کے لئے تیار ہے۔

خان صاحب نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا اور بولے "یہ بٹ کہاں چلا گیا۔ اسے تو انگریزی بھی نہیں آتی۔ ایسا نہ ہو یہیں رہ جائے۔"

بات تو فکر مند کرنے والی تھی۔ بٹ صاحب سے کوئی بعید نہ تھا کہ انہوں نے یہ اعلان ہی نہ سنا ہو اگر سنا ہو تو ان کے پلے کچھ نہ پڑا ہو۔ چلو اسے ڈھونڈتے ہیں۔" میں نے کہا۔

ہم دونوں بٹ صاحب کی تلاش میں روانہ ہو گئے۔ انہیں ہر طرف تلاش کر لیا مگر کوئی پتا نشان نہیں ملا۔ ظاہر ہے کہ وہ لاؤنج سے باہر نہیں جا سکتے تھے تو پھر گئے کہاں؟ کچھ دیر بعد وہ غسل خانوں کی جانب سے آتے ہوئے نظر آئے۔ کچھ محجوب سے نظر آ رہے تھے۔

ہم دونوں ان کی طرف لپکے "کہاں غائب ہو گئے تھے؟"

"ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔ تم ہی نے تو کہا تھا کہ گھومو' پھرو' سیر کرو۔"

وہ تو کہا تھا' مگر تم سیر کرنے گئے کہاں تھے؟"

"سیر تو یہیں کر رہا تھا۔ پھر ذرا غسل خانے کی طرف چلا گیا اور وہاں حادثہ ہو گیا۔"

"حادثہ؟"

"ہاں۔" وہ نظریں جھکا کر بولے "میں غلطی سے لیڈیز کے باتھ روم میں چلا گیا۔"

"اُف خدایا..... جہالت کی انتہا ہو گئی۔ بندہ خدا، اگر پڑھنا نہیں آتا تو کیا تم نے دروازے پر زنانہ تصویر بھی نہیں دیکھی تھی؟"

"یار دیکھی ہوتی تو اندر کیوں جاتا۔ بس ذرا جلدی تھی۔"

"پھر ہوا کیا؟" خان صاحب نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

"ہوتا کیا۔ سب عورتیں چیخیں مارتی ہوئی باہر بھاگ گئیں۔"

"باہر بھاگ گئیں؟" خان صاحب کی حیرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ "یعنی ایک دم۔ جس حالت میں تھیں اسی طرح؟"

"حالت کو کیا ہوا تھا۔ ٹھیک ٹھاک تھی۔"

"کچھ مرمت وغیرہ بھی ہوئی؟"

"ارے نہیں بھائی، یہاں کے لوگ بہت سمجھدار ہیں وہ تو بجائے ناراض ہونے کے ہنس رہی تھیں۔"

"یار حد ہو گئی بے شرمی کی۔" یہ خان صاحب تھے۔ "انہیں تو اللہ ہی نیک ہدایت دے گا۔"

اتنی دیر میں ایک بار پھر فلائٹ کی روانگی کا اعلان ہوا اور ہم تینوں مقررہ گیٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہمارے ساتھ جو لوگ ہوائی جہاز میں سوار ہو رہے تھے۔ ان میں زیادہ تعداد نئے مسافروں کی تھی اور یہ سب کے سب یورپین تھے۔ جو خان صاحب کے لئے بہت اطمینان اور خوشی کا سبب تھا۔

یہ ہمارا بیروت سے پہلا سرسری تعارف تھا۔ ہمارا مصمم..... ارادہ تھا کہ واپسی میں چند دن بیروت میں ضرور گزاریں گے۔ اس مقصد کے لئے ہم نے یورپ کے سفر کے دوران انتہائی کنجوسی سے کام لیتے ہوئے بیروت کے لئے خاصا زادِ راہ جمع کر لیا تھا۔ خان صاحب بھی بیروت جانے کے لئے بہت بیتاب تھے۔ یورپ میں انہوں نے مختلف شہروں کی سیر کی تھی مگر بیروت کی طلب ان کے دل سے نکل نہیں سکی تھی جب بھی انہیں یہ مشورہ دیا جاتا کہ وہ بیروت کے بجائے سوئٹزر لینڈ کیوں نہیں چلے جاتے تو ان کی آنکھوں میں عجیب قسم کی چمک پیدا ہو جاتی اور وہ ایک آہ سرد بھر کر کہتے "تم یہ بات نہیں سمجھو گے۔ بیروت مجھے پکار رہا ہے۔"

بیروت کی پکار آخر کار سن لی گئی اور واپسی پر ہم لوگوں نے بیروت میں قیام کرنے کا جو پروگرام بنایا تھا وہ پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔

پیرس سے روانہ ہو کر پین ایم کی یہ پرواز براستہ روم بیروت کے لئے روانہ ہوئی تو ہم اس میں سوار تھے۔

جب ہم بیروت پہنچے تو رات کا وقت تھا۔ ہمارا اندازہ بالکل درست نکلا رات کے وقت بیروت کا حسن ہی کچھ اور تھا۔ طیارے میں سے جھانک کر دیکھا تو شہر کی روشنیاں جگنو کی طرح جھلملاتی نظر آئیں اور پھر آہستہ آہستہ ان کی چمک دمک میں اضافہ ہونے لگا۔ طیارہ مختلف زاویوں سے فضا میں اڑانیں کر رہا تھا اور بیروت کے مختلف انداز باری باری ہماری آنکھوں کے سامنے آتے رہے۔ ایک بار طیارے نے غوطہ لگایا اور پتنگ کی مانند ترچھا ہو کر پرواز کرنے لگا۔ ہمارے سامنے نیم دائرے میں روشنیوں کا سمندر تھا اور ایک جانب تاریکی کا سیاہ پردہ' یہ معما ہماری سمجھ میں نہ آ سکا۔ جب دن کی روشنی میں دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ سمندر تھا جو تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

بیروت کے ائیرپورٹ پر اترنے سے پہلے حسب معمول مسافروں کو خوش آمدید کہا گیا۔ خاصی بڑی تعداد میں مسافر بیروت پر اترے۔ ان میں جاپانیوں کا ایک گروپ بھی شامل تھا۔ ان دنوں جاپانیوں نے تازہ تازہ دنیا میں گھومنا شروع کیا تھا اور ان کی شکلیں دنیا بھر کے مختلف ہوائی اڈوں اور ہوائی جہازوں میں نظر آنے لگی تھیں۔

جاپانی یوں تو زرد نسل کے لوگ کہلاتے ہیں لیکن سرخ و سفید ہوتے ہیں۔ جلد اتنی ملائم اور نفیس کہ بے ساختہ پیار آ جائے۔ چہرے بچوں کی طرح بھولے بھالے اور معصوم۔ اچھے خاصے ہنس مکھ اور باتونی لوگ ہیں۔ خاص طور پر آپس میں خوب ہنستے بولتے ہیں۔ جب ہم نے اتنے بہت سے جاپانیوں کو اس طرح ہنستے بولتے اور گھلتے ملتے دیکھا تو

یقین ہی نہیں آیا کہ یہ وہی قوم ہے جس نے دوسری عالمی جنگ کے دوران مشرق کو زیر و زبر کر دیا تھا اور جن کے ظلم و ستم اور سنگدلی کی داستانیں آج تک سنائی جاتی ہیں۔ بہت ممکن ہے اہل مغرب نے اپنے معمول کے مطابق انہیں بدنام اور رسوا کرنے کے لئے یہ مہم چلائی ہو مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ جاپانی فوجوں نے دوسری جنگ عظیم کے دوران جبر و استبداد کی ایک نئی تاریخ قلم بند کی تھی۔ آج وہی جاپانی اس قدر صلح جو امن پسند اور نیک خصلت نظر آتے ہیں کہ یقین نہیں آتا۔ ہم نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ جاپانی عام طور پر ٹولیوں کی صورت میں سفر کرتے ہیں جس میں عورتیں نہیں ہوتیں۔ جاپانی جوڑے ہمیں سفر کے دوران خال خال ہی نظر آئے۔ جاپانیوں کو ہم نے عموماً" آپس میں بات چیت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ دوسروں سے وہ بہت کم گفتگو کرتے ہیں۔ اور جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے ہم نے انہیں غیر جاپانیوں سے ہنسی مذاق کرتے ہوئے اور بلند آواز میں قہقہے لگاتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔

بیروت کے ائیرپورٹ سے باہر نکلنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ حالانکہ مسافروں کی خاصی بڑی تعداد موجود تھی۔ ہم نے یورپ کے ائیرپورٹ بھی دیکھ لئے تھے اور بیروت کے ساتھ ان کا موازنہ کرتے ہوئے کسی قسم کی ندامت کا احساس نہیں ہوا۔ کچھ کراچی کے ساتھ ان کا مقابلہ کرو تو خاصی شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔ فرق یہ تھا کہ یورپ کے ہوائی اڈوں پر سامان لے جانے کے لئے پورٹرز بہت کم تعداد میں نظر آتے ہیں۔ جبکہ بیروت میں وردی پوش گورے چٹے پورٹر کافی تعداد میں موجود تھے اور مسافروں کی جانب دیکھ دیکھ کر مسکراتے بھی تھے۔ لبنانی خوبصورت لوگ ہوتے ہیں۔ سیاہ آنکھیں' سیاہ بال' تیکھا ناک نقشہ' خوش مزاج' خوش شکل اور خوش خوراک باتونی ایسے کہ ایک بار شروع ہو جائیں تو انہیں خاموش کرانا مشکل ہے۔ یہ صفت محض عورتوں ہی تک محدود نہیں ہے' مرد بھی اسی رفتار اور کثرت سے باتیں کرتے ہیں اور خاصی دلچسپ گفتگو ہوتی ہے۔ لبنان میں اگرچہ امریکی اثر زیادہ ہے۔ مگر فرنچ بھی خوب بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ عربی تو خیر ان لوگوں کی مادری زبان سمجھ لیجئے۔ انگریزی یورپین لب و لہجے میں بولتے ہیں۔ اور جو ان کی زبان سے بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔

ائیرپورٹ پر مسافر بسوں کا اہتمام تھا اور چمک دار قیمتی ٹیکسیاں بھی موجود تھیں۔

خان صاحب کا مشورہ تھا کہ ہمیں بس کے ذریعے سفر کرنا چاہئے۔ اس طرح خرچہ بھی کم ہو گا بات تو صحیح تھی۔ لیکن خان صاحب کا مقصد کچھ اور تھا ایک جرمن خاتون جو تنہا سفر کر رہی تھیں اور روم سے بیروت تک کے سفر میں خان صاحب سے خاصی بے تکلف ہو چکی تھیں بس کے ذریعے ہوٹل جا رہی تھیں۔ اس لئے خان صاحب بھی مصر تھے کہ ہمیں بھی بس کے ذریعے سفر کرنا چاہئے۔ پرواز کے دوران جب ان دونوں کو گھل مل کر باتیں کرتے ہوئے دیکھا تو ہمیں بہت حیرت ہوئی تھی۔ انگریزی خان صاحب کی بس واجبی ہی تھی۔ تھوڑی بہت آتی تو تھی مگر بولتے ہوئے گھبرا جاتے تھے اور اکثر انہیں انگریزی الفاظ یاد نہیں آتے تھے ادھر جرمن دوشیزہ بھی انگریزی میں بہت کمزور تھی۔ چنانچہ دونوں کی بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی۔ ہمارا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ انسانوں کو ایک دوسرے سے نزدیک ہونے کے لئے ایک دوسرے کی زبان سے واقف ہونا ضروری نہیں ہے۔ اکثر اوقات زبان نہ جاننا ہی لوگوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لے آتا ہے۔ خان صاحب اور مس جین کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ ان دونوں کو گفتگو کے دوران مناسب انگریزی الفاظ دستیاب نہیں ہوتے تھے۔ اور وہ اشاروں کنایوں سے کام چلانے پر مجبور تھے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ دنیا میں اشاروں کی زبان سب سے زیادہ سمجھی جاتی ہے پورٹر ہماری جانب دیکھ دیکھ کر مسکراتے رہے مگر ہم نے اپنا سامان ان کے حوالے نہیں کیا خود ہی ٹرالی میں لاد کر چل پڑے۔ بس تک پہنچنے سے پہلے ہم نے خان صاحب سے پوچھا ”مگر ہم ٹھہریں گے کہاں؟“

”ہوٹل میں اور کہاں؟ کیا یہاں تمہارا کوئی عزیز ہے؟“

”بالکل نہیں۔“

”تو پھر ظاہر ہے کہ ہوٹل ہی میں ٹھہریں گے۔“

”مگر کون سے ہوٹل میں؟“

”تمہیں فکر کس بات کی ہے۔ اس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔“ یہ کہہ کر تیز قدم اٹھاتے ہوئے وہ جین کی جانب روانہ ہو گئے اور کچھ دیر دونوں میں گفتگو ہوتی رہی۔ وہ مسکراتے ہوئے واپس آئے اور بولے ”جین یہاں پہلے بھی آ چکی ہے۔ ایک ایسے ہوٹل میں ہمیں لے جائے گی جو بہت اچھا بھی ہے اور بہت سستا بھی اور سمندر سے بھی زیادہ دور نہیں ہے۔“

”سمندر سے دور یا نزدیک ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

”بہت فرق پڑتا ہے۔“ وہ دانائی کے انداز سے کہنے لگے۔

”یہاں ہر چیز کی خوبی کو اس پیمانے سے ناپا جاتا ہے کہ وہ سمندر سے کتنی دور ہے۔“

”مگر اس سے فائدہ کیا ہے؟“

”یہ تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا۔“

”بس بہت آرام دہ تھی اور ائیر کنڈیشنڈ بھی تھی۔ بس ڈرائیور ایک تنومند اور خوش شکل لبنانی تھا۔ اس کے گورے چہرے پر کالی مونچھیں اور سیاہ آنکھیں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ مس جین کی سیٹ ڈرائیور کے بالکل نزدیک تھی۔ بہت جلد دونوں میں بات چیت کا سلسلہ شروع ہو گیا جو خان صاحب کے لئے ناقابل برداشت تھا مگر مجبور تھے کیونکہ ان کے اور مس جین کے درمیان چار قطاریں حائل تھیں۔ کچھ دیر پیچ و تاب کھاتے رہے اور پھر کہنے لگے ”یہ گوری عورتیں بہت بے شرم ہوتی ہیں۔ غیر مردوں سے یوں گھل مل کر باتیں کرنے لگتی ہیں۔“

”یہ نہ بھولو کہ تم بھی اس کے لئے غیر ہی ہو‘ اگر وہ تم سے بے تکلف ہو سکتی ہے تو دوسروں سے بھی ہو سکتی ہے۔“

وہ اک لمبی آہ بھر کر خاموش ہو گئے۔ بس جگمگاتی خوبصورت سڑکوں پر سے گذرتی رہی۔ بلند و بالا ماڈرن عمارتیں رنگ و نور میں ڈوبی ہوئی۔ شیشوں سے چھنتی ہوئی رنگین روشنیاں اور ان کے عقب میں سجی ہوئی اشیاء بے حد دلکش لگ رہی تھیں۔ ٹریفک ایک نظم و ترتیب کے تحت چل رہی تھی۔ ٹریفک کا ہجوم بہت زیادہ تھا۔ مگر ہارنوں کا شور سننے میں نہیں آیا۔ ہماری بس شائد ایک کمرشل علاقے سے گزر رہی تھی۔ دکانیں انواع و اقسام کی اشیا سے بھری ہوئی تھیں اور سجاوٹ میں یورپ سے کم نہیں تھیں۔ خریداروں کا ہجوم بھی کم نہ تھا۔ یورپ کی طرح مغربی لباس کی بہتات تھی۔ جسم اور چہرے بھی گورے چٹے تھے لیکن حسن و جمال یورپ کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ البتہ کہیں کہیں عربی لباس اور چغے بھی نظر آ جاتے تھے۔ بعد میں جب چند روز بیروت کی فضاؤں

میں گزارے تو ہمیں احساس ہوا کہ خود یورپ والوں کو بھی بیروت اس قدر پر کشش کیوں لگتا ہے۔ یہاں مشرق و مغرب کا جو حسین امتزاج نظر آتا ہے وہ یورپ میں بھلا کہاں؟

خوبصورت اور کشادہ سڑکوں سے گزرتی ہوئی ہماری بس ایک بلند و بالا ہوٹل میں داخل ہو گئی۔ ہم نے فوراً اپنا سامان سمیٹنا شروع کر دیا مگر خان صاحب نے مطلع کیا کہ یہ ہوٹل ہماری منزل نہیں ہے۔ دراصل مس جین نے آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں اشارہ کر کے سمجھا دیا تھا کہ ابھی ہمارا ہوٹل نہیں آیا ہے۔ چند مسافر اس ہوٹل پر بس سے اتر گئے۔ مس جین کے ساتھ والی ایک سیٹ خالی ہوئی تو خان صاحب عقاب کی طرح جھپٹے اور وہاں جم کر بیٹھ گئے۔ چند جاپانی مسافر بھی ہمارے ساتھ تھے اور بعد میں وہ اسی ہوٹل میں مقیم ہوئے جہاں ہم ٹھہرے تھے۔ ہوٹل کا نام تھا "لاپریذیڈنسے" نام کی مانند ہوٹل بھی شاندار اور آرام دہ تھا۔ جگمگاتے ہوئے برآمدے اور پرشکوہ لابی جگہ جگہ خوبصورت سیاہ چشم خواتین سفید بلاؤز اور گہرے نیلے رنگ کی اسکرٹ پہنے ہوئے نظر آئیں۔ کاؤنٹر پر بھی خواتین کی اکثریت تھی۔ ہر طرف حسن کی یہ کثرت دیکھی تو خان صاحب بھی ہماری طرح بوکھلا گئے۔ اور آزمائش میں پڑ گئے کہ مس جین کی طرف توجہ دیں یا دوسرے پیکر جمال چہروں کی طرف متوجہ ہوں۔ مس جین نے درست ہی کہا تھا کہ یہ ہوٹل مہنگا نہیں تھا۔

ان کے معیار سے شاید مہنگا نہ ہو مگر ہمارے لئے ڈبل روم کا کرایہ پندرہ ڈالر بہت زیادہ تھا۔ کچھ دیر تو سوچتے رہے پھر خان صاحب کے مشورے پر بٹ صاحب کے لئے ڈبل روم میں ایک اضافی بستر ڈلوا لیا اور کرائے میں پانچ ڈالر کا اضافہ منظور کر لیا۔ ہوٹل کی راہداریاں سنگ مرمر کی تھیں۔ اور در و دیوار شیشے کے۔ روشنیوں اور لڑکیوں کی تعداد قریب قریب یکساں تھی۔ یعنی دونوں بہت افراط سے تھیں اور یکساں انداز میں جگمگا رہی تھیں۔ لفٹ میں سوار ہوئے تو وہ خوشبوؤں سے مہک رہی تھی۔ خوشبوؤں کا راز بھی کوئی راز نہیں تھا۔ ہمارے علاوہ لفٹ میں دو اور مسافر خواتین بھی موجود تھیں۔ وہ خوشبو میں بسی ہوئی تھیں۔ مگر ان سے زیادہ خوشبودار وہ خواتین تھیں جو ہوٹل انتظامیہ کی جانب سے ہمیں کمرے تک پہنچانے پر مامور کی گئی تھیں۔ ان کا سفید اور نیلا پیرہن شائد خوشبو میں دھویا گیا تھا اسی لئے خوشبو میں بسا ہوا تھا۔ زلفیں ان کی سیاہ تھیں جو کھلے

گلے اور شانوں پر بل کھا رہی تھیں۔ مسافر خواتین بھی خاصی قبول صورت تھیں مگر سچ تو یہ ہے کہ لبنانی حسن کے مقابلے میں پھیکی پڑ گئی تھیں اور شاید خود انہیں بھی اس کا احساس تھا۔ مس جین کسی اور منزل پر فروکش ہوئی تھیں اور بظاہر خان صاحب ان کی طرف سے بے فکر و بے پروا ہو گئے تھے۔ لفٹ سے باہر نکل کر ہم سنگ مرمر کی گیلری سے گزرتے ہوئے ایک کمرے کے سامنے لے جائے گئے۔ خاتون نے اپنے دست حنائی سے دروازے کا قفل کھولا اور ہمیں اندر داخل ہونے کا اشارہ دیا۔ کمرا کشادہ اور نفاست سے سجا ہوا تھا مگر علیحدہ علیحدہ دو بستروں کی جگہ محض ایک ہی کشادہ بیڈ دیکھ کر ہم پریشان ہو گئے۔ خان صاحب پہلے ہی بتا چکے تھے کہ وہ بیڈ پر اکیلے سونے کے عادی ہیں۔ گویا ڈبل بیڈ پر ہمیں بٹ صاحب کے ساتھ سونا تھا جو کسی سزا سے کم نہ تھا کیونکہ وہ نہ صرف کروٹیں بہت بدلتے تھے بلکہ خراٹے بھی لیا کرتے تھے۔ ہم نے فوراً اس مسئلے کی جانب سب کی توجہ دلائی اور اعلان کر دیا کہ ہم اس کمرے میں نہیں رہیں گے۔

خان صاحب کا کہنا تھا کہ علیحدہ کمرہ لیا تو مہنگا پڑے گا۔ ہمیں یہ بھی منظور تھا ہم آپس میں مباحثہ کرتے رہے اور وہ خاتون حیران کھڑی ہمیں دیکھتی رہیں۔ سب سے پہلے ہمیں اس بدتہذیبی کا احساس ہوا۔ ہم نے فوراً انگریزی میں ان سے معذرت کی اور بتایا کہ مسئلہ کیا ہے۔

بٹ صاحب نے کہا "اسٹاف سے پوچھو کہ سنگل بیڈ روم کا کیا کرایہ ہے؟"

خان صاحب نے کہا "کتنی بدتمیزی کی بات ہے کہ اب تک ہم نے اس لڑکی سے اس کا نام تک نہیں پوچھا ہے۔" پھر وہ لڑکی سے مخاطب ہوئے۔ "وہاٹ از یور نیم لیڈی؟"

"شمامہ" اس نے عربی اور انگریزی ملے جلے لہجے میں اس قدر عنائیت سے کہا کہ لطف آ گیا۔ آواز کی شیرینی الفاظ کی ادائیگی سے بڑھ کر تھی۔

بٹ صاحب بھی اس نام پر لوٹ پوٹ ہو گئے۔ بولے "یو مسلم؟"

لڑکی نے اقرار میں گردن ہلائی تو بٹ صاحب کی نظریں اس کے سراپا پر سے پھسلتی ہوئی سڈول پنڈلیوں پر پہنچ کر رک گئیں۔ پہلے تو ان کے چہرے پر غصے کے آثار پیدا ہوئے۔ مگر پھر وہ مسکرائے اور کہنے لگے "یار ان کا تو ماحول ہی خراب ہے۔ بس نام ہی

کے مسلمان ہیں۔ خیر ہمیں کیا۔"

ہم نے شمامہ کو کمرے کی صورت حال بتائی۔ اور اس نے مشورہ دیا کہ ہمیں استقبالیہ پر جا کر بات کرنی چاہئے۔ خان صاحب اور بٹ صاحب کو کمرے میں ٹھہرنے کا مشورہ دے کر ہم شمامہ کے ساتھ دوبارہ لفٹ کی جانب روانہ ہو گئے۔ راستے میں اخلاقاً باتیں بھی کرنا پڑیں مثلاً ہم نے کہا کہ بچپن ہی سے ہمارے گھر میں عطر شمامہ کا تذکرہ ہوا کرتا تھا۔ مگر آج ہم نے پہلی مرتبہ شمامہ کو مجسم دیکھا ہے۔ شمامہ جتنی حسین تھی اتنی ہی ذہین بھی بولی "تمہیں تعریف کرنے کا ڈھنگ خوب آتا ہے۔"

ہم نے کہا "تعریف تو ہم نے ابھی کی ہی نہیں۔ کبھی فرصت کے وقت کریں گے..... مگر مختصراً" یہ کہ ہم نے یورپ کے بہت سے ملک دیکھے ہیں مگر تم جیسی لڑکی نہیں دیکھی۔"

وہ بے ساختہ ہنس پڑی اور بولی "میں ایسی تعریفوں کی عادی ہو چکی ہوں۔"

استقبالیہ پر موجود خاتون نے اس قدر گرمجوشی اور خلوص سے ہمارا استقبال کیا جیسے کسی رشتے دار سے عرصہ دراز کے بعد ملاقات ہوئی ہو۔ ہمارا مسئلہ سن کر اس نے کہا "آپ کی پرابلم کا حل یہ ہے کہ آپ سب الگ الگ کمرہ لے لیں۔ اتفاق سے اس وقت تین چھوٹے کمرے خالی بھی ہیں۔ اگرچہ وہ مختلف منزلوں پر ہیں۔"

ہم نے انہیں صاف صاف بتا دیا کہ ہم زیادہ خرچہ نہیں کر سکتے۔ ہمارے ساتھ خاص عنایت ہونی چاہئے۔ پھر ساتھ ہی ہم نے اسے مطلع کیا کہ ہم پاکستانی ہیں اور خاص طور پر بیروت دیکھنے آئے ہیں۔ پتا نہیں اس پر ہماری دردناک گفتگو کا اثر ہوا یا ہمارے پاکستانی ہونے کی وجہ سے متاثر ہو گئی۔ وہ اندر کمرے میں گئی اور پھر واپس آ کر اطلاع دی کہ ہمیں سنگل بیڈ روم ۹ ڈالر میں مل جائے گا جو اتنا کم کرایہ ہے کہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ہم سوچ میں پڑ گئے تو شمامہ نے اپنی شیریں آواز میں کہا "جناب دراصل ہماری خواہش ہے کہ آپ اس ہوٹل میں قیام کریں۔ اس بہانے ہمیں پاکستان کے بارے میں بھی کچھ معلوم ہو جائے گا۔ سنا ہے کہ وہ بہادر لوگوں کا ملک ہے۔"

واقعہ یہ ہے کہ ۶۵ء کی جنگ کے بعد پاکستانیوں کی دلیری کی ساری دنیا میں دھاک بیٹھ گئی تھی۔ اب ذرا غور فرمایئے کہ ایک طرف وہ ہمارے ملک کی تعریف میں رطب اللسان تھی۔ اور دوسری طرف ہم سے بھی لگاوٹ کا اظہار کر رہی تھی۔ ایسی صورت میں پانچ سات ڈالر کا خرچ کون خاطر میں لا سکتا ہے۔ ہم فوراً پسیج گئے اور استقبالیہ پر متعین خاتون نے ہمارے لئے دوبارہ بکنگ کر دیا اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ہم نے ان کا نام بھی پوچھ لیا۔ وہ فارم بھرتے ہوئے بولیں "میریانا۔" اگر خان صاحب ہوتے تو فوراً سوال کرتے "یو مسلم؟" مگر ہم سمجھ گئے کہ کرسچن خاتون ہیں۔ بیروت میں رہ کر ہمیں بہت جلد اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں مسلمان اور کرسچن دونوں قریب قریب یکساں تعداد میں ہیں۔ اور دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہے۔ بہت سے کرسچن تو نام بھی مسلمانوں جیسے رکھتے ہیں۔ اپنے لبنانی اور عرب ہونے پر دونوں ہی نازاں ہیں۔

ہم شمامہ کے ہمراہ دوبارہ کمرے میں گئے اور تمام حالات بتائے۔ وہ لوگ بھی ہمارے فیصلے سے بہت خوش ہوئے کیونکہ پاکستان کے مداحوں میں رہنا ان کے لئے بذات خود ایک تجربہ تھا۔ اس تمام عرصے میں ہمارے سامان کی ٹرالی ایک پورٹر گیلری میں لئے کھڑا تھا۔ شمامہ نے اسے عربی میں کچھ ہدایات دیں۔ اور ہم لوگوں کو مختلف منزلوں پر اپنے اپنے کمرے میں پہنچایا گیا۔ ہم کمرے میں پہنچے تو دیکھا کہ بیڈ روم خاصا کشادہ ہے۔ کچھ زیادہ ہی کشادہ معلوم ہوا۔

شمامہ نے بتایا کہ دراصل یہ ڈبل بیڈ ہے جو ہمیں دیا جا رہا ہے ہمیں متفکر انداز میں بیڈ کی طرف دیکھتے ہوئے پایا تو وہ شرارت سے مسکرا کر بولی "شائد اتنے بڑے بیڈ پر اکیلے تمہیں نیند نہیں آئے گی؟" یہ کہا اور مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ ہم کافی دیر تک اس کے فقرے پر غور کرتے رہے۔

کھانا ہم لوگوں نے ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں کھایا' بہت عمدہ سروس' نفیس ماحول' ویٹریس خواتین کا لباس اور مسکراہٹیں دونوں ہی قابل توجہ تھیں۔ مینو دیکھا تو بہت سے کھانے ہماری سمجھ میں نہیں آئے۔ ہم نے ویٹریس سے پوچھا کہ کوئی سادہ سا کھانا تجویز کرے۔ پھر یہ بھی بتایا کہ ہم مسلمان لوگ ہیں۔ حرام چیزیں نہیں کھاتے۔ وہ مسکراتی رہی' بولی "مسلمان تو یہاں بہت آتے ہیں۔ مگر ایسی بات کسی نے نہیں کی۔"

ہم نے کہا "تو پھر؟"

بولی "آپ کا حکم سر آنکھوں پر' ہمارے پاس آپ کے لئے بھی کھانا موجود ہے۔ کیا خیال ہے۔ مرغ اور مچھلی والا کھانا پسند کریں گے؟"

کھانا خاصا لذیذ تھا۔ ویٹریس کی لگاوٹ اور ماحول کی رنگینی نے اس کی لذت کو دوچند کر دیا تھا۔

ہمارے اردگرد ہنستے بولتے بے فکروار خوش و خرم لوگوں کا ہجوم تھا۔ چند خاندانوں کے ساتھ بچے بھی تھے جن کی شوخیاں اور شرارتیں دیکھ کر سبھی مسرور ہو رہے تھے۔ اس قدر پر آسائش' خوبصورت اور مطمئن ماحول اور رنگین فضا میں چند سانسیں لینا بھی ایک نعمت سے کم نہ تھا۔ ہم نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ اگر اللہ نے توفیق دی تو ہر دو چار سال بعد بیروت کا سفر ضرور کیا کریں گے۔

کھانے کے بعد کافی کا دور چلا۔ ویٹریس نے پوچھا "آپ کیسی کافی پسند کریں گے؟ لبنانی کافی لے آؤں؟"

ہمارے بولنے سے پہلے ہی خان صاحب چلا اٹھے۔ "ہاں ہاں لے آؤ۔"

ہم نے کہا "بھائی پوچھنے تو دیا ہوتا کہ لبنانی کافی کیسی ہوتی ہے؟"

بولے "یار لبنان کی ہر چیز اچھی ہے پھر کافی کیسے خراب ہو سکتی ہے؟"

دلیل معقول تھی۔ بٹ صاحب جو اب تک خاموشی سے بیٹھے مختلف حسین چہروں کو دیکھنے میں محو تھے۔ یکایک چونکے اور بولے "تم نے اس لڑکی کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔"

لڑکی کافی لے کر آئی اور بڑے سلیقے سے برتن سجا کر بولی "بنا دوں؟"

"خان صاحب نے فوراً کہا "ہاں' ہاں۔" دراصل اس بہانے وہ لڑکی کو دیر تک نگاہوں کے سامنے دیکھنا چاہتے تھے۔

ویٹریس نے اپنے خوبصورت اور نازک ہاتھوں سے چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں کافی انڈیلی۔ کافی انتہائی گاڑھی تھی۔ موبل آئیل سے بھی زیادہ گاڑھی اور کوئلے سے زیادہ سیاہ۔ میز پر دودھ دان اور چینی دان بھی موجود تھا۔ لڑکی نے کافی کی پیالیاں ہمارے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا "چینی لیں گے؟" دراصل اس کافی کا مزا تو چینی اور کریم کے بغیر ہی آتا ہے۔ آپ بہت پسند کریں گے۔"

ہم نے کافی کی پیالی اٹھا کر ہونٹوں سے لگائی اور ہلکا سا گھونٹ لیا۔ یوں لگا جیسے کتھا کھا لیا ہو۔ اس قدر بدمزہ' کڑوی کسیلی کہ جی چاہا تھوک دیں۔ مگر آس پاس کی میزوں پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر ستم گر جس نے یہ کافی پلانے کی فرمائش کی تھی' سامنے کھڑی تھی۔ پوچھنے لگی "کیسی ہے؟ اچھی ہے نا؟"

ہم نے کہا "بہت زیادہ۔" اور اپنے ساتھیوں کو اردو میں خبردار کر دیا کہ ہرگز یہ کافی نہ پینا۔ بالکل زہر ہے۔ ویٹریس منتظر تھی کہ وہ لوگ بھی پی لیں۔ ہم نے اس کی توجہ ہٹانے کی غرض سے پوچھا "آر یو مسلم؟"

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ بٹ صاحب نے لقمہ دیا "نام بھی تو پوچھو۔"

نام اس کا صائمہ تھا۔ ہم نے کافی کی بہت تعریف کی مطلب یہ تھا کہ وہ رخصت ہو جائے۔ جیسے ہی وہ پلٹی ہم نے کہا "فوراً کھڑے ہو جاؤ۔"

وہ دونوں گھبرا کر بولے "کیا ہوا؟ خیر تو ہے؟"

ہم نے کہا "زہر پینا اس کافی پینے سے آسان ہے۔ اس کے واپس آنے سے پہلے چل پڑو ورنہ یہ کافی پینی پڑ جائے گی۔"

سوال یہ تھا کہ سیر کے لئے باہر جائیں یا سیر و تفریح اگلے دن کے لئے ملتوی کر دیں۔ تھکن بھی زیادہ تھی اس لئے کچھ دیر ہوٹل کی لابی میں بیٹھے یا وہیں ٹہلتے رہے وہ بذات خود ایک سیر تھی' کیسے کیسے چہرے اور کیسے کیسے لوگ نظر آ رہے تھے۔ جی چاہتا تھا۔ ساری رات وہیں بیٹھ کر گزار دیں۔ ہمیں ایک جھلک جین کی بھی دکھائی دی۔ وہ ایک لفٹ سے نکل کر کافی روم کی طرف جا رہی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ خان صاحب نے اسے نہیں دیکھا مگر بات یہ تھی کہ خان صاحب کو پتہ چل گیا تھا ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ اس لئے جین میں ان کی دلچسپی کم ہو گئی تھی۔ بٹ صاحب کا خیال تھا کہ ہمیں کم از کم ہوٹل کے' بال روم کا ایک چکر ضرور لگا لینا چاہئے۔ تجویز بہت معقول تھی اس لئے سب کو پسند آئی۔ ایک گزرتی ہوئی خاتون کو دیکھ کر بٹ صاحب نے منہ کھولا ہی تھا کہ خان صاحب نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "خبردار سسٹر نہ کہنا یار ایک تو تم ہر ایک لڑکی کو سسٹر کہہ کر مخاطب کرتے ہو۔ وہ کیا سوچتی ہو گی؟"

"سوچتی ہو گی' یہ میرا منہ بولا بھائی ہے۔"

"جی نہیں' سوچتی ہو گی' جاہل مطلق ہے۔ مجھے تو بہت شرمندگی ہوتی ہے۔"

"تو پھر میں کیا کہوں؟ ہر ایک کا نام تو مجھے معلوم نہیں ہوتا۔"

"ایکسکیوزمی کہہ کر مخاطب کیا کرو۔"

"اتنا مشکل لفظ میری زبان سے نہیں نکلتا۔ ٹھیک ہے میں اسٹاف کہہ دیا کروں گا۔"

ہوٹل کے اسٹاف کی ایک خاتون نے ہمیں بتایا کہ بال روم دوسری منزل پر ہے۔ بجلی سے چلنے والی سیڑھیوں کے ذریعے بال روم تک پہنچے۔ دروازے کے باہر ایک خوبصورت سی میز پر اس سے بھی خوبصورت خاتون (اسٹاف) انتہائی دلکش اور چست لباس پہنے ہوئے تشریف فرما تھیں۔ دروازے کے باہر چوکیداری کے فرائض بھی ایک خاتون ہی ادا کر رہی تھی۔

بٹ صاحب نے کہا "یہاں مردوں کی بہت کمی لگتی ہے۔ جس طرف دیکھو عورتیں ہی عورتیں ہیں۔"

میز پر بیٹھی خاتون نے بتایا کہ ہال میں داخل ہونے کے لئے ہمیں تین ڈالر کا ٹکٹ لینا ہو گا۔ خان صاحب نے کہا "انہیں بتاؤ کہ ہم مہمان ہیں اسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔" پھر وہ ان سے مخاطب ہوئے "وی آر گیسٹ یو نو؟"

جواب میں پھر ایک دلنشین مسکراہٹ مگر پرنالہ وہیں کا وہیں یعنی ٹکٹ خریدنا لازمی ہے۔ بٹ صاحب نے مشورہ دیا کہ بلاوجہ نو ڈالر خرچ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ سب ایک ایک ڈالر چندہ اکٹھا کریں اور کوئی ایک اندر کا پھیرا لگا کر آ جائے مگر کوئی بھی باہر رہنے کو آمادہ نہ تھا۔ زہر کا گھونٹ بھرا نو ڈالر ادا کئے اور ہال کے اندر داخل ہو گئے۔ وہاں رنگ و روشنی کا ایک سیلاب آیا ہوا تھا۔ نیم عریاں لباسوں میں دمکتے ہوئے جسموں کا میلا لگا ہوا تھا۔ مغربی لباسوں میں جوڑے مصروف رقص تھے۔ دھن اتنی اچھی تھی کہ بٹ صاحب کے اور خان صاحب کے پیر بھی تھرکنے لگے۔ ایک جانب بار کاؤنٹر تھا۔ یوں سمجھئے پوری دعوت گناہ تھی۔ رنگا رنگ شراب کی بوتلیں' ساقی گری کرنے والی حسین لڑکیاں' جن کا لباس ترغیب انگیز تھا۔ مرد بھی جام چڑھا رہے تھے اور بعض عورتیں بھی۔ صورت شکل اور لباس کے پیش نظر مسلم غیر مسلم اور لبنانی و غیر لبنانی میں تمیز کرنا ممکن نہ تھا۔ عربی لباس میں بھی چند حضرات نظر آئے جن کے آس پاس پریوں کا جمگھٹا تھا۔ ایک صاحب ایک ہاتھ میں جام تھامے دوسرے ہاتھ میں ایک لڑکی کی کمر تھامے مصروف رقص تھے۔ شراب جام سے اور خاتون لباس سے چھلکی پڑ رہی تھیں۔ ایک ہاؤ ہو کا عالم تھا کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ ہر کوئی مدہوش تھا اور جوش و انبساط کے عالم میں ڈوبا ہوا تھا۔ یورپ کے نائٹ کلب بھی ہم نے دیکھے تھے' مگر یہاں خود فراموشی اور بے خودی کی جو کیفیت تھی۔ وہ انوکھی اور مختلف تھی۔ چند دن بیروت میں گزارنے کے بعد احساس ہوا کہ یہ ہنستا بستا' خوش حال اور خوش جمال شہر دراصل ایک مجسم عشرت گاہ تھا۔ عیش و

عشرت کے سوا کسی کو کوئی کام نہیں تھا۔ شہر میں دوسرے کاروبار بھی تھے، مگر "کاروبار عیش" سب پر حاوی تھا۔ باہر سے آنے والوں کی تعداد یا تو اس عالم بے خودی میں غوطہ زن ہونے کے لئے آیا کرتی تھی یا پھر ہماری طرح ان لوگوں کا نظارہ کرنے کے لئے وہاں پہنچتی تھی۔

یکایک موسیقی کی دھن تیز ہو گئی اور لوگوں کے جسموں کی حرکت میں بھی تیزی اور شدت پیدا ہو گئی۔ ایک طرف سے نیم عریاں لباس میں ایک حسینہ نمودار ہوئی اس کے ہاتھ میں ایک مائیکروفون تھا۔ اس نے آتے ہی عربی زبان میں نغمہ چھیڑ دیا۔ اس قدر میٹھی طرز اور اس سے بھی زیادہ شیریں آواز تھی کہ وجد کا عالم طاری ہو گیا۔ خدا جانے یہ خالص عربی گانا تھا یا اس میں مغربی انداز کی آمیزش بھی تھی۔ کیونکہ اس کا رنگ مغربی تھا۔ بہرحال جو بھی تھا، غضب تھا۔

مغنیہ نے گاتے ہوئے اپنے جسم کو لہرانا اور جھٹکنا شروع کر دیا اور حاضرین نے بھی اس کی تقلید کی۔ واقعہ یہ ہے کہ نغمے اور مغنیہ کی کشش نے حاضرین کو مدہوش بلکہ بے ہوش کر دیا تھا۔ نغمے کے دوران میں ہال کی روشنیاں ایک ایک کر کے گل ہو گئیں۔ ایک لمحے کے لئے تاریکی چھا گئی مگر آواز کی روشنی بدستور اجالا کرتی رہی۔ پھر مغنیہ کو روشنی کے ایک دائرے نے گھیر لیا۔ پہلے یہ محض ایک روشنی تھی اس کے بعد رنگ بدلنے لگی۔ کبھی سرخ، کبھی سبز، کبھی نیلی پیلی۔ عجیب سماں تھا جتنا لوچ اور لچک آواز میں تھی اس سے کہیں زیادہ مغنیہ کے جسم میں تھی۔ نہ جانے کتنی دیر تک وہ گاتی اور رقص کرتی رہی۔ آخر ہر اچھی چیز کی طرح اس کا ناچنا گانا بھی اختتام کو پہنچا اور پرشور تالیوں کی گونج میں وہ رخصت ہو گئی۔ ہال میں ایک بار پھر روشنیاں پھیل گئیں۔ ہم ابھی اس سے لطف اندوز ہو ہی رہے تھے کہ اچانک پہلو میں کوئی آ کھڑا ہوا۔ دیکھا تو ایک بار گرل تھی اس نے سیاہ بلاؤز اور سیاہ اسکرٹ زیب تن کر رکھا تھا مگر بلاؤز کی آستین اور گلا غائب تھا گلا تلاش کرنے کے لئے نگاہوں کو بہت لمبا سفر کرنا پڑتا تھا۔ البتہ ان کے گلے میں ایک سیاہ ربن ضرور موجود تھا جو غالباً" انہوں نے تن ڈھانپنے کے لئے گلے میں ڈال لیا تھا۔ لڑکی کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی۔ جس میں شراب سے بھرے ہوئے گلاس رکھے تھے۔ وہ بڑی دلنوازی سے مسکرائی اور بولی "آپ خالی ہاتھ ہی کھڑے ہیں۔ میں نے سوچا، کنواں خود ہی پیاسے کے پاس چلا جائے۔"

اس رنگین ماحول، رومانی منظر اور اس قدر حسین و بے باک ساقی کی موجودگی میں کوئی کافر ہی انکار کر سکتا ہے۔ اس اعتبار سے ہم تینوں کافر نکلے مگر انہیں کوئی جواب تو دینا تھا میں نے کہا "ہم نے ڈنر کر لیا ہے۔"

بولی "مگر پینے کے لئے تو ساری رات پڑی ہے، کیا خیال ہے؟"

ہم نے کہا "سوچ کر بتائیں گے۔" وہ بل کھاتی ہوئی رخصت ہو گئی۔ جدھر سے گزری پیاس کے مارے ہوئے لوگوں نے بے تابی کے ساتھ ہاتھ بڑھا بڑھا کر فرمائشیں شروع کر دیں۔

ہم نے کہا "دیکھو بھائی نہ تم ناچ رہے ہو نہ شراب پی رہے ہو، نہ شور مچا رہے ہو، اس لئے ان سب سے بالکل الگ تھلگ اور مختلف نظر آ رہے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بغیر شراب پیئے موجود رہنے کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ ہم رخصت طلب کریں۔"

"کس سے؟"

"ان سب سے جو زندگی کی رنگینیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔" یہ بات سب کی سمجھ میں آ گئی۔ یورپ کا سفر شروع کرنے کے بعد یہ تجربہ سب کو ہو چکا تھا کہ کلبوں میں شراب نوش کئے بغیر موجود رہنا ممکن نہیں ہے لوگ اسے اچھا نہیں سمجھتے۔ اس ماحول کو چھوڑ کر جانے کو جی تو نہیں چاہتا تھا۔ مگر ہم لوگ دلوں پر جبر کر کے باہر آ گئے۔

بٹ صاحب کو نیند آنے لگی اور ڈانسنگ ہال سے باہر نکلتے ہی انہوں نے جمائیاں لینی شروع کر دیں۔ "کیا خیال ہے سویا نہ جائے؟" انہوں نے خوابیدہ آواز میں کہا۔

"تم جا کر سو جاؤ۔ مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"اور مجھے بھی۔" خان صاحب نے فوراً میری تقلید کی۔

بٹ صاحب ایک دم چوکنے ہو گئے۔ "کیا مطلب! تم لوگوں کا کوئی خاص پروگرام ہے خفیہ؟"

"ارے نہیں بھئی تھوڑی دیر ٹہلیں گے پھر کمرے میں جا کر سو جائیں گے۔"

"وعدہ کرو کہ میرے بغیر ہوٹل سے باہر نہیں جاؤ گے؟"

"وعدہ۔"

وہ مطمئن ہو کر چلے گئے۔ خان صاحب ان کے جاتے ہی بولے "اچھا موقع ہے۔ آؤ باہر چلتے ہیں۔"

ہم نے کہا "شرم کرو، ابھی تم نے بٹ سے وعدہ کیا تھا۔"

"وعدہ ہی تو کیا تھا نا۔ کوئی قسم تو نہیں کھائی تھی۔"

مگر ہم نے اس تجویز کی مخالفت کی اور سوچا تھوڑی دیر ہوٹل میں ادھر ادھر گھوم کر جائزہ لیتے ہیں۔ لفٹ کے برابر ایک راہداری پر "سوئمنگ پول" لکھا اور دیکھا تو خان صاحب مچل گئے۔ چلو سوئمنگ پول پر چلتے ہیں۔"

"اتنی رات گئے؟ وہاں تو الو بول رہے ہوں گے۔"

"اسی لئے تو تمہیں لے جا رہا ہوں۔ تم وہاں باتیں کرنا۔ یار بات یہ ہے کہ حوض میں نہانا میری کمزوری ہے۔"

"تو منع کس نے کیا ہے؟ یہ کمزوری رفع کرنے کے لئے۔"

مگر میری ایک نفسیاتی پرابلم ہے۔ میں سب کے سامنے جانگیا پہن کر نہیں نہا سکتا' اب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ میں سب کے سامنے قمیص پتلون پہن کر حوض میں نہانا شروع کر دوں۔ آؤ نا اس وقت وہاں کوئی نہیں ہو گا اچھا موقع ہے۔"

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر لے چلے سوئمنگ پول کا راستہ خاصا آسان تھا یعنی راہداری میں داخل ہو کے پہلے دائیں مڑ جاؤ پھر کچھ دور چل کر مزید دائیں مڑ جاؤ۔ اس کے بعد بائیں جانب مڑ کر جب دائیں جانب مڑیں تو سوئمنگ پول آ جائے گا۔ بہرحال مختلف مقامات سے مڑتے ہوئے جب ہم سوئمنگ پول کے نزدیک پہنچے تو آنکھیں کھل گئیں۔ پول روشنیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ روشنی اتنی زیادہ تھی کہ اگر سوئی بھی گر جائے تو تلاش کی جا سکتی تھی۔ سوئمنگ پول دل کی شکل کا تھا۔ جس کے تین اطراف کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کچھ فاصلے پر گدے نما کوچیں تھیں دو تین خواتین سوئمنگ کے لباس میں الٹی سیدھی لیٹی ہوئی تھیں۔ ان سیمیں بدن خواتین کے جسم مرکری لائٹس میں دمک رہے تھے۔ ہم یہ دیکھ کر حیران تھے کہ دن کے وقت سورج کی روشنی میں دھوپ سینکتے ہوئے تو اکثر لوگوں کو دیکھا تھا مگر رات کے وقت اس طرح "غسل مرکری" کرنے والوں کو پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر چند کرسیوں پر چند حضرات جانگئے پہنے بیٹھے تھے۔ لگتا تھا ابھی حوض سے باہر نکل کر آئے ہیں۔ کرسیوں کے اوپر سائے کے لئے رنگ برنگی چھتریاں لگی ہوئی تھیں۔ جو غالباً" دھوپ میں کار آمد ثابت ہوتی ہوں گی۔ یہ لوگ ناؤ نوش میں مصروف تھے اور زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔ مگر جو بات ہمیں زیادہ عجیب لگی وہ یہ تھی کہ کچھ فاصلے پر کرسیوں پر دو بزرگ تشریف فرما تھے وہ عبائیں پہنے ہوئے تھے۔ سروں پر عربی انداز میں رومال بندھے ہوئے تھے۔ ان حضرات کو دیکھ کر ہمارے دم میں دم آگیا۔ ورنہ ہم سمجھ رہے تھے کہ اگر ہم لباس پہن کر سوئمنگ پول پر گئے تو شاید وہاں رکنے کی اجازت نہیں ملے گی۔ ہم محض قمیض اور پتلون میں ملبوس تھے جبکہ ان حضرات نے تو سر سے پیر تک لبادے پہن رکھے تھے۔ پھر بھلا ہمارے لباس پر کون اعتراض کر سکتا تھا؟ خان صاحب کی کوشش تھی کہ ہم روشنی سینکتی ہوئی خواتین کے قریب تر بیٹھ جائیں مگر ہم نے ازراہ تکلف عبا پوش بزرگوں کے پاس بیٹھنے کو ترجیح دی۔ ہم بھی ایک خوش رنگ چھتری کے سائے میں براجمان ہو گئے اور سیر دیکھنے لگے۔ سامنے والے کونے میں نیم دراز خواتین کے جسموں میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ دراصل ایک ویٹر ان کے لئے ٹرے میں مشروبات لے کر نمودار ہوا تھا۔ انہوں نے گلوب نما گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لئے۔ سوئمنگ پول کے کنارے یوں کھلم کھلا خواتین کی بادہ نوشی کا ہمیں پہلے کوئی تجربہ نہ تھا۔ جب غور سے دیکھا تو عبا پوش بزرگ بھی عجیب عالم میں نظر آئے۔ لباس تو ان کا فقیہانہ تھا۔ مگر حرکات بالکل رندانہ تھیں۔ ان کے سامنے سیفد رنگ کی گول میز پر مشروب کے گلاس اور ایک خوشنما بوتل رکھی ہوئی تھی۔ اور دونوں حضرات باری باری خوبصورت بوتل میں شراب انڈیل کر نوش جان فرما رہے تھے اور ان کے خیال میں یہ حرام نہیں تھی کیونکہ اس سے نشہ نہیں ہوتا دراصل حلال و حرام کے بارے میں اس قدر کنفیوژن پھیلا ہوا ہے کہ ہر کوئی اپنے مطلب کے مطابق فیصلہ کر لیتا ہے۔ یہ دونوں بزرگ بھی اپنی دانست میں آب جو پی رہے تھے جو شراب ہرگز نہیں تھی۔

دونوں نے اپنے ہاتھوں میں تسبیحیں تھام رکھی تھیں جنہیں وہ باقاعدگی اور تسلسل کے ساتھ گھما رہے تھے۔ یہ منظر ہمارے لئے بالکل انوکھا اور خلافِ توقع تھا۔ نہایت

فرشتہ نما بزرگوں کا سوئمنگ پول پر بیٹھنا ہی خاصا حیران کن تھا۔ اس پر شراب نوشی اور تسبیح کا کمبینیشن بھی کچھ کم نرالا نہ تھا یکایک سوئمنگ پول کے شفاف نیلے پانی میں ہلچل سی پیدا ہوئی اور یوں لگا جیسے آفتاب طلوع ہو گیا۔ ایک مرمریں بدن جل پری جو شائد زیر آب پیراکی میں مصروف تھی۔ اچانک سطح آب پر نمودار ہوئی اور پانی پر دونوں ہاتھ مارتے ہوئے ایسے چھینٹے اڑائے کہ ان دونوں بزرگوں کے کپڑے بھیگ گئے۔ مگر انہوں نے کسی ناراضی کا اظہار نہ کیا بلکہ مسکراتے ہوئے ہاتھ پھیلانے لگے۔ واقعی بعض لوگ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں کہ انہیں اس دنیا میں ہی جنت نصیب ہو جاتی ہے۔ دوسری دنیا میں ان پر کیا گذرے گی اس کی خبر خدا جانے؟

سوئمنگ پول سے برآمد ہونے والی جل پری جب پانی اچھالنے سے تھک گئی تو اس نے کنارے کا رخ کیا۔ اور ان دونوں حضرات کے پاس جا بیٹھی۔ اس کے سنہری بالوں سے سفید موتیوں جیسی بوندیں ٹپک رہی تھیں اور وہ بڑی روانی سے عربی بول رہی تھی۔ دوسری طرف سے بھی عربی دانی کا مظاہرہ ہونے لگا۔ کچھ دیر تو محسوس ہوا کہ جیسے بیت بازی قسم کی کوئی چیز جاری ہے۔ عربی زبان کی حلاوت اور شیرینی کے تو ہم پہلے ہی قائل تھے اب تو باقاعدہ اس پر ایمان لے آئے۔ ادھر کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تینوں حضرات نے اپنے اپنے جام میز پر رکھے اور دوبارہ سوئمنگ طول میں کود گئے اور ان کے جلو میں وہ تینوں خواتین بھی پانی میں غوطہ زن ہو گئیں۔ اور نیلے پانی میں سفید جسموں کی پیراکی کا پروگرام شروع ہو گیا۔ خان صاحب اس منظر میں ہمہ تن گوش کھوئے ہوئے تھے۔ ہمارا انہماک بھی کچھ کم نہ تھا لیکن عقب سے آنے والی ایک سریلی آواز نے ہمیں خوابوں کی دنیا سے کھینچ کر باہر نکال لیا ہمارے نزدیک ہی ایک ویٹریس اس طرح کھڑی تھی کہ اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی اور جسم پر پیراکی کا لباس۔ یہ خاتون ہم سے عربی زبان میں دریافت کر رہی تھی کہ ہم کس چیز سے شوق فرمائیں گے۔ ہماری خاموشی پر اس نے فرنچ اور پھر انگریزی میں یہی سوال دہرایا۔ خان صاحب نے فوراً کوکا کولا کی فرمائش کر دی جس کے جواب میں اس کے حسین چہرے پر ایک حقارت آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے کہا۔ "سافٹ ڈرنک اس وقت اور اس جگہ فراہم نہیں کئے جاتے۔"

گویا شراب پینا لازمی تھا۔ ہم نے خان صاحب سے کہا "بہتری اسی میں ہے کہ ہم یہاں سے رخصت ہو جائیں۔ کیونکہ ہم نہ تو غسل کر رہے ہیں اور نہ شراب نوشی تو پھر سوئمنگ پول میں ہماری موجودگی کا کیا جواز ہو سکتا ہے؟

ویٹریس سے ہم نے کہا کہ ہم پہلے ہی کافی شراب نوشی کر چکے ہیں اور ہمارا دوست تو بے ہوش ہونے کے قریب ہے اس لئے معذرت چاہتے ہیں۔ یہ کہہ کر ہم کرسی سے لڑکھڑاتے ہوئے اٹھے۔ خان صاحب کو بھی ہم نے یہی مشورہ دیا کہ وہ شرابی کی ایکٹنگ شروع کر دیں۔ انہیں یہ مشورہ اتنا پسند آیا کہ جب وہ اٹھے تو ایسے لڑکھڑائے کہ ویٹریس پر جا گرے وہ تو خیر ہوئی کہ وہ سوئمنگ پول سے دور تھے ورنہ ممکن ہے پانی میں غوطہ زن ہو جاتے۔ ہم نے انہیں سہارا دے کر ویٹریس کے بازوؤں سے آزاد کرایا اور ہم دونوں واپس چل پڑے۔

سوئمنگ پول آنکھوں سے اوجھل ہوا تو خان صاحب نے بڑبڑانا شروع کر دیا۔

"یار یہ تو بہت زیادتی ہے بدمعاشی کے بغیر ہم وہاں بیٹھ بھی نہیں سکتے۔"

ہم نے کہا "ظاہر ہے' بھائی وہ جگہ ہم ایسے شریفوں کے لئے نہیں ہے۔"

انہوں نے آہ بھری اور دانت پیس کر بولے "لعنت ہے ایسی شرافت پر۔" خدا جانے کس دل سے وہ اپنے کمرے میں جانے کے لئے تیار ہوئے۔ بہرحال ہم دونوں نے اپنے اپنے کمرے کا رخ کیا۔

لفٹ سے باہر نکلے تو مس شمامہ سے ملاقات ہو گئی۔ وہ معنی خیز انداز میں مسکرائیں اور بولیں "کیا نیند نہیں آ رہی؟"

ہم نے کہا "نئی جگہ ہے نا۔ نیند ذرا مشکل سے آئے گی۔"

کہنے لگی "بیروت میں بھلا نیند کا کیا کام اور پھر آپ جیسے تنہا شخص کو کیسے نیند آ سکتی ہے؟ آپ فرمائیں تو آپ کی تنہائی دور کرنے کی سبیل کی جائے؟"

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ ایک تو دعوت گناہ اور پھر ایسی خوش شکل لڑکی کی زبانی۔ ہم نے انجان بن کر کہا "وہ کیسے؟"

بولیں "آپریٹر کو فون کریں' وہ آپ کا فون کسی لکسورٹ ایجنسی سے ملا دے گا۔"

"وہ کس لئے؟"

"آپ کو جس قسم کے ساتھی کی ضرورت ہو گی' وہ آپ کو فراہم کر دے گی۔"

ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اس قسم کی ایجنسی کے وجود کا اس سے پہلے ہمیں کوئی علم نہیں تھا۔ جب اگلے دن ہم نے یہ واقعہ خان صاحب کو سنایا تو انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا "توبہ توبہ ہم جیسے شریفوں کا تو اس شہر میں رہنا ہی دشوار ہے۔"

ہم نے کہا "واقعی ہم بھی یہی سوچ رہے ہیں۔ تم کہو تو کل پہلی فلائٹ سے ہم واپس چلتے ہیں۔"

وہ کچھ بوکھلا گئے، کہنے لگے "بھئی اتنا روپیہ خرچ کر کے آئے ہیں تو دیکھے بغیر ہی کیسے چلے جائیں۔ دنیا کا ہر رنگ دیکھنا چاہئے۔" چنانچہ ہم دنیا کا ہر رنگ دیکھنے کے لئے ہوٹل سے نکلے اور بیروت کی فضاؤں میں سیر کرنے لگے۔

اس شہر کا جدید علاقہ یورپ کو شرماتا تھا۔ ساحل سمندر یورپ میں بھی دیکھے اور بیروت میں بھی۔ پتا نہیں آس پاس کے ماحول کا اثر تھا یا بیروت سے ویسے ہی مرعوب تھے۔ اس ساحل پر جو رنگینی دیکھی وہ کہیں اور نہیں دیکھی۔ تیرنے والے غسل کرنے والے تو ہر ساحل سمندر پر پائے جاتے ہیں۔ مگر بیروت کے ساحل پر کچھ لوگ زیادہ ہی مدہوش نظر آئے۔ عرب شیوخ کا نیا نیا دورہ شروع ہوا تھا اور بیروت ان کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ہر جگہ عربی لباس اور عرب رئیس نظر آتے تھے اور جس طرح کسی زمانے میں امریکی دولت مندوں کے بارے میں کہانیاں مشہور تھیں وہ اب عربوں کے بارے میں بیان کی جا رہی تھیں۔ تیل کی دولت نے تازہ تازہ جلوہ دکھایا تھا۔ اور ہر جگہ سینکڑوں ڈالر پانی کی طرح بہائے جا رہے تھے۔ عرب ممالک میں پابندیاں زیادہ تھیں اس لئے بیروت کی عشرت گاہیں ان رئیسوں کی جولانیوں کا مرکز بن گئی تھیں۔ ہوٹلوں میں، دکانوں میں، بازاروں میں، نائٹ کلبوں میں، ساحل سمندر پر جس طرف دیکھئے عربوں کی فتح مندی اور دولت مندی کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ اور نہ صرف بیروت کی حسینائیں بلکہ دنیا بھر سے طرحدار حسین و جمیل عورتیں بیروت کا رخ کر رہی تھیں اور دونوں ہاتھوں سے دولت کما رہی تھیں۔ بیروت اپنے پہاڑی پس منظر کے باعث اور کچھ اپنے فتنہ گر موسم کی وجہ سے جنت نگاہ بنا ہوا تھا۔ یورپ کے ملکوں میں بھی حسین ہوتے ہیں مگر وہ اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں جبکہ بیروت میں ان کا کام محض جلوہ نمائی اور جلوہ گری تھا۔ قسم قسم کے قدیم و جدید لباس اور ان گنت نمونوں کے میک اپ، کچھ تو لوگوں کی طبعی خوبصورتی اور کچھ ماحول کی رنگینی، دونوں نے مل کر عجیب سماں باندھ دیا تھا۔

بیروت بھی دوسرے ترقی پذیر ملکوں کی مانند امارت و غربت اور صفائی و گندگی کے

مجموعے کا نام تھا۔ مشرقی علاقہ جو عیسائیوں کی آماج گاہ ہے۔ بے حد شفاف، ماڈرن اور خوبصورت تھا۔ عالیشان اور پرشکوہ عمارتیں، کشادہ اور چمکتی ہوئی سڑکیں، شیشہ گری سے مزین اور روشنیوں سے جگمگاتی ہوئی دکانیں اور بازار۔ پھر ہر جگہ حسینوں کا ازدحام، اس قدر رونق اور چہل پہل تھی کہ جی چاہتا تھا کہ باقی زندگی اسی جنت نظیر میں گزار دیں۔ مغربی علاقہ مسلمانوں کی آبادی کا مرکز اور قدیم و جدید کا امتزاج تھا۔ تنگ گلیاں اور بازار اس شہر کے پرانے علاقوں یا ٹاؤن کو دیکھا تو اپنا ملک یاد آگیا۔ وہی گندگی اور بدنظمی اور اسی طرح کا شور وغل مگر اس علاقے میں آثار قدیمہ اور پرانا ماحول قابل دید تھا۔ پہلے عرض کیا ہے کہ اس شہر میں تعلیم یافتہ اور فیشن ایبل لوگ فرنچ بولنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس کے بعد عربی کا نمبر ہے انگریزی مقابلتاً" کم بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ دراصل یہ ملک عرصہ دراز تک فرانس کے زیر نگین رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نفاست اور نزاکت میں انوکھا ہے۔ بعد میں امریکی اثرات بڑھے تو انگریزی نے ہاتھ پاؤں نکالے۔ بیروت کی امریکن یونیورسٹی ساری دنیا میں مشہور تھی۔ ہم نے اس وقت تک امریکہ نہیں دیکھا تھا۔ مگر بعد میں پتا چلا کہ بیروت یونیورسٹی امریکی طرز کی یونیورسٹی تھی۔ جس کا شہرہ سارے مشرق وسطیٰ میں تھا جو لوگ یورپ اور امریکا میں اپنے بچوں کو تعلیم نہیں دینا چاہتے تھے وہ امریکن یونیورسٹی کی خدمات سے فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔ ابھی امریکی اثر و رسوخ یہاں نیا نیا کسی وائرس کی طرح پھیلنا شروع ہوا تھا۔

بیروت میں اس زمانے میں بھی فلسطینیوں کی کافی بڑی تعداد موجود تھی جن میں سے اکثر مسلح بھی نظر آتے تھے، اگر مسلمانوں کے خلاف مغرب کی ریشہ دوانیاں دیکھنی ہوں تو لبنان کو دیکھئے۔ اس ملک میں مسلمانوں کی اکثریت ہمیشہ سے ہے مگر اہل مغرب نے اس کے آئین کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔ سنی مسلمان، شیعہ مسلمان اور کرسچن۔ طے یہ پایا کہ صدر عیسائی ہوا کریگا، وزیراعظم سنی ہو گا اور سپیکر شیعہ مسلمان ہو گا۔ بعد میں اس انتظام کے خلاف بہت ہنگامے برپا ہوئے۔ اور پھر اسرائیل نے بھی پر پرزے نکالے اور لبنان، خصوصاً" بیروت اور اس کے گرد و نواح کو اپنی شکار گاہ بنا لیا فلسطینی کھلے عام اسرائیل سے نفرت کا اظہار کرتے پائے جاتے تھے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس وقت تک کرسچن آبادی کی اکثریت بھی مسلمانوں کے شانہ بشانہ تھی۔ آگے چل کر سیاست نے

جو گل کھلائے اور باہمی نفرت نے جس طرح جڑیں پھیلائیں وہ واقعات اب تاریخ کا حصہ ہیں۔

ہوٹل کے لئے فندق کا لفظ پہلی بار ہم نے یہیں سنا۔ پہلے تو ہم اسے خندق سمجھے۔ خان صاحب بولے بھائی یہاں کون سی جنگ ہو رہی ہے کہ شہر کے ہر حصے میں جہاں دیکھئے خندق، خندق لکھا ہوا ہے۔ اچھی بھلی خوبصورت عمارتوں کو خندق کیسے بنایا جا سکتا ہے؟ ایک کرسچن نے ہمیں بتایا کہ یہ لفظ فندق ہے جس کا مطلب ہے "ہوٹل۔"

بیروت کی آوارہ فضاؤں میں تو عرب اور مسلمان لڑکے لڑکیاں بھی پینگیں بڑھاتے نظر آئے مگر ایک مشکل یہ ہے کہ کرسچن بھی بظاہر مسلمان ہی نظر آتے ہیں یہاں تک کہ انکے نام بھی عربوں جیسے ہی ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے بھی لبنانیوں کے بارے میں کافی غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔

ایک ریسٹورنٹ میں ہماری ملاقات ایک خوش پوش نوجوان سے ہوئی جس کا نام طارق تھا، ہم بہت خوش ہوئے کہ چلو ایک مسلمان مل گیا، مگر جب ویٹریس اٹھلاتی ہوئی آرڈر لینے آئی تو طارق صاحب نے نہ صرف شراب طلب کی بلکہ ہیم (سور) کی فرمائش بھی کردی۔ ہم بہت حیران اور خان صاحب بہت ناراض ہوئے دیر تک بڑبڑاتے رہے کہ یہ کمبخت مسلمان ہو کر حرام کھاتا ہے اور وہ بھی سرعام۔ ان کا خیال تھا کہ یہ سب قرب قیامت کی دلیل ہے۔ بٹ صاحب اور خان صاحب بیروت کی آوارہ مزاجی سے کافی نالاں تھے مگر اس سے لطف اندوز بھی ہو رہے تھے۔ کہتے تھے کہ اس مرکز گناہ پر خدا کا عذاب نازل ہو گا۔ دیکھ لینا تم بھی، بعد میں ایسا ہی ہوا خدا جانے گناہوں کی سزا تھی یا خان صاحب کی بددعا، بیروت جہنم سے بدتر ہو گیا۔

ٹیکسیاں وہاں جدید بھی تھیں اور قدیم بھی لیکن ہم نے پیسے بچانے کے لئے ٹیکسیوں کا استعمال ترک کر دیا۔ پیدل ہی گھوما کرتے تھے۔

پیدل گھومنے سے شہر کو دیکھنا بھی آسان ہوتا ہے، ہر قدم پر ایک نیا تجربہ اور مشاہدہ دامن گیر ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بیروت اس زمانے میں عشرت پسندوں کے لئے جنت سے کم نہ تھا۔ ایک دو دن بعد ہم نے مزید بچت کرنے کی غرض سے ہوٹلوں میں کھانا بھی چھوڑ دیا۔ کباب وہاں بہت لذیذ ہوتے ہیں اور چھوٹی دکانوں اور ریسٹورانوں میں

سستے بھی مل جاتے ہیں۔ روٹی کے اندر شامی کباب اور سلاد بھر کر نہایت مزیدار کھانا تیار ہوتا ہے۔ اور قیمت بھی کم۔ اس شہر میں ایک سے ایک شاندار ہوٹل ہیں۔ سنگ مرمر' قالینوں اور بیش قیمت فانوسوں اور فرنیچر سے آراستہ' آسائشیں اور عیش و عشرت کے لوازمات ایسے کہ عقل حیران رہ جائے' مگر اسی شہر کے بعض گنجان علاقوں میں چھوٹے اور کم قیمت ہوٹلوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ بلکہ بیروت کے بعض علاقوں میں تو ہوٹلوں کی کثرت ہے۔ یہ ہوٹل سستے بھی ہیں اور گندے بھی' انتظامیہ بھی بے پروا اور غافل۔ نزدیک سے جا کر دیکھا تو بیروت کے لوگ بھی اندر سے ہماری طرح ہی نکلے اور یہ جان کر بہت خوشی اور اطمینان ہوا ورنہ ہم نے ماڈرن بیروت کا جو نقشہ دیکھا تھا اس کی بنا پر احساس کمتری کا شکار ہو گئے تھے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جو علاقے ترقی یافتہ تھے وہ درحقیقت ترقی یافتہ تھے۔ اور یورپ کی یاد دلاتے تھے۔

بٹ صاحب بیروت میں گم صم ہو گئے تھے۔ ہر منظر کو وہ بڑے غور سے دیکھتے' وہاں کا موسم' وہاں کی آب و ہوا' وہاں کے قدرتی مناظر' پہاڑ' سمندر' سڑکیں' عمارتیں' رہنے والے سبھی انہیں مسحور کئے دیتے تھے۔ پھر لوگوں کا اطمینان اور عیش و عشرت کی فراوانی۔ کبھی کبھی ہم تینوں ایک دوسرے سے علیحدہ بھی ہو جاتے اور پھر یکجا ہو جاتے تو اپنے تجربات و مشاہدات سے ایک دوسرے کو آگاہ کرتے۔

ایک بار گھومتے ہوئے فلسطینی کیمپ کے علاقے میں پہنچ گئے۔ دیکھا کہ لوگ ایسے حالات میں رہتے ہیں کہ انہیں زندگی کی بنیادی سہولتیں بھی حاصل نہیں ہیں۔ کیمپ میں بچوں اور عورتوں کے سوا کسی کو نہ پایا۔ خدا جانے مرد یہاں رہتے ہیں یا نہیں یا صبح سویرے اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ عورتیں اپنے مخصوص گھریلو کاموں میں لگی ہوئی تھیں لیکن خاص طور پر جو بات ہمیں متاثر کر گئی۔ وہ ان کے کیمپوں کے بچے تھے۔ غربت اور افلاس تو ان فلسطینیوں کا مقدر بن چکا تھا۔ مگر ہم نے یہ بات نوٹ کی کہ بچے نہ صرف صحت مند اور چاق و چوبند تھے بلکہ ان کا لباس بھی مناسب تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انکے چہروں پر کسی قسم کا حزن و ملال یا مایوسی نہیں تھی۔ ان بچوں میں اور دوسرے بچوں میں فرق یہ ہے کہ ان کی بہت بڑی تعداد سکول نہیں جاتی۔ یہ کیمپوں کے سامنے کھلے میدانوں' سڑکوں اور گلیوں میں کھیلتے رہتے ہیں اور ان کے کھیل عموماً" مردانہ قسم کے ہوتے ہیں۔ چند بچوں کو دیکھا تو وہ کھلونا نما بندوقوں اور پستولوں سے کھیل رہے تھے۔ ایک گروہ نے ٹیلوں اور مکانوں کی آڑ میں پناہ لے رکھی تھی۔ اور دوسرا گروہ سڑک کی دوسری جانب تھا۔ دونوں کے درمیان لڑائی اور جنگ کا کھیل جاری تھا۔ آس پاس چند خواتین اپنے کم سن بچوں کو لئے بیٹھی باتوں میں مصروف تھیں۔ قابل ذکر بات یہ تھی کہ بچے شور مطلق نہیں مچا رہے تھے۔ چند بچوں نے اپنے چہروں کو عربی رومالوں سے ڈھانپ رکھا تھا۔ گویا اصلیت کا رنگ پیدا کرنے کی پوری کوشش کی گئی تھی۔ بٹ صاحب کہنے لگے "ان بچوں نے اگر بچپن ہی سے جنگ وجدل سیکھ لیا اور لکھنے پڑھنے کی طرف دھیان نہیں دیا تو ان کا مستقبل کیا ہو گا۔ اس قدر پیارے اور خوبصورت بچے ہیں کہ دیکھ کر بے اختیار پیار کرنے کو دل چاہتا ہے۔"

ہم نے کہا "بھائی بٹ صاحب! اپنا مستقبل وہ ہم اور آپ سے زیادہ بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔ ان کی گذشتہ نسل نے بھی جنگ و جدل ہی دیکھا ہے۔ موجودہ نسل بھی اسی مار دھاڑ سے دوچار ہے اور آنے والی نسل کی قسمت میں بھی کچھ اور نظر نہیں آتا۔ اس قوم کو اپنے مستقبل اور اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے نہ جانے کتنے سال جنگ کرنی ہے۔ اس لئے یہ اپنی نسل کو مقابلہ آرائی کرنے کے لئے تیار کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اور یہ کر بھی کیا سکتے ہیں؟ زبانی جمع خرچ کے سوا دوسرے عربوں نے بھی انہیں کیا دیا ہے؟ جب ضرورت پڑتی ہے ان کو اپنا لیتے ہیں۔ اور جب مناسب سمجھتے ہیں نگاہیں پھیر لیتے ہیں بلکہ خود ان کے خلاف جنگ و جدل شروع کر دیتے ہیں۔

ایک دن پہلے ایک چھوٹے سے تندور نما ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے چند فلسطینیوں کے ساتھ ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے جب سنا کہ ہم پاکستانی ہیں تو قہوہ پیش کیا۔ شکر ہے کہ بیروت میں "لبنانی قہوہ" عام نہیں ہے ورنہ شائد ہمارا وہاں سے زندہ بچ کر آنا ممکن نہ ہوتا۔ یہ قہوہ پشاور کے قہوے کی مانند تھا۔ اور جب ہم نے اس میں چینی انڈیلی تو خوب میٹھا ہو گیا۔ قہوہ چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں پیا جا رہا تھا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ ہم نے کہا "اسرائیل والوں کو بیروت میں فلسطینیوں کا رہنا پسند نہیں ہے۔"

ایک نوجوان نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا "انہیں تو ہمارا کہیں بھی رہنا پسند نہیں ہے۔ ان کا بس چلے تو ہمیں اس دنیا میں ہی نہ رہنے دیں۔"

ہم نے کہا "اگر انہوں نے لبنان کی حکومت پر زور دیا' تو آپ لوگوں کو شائد یہ سرزمین چھوڑنی پڑے گی۔"

وہ بولا "دیکھو پاکستانی بھائی! ہمیں تو اپنی سرزمین کی تلاش ہے۔ اس کے لئے ہم نے جانوں کی بازی لگا رکھی ہے۔ فلسطینیوں کو کسی نے بھی ان کے حقوق نہیں دیئے ہیں ہم جانتے ہیں کہ اس کے حصول کے لئے طویل عرصہ جنگ کرنی پڑے گی۔ قربانیاں دینی ہوں گی' ہمارے عرب بھائی اگر واقعی دل سے چاہیں' اور ہمارا ساتھ دیں تو فلسطین کا مسئلہ حل ہونا ایسا مشکل بھی نہیں ہے' مگر سب کو اپنا اپنا مفاد عزیز ہے۔ ہمیں بھی اس بات کا احساس ہے' مگر ہم نے بھی فیصلہ کرلیا ہے کہ جب تک ایک بھی فلسطینی زندہ ہے ہم اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے۔"

ہم نے پوچھا "بیروت میں عیسائیوں کا آپ کے ساتھ کیسا رویہ ہے؟"

"عیسائی ہمارے حق میں اچھے بھی ہیں اور برے بھی۔ آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ ہماری تنظیموں میں عیسائیوں کی بہت بڑی تعداد بھی شامل ہے مگر عیسائیوں کی اکثریت ہمیں پسند نہیں کرتی بلکہ وہ تو بیروت اور لبنان میں ہمارا رہنا سہنا بھی گوارا نہیں کرتے۔"

"مگر کیوں؟

دوسرے نے اپنی بڑھتی ہوئی شیو پر ہاتھ پھیرا اور بولا

"برادر! اس لئے کہ جس جگہ فلسطینی رہتے ہیں' وہ جگہ ہمیشہ خطرے سے دوچار رہتی ہے۔ اب اگر اسرائیل نے ہمیں ختم کرنے کے لئے لبنان پر حملہ کر دیا تو اس کا نتیجہ تو سبھی بھگتیں گے۔ اسی بات سے ہر ملک کے لوگ ڈرتے ہیں۔"

"یہ بات ہے بھی درست۔" ہم نے کہا۔

وہ کہنے لگا "دیکھو' قیامت کیا ہوتی ہے؟ جس دن سب کچھ ختم ہو جائے گا' برباد ہو جائے گا۔ افراتفری اور نفسانفسی کا عالم ہو گا۔ وہ روز قیامت ہو گا' اس روز کسی انسان کو اپنے سوا کسی اور کا ہوش نہیں ہو گا۔ ہم فلسطینیوں کے لئے تو ایسی قیامت کئی بار آچکی ہے' جب گھر بار تباہ ہو جائیں' خونی رشتے مار دیئے جائیں' زندہ رہنا دشوار ہو جائے۔ ہر طرف دشمن اور موت ہی نظر آ رہی ہو۔ کہیں سر چھپانے کی جگہ نہ ملے۔ ہمارے لئے ایسی قیامت تو ہر روز آتی ہے' اگر ہم پر قیامت ٹوٹ رہی ہے۔ تو دوسرے لوگ اس سے کیوں محفوظ رہیں؟ ہم نے تو سر دھڑ کی بازی لگا دی ہے۔ ہماری بلا سے' کوئی اور رہے نہ رہے۔ جب ہم نہ رہے تو پھر دوسروں کی ہمیں کیا فکر؟"

فلسطینی کیمپوں میں بہت کم بچے ہیں' جو تعلیم حاصل کر رہے ہیں البتہ فوجی اور جنگی تعلیم سب کو دی جاتی ہے۔ دس بارہ برس کے عمر کے بچے خود کار ہتھیار تھامے مشق کرتے ہیں اور انہیں ہوش سنبھالتے ہی یہ تربیت دی جاتی ہے کہ مصیبت' دکھ اور موت کوئی چیز نہیں ہے۔ ان کا سامنا کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہئے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان فلسطینیوں پر زندگی کبھی مہربان نہیں رہی۔ انہوں نے صرف خاک و خون' بربادی اور موت کا سامنا کیا ہے۔ خدا جانے ان کی اور کتنی نسلیں ان مراحل سے گزریں گی۔ اس قدر صحت مند' خوش شکل' بلند ارادہ اور ذہین قوم زمانے کی بے رخی اور دورخی کے باعث کتنے مصائب و آلام سے دوچار ہے؟ بیروت میں ہمیں پہلی بار اس مسئلے کی سنگینی کا شدت سے احساس ہوا۔ بیروت میں فلسطینی ہر جگہ نظر آ جاتے تھے۔ اس لئے ان کا مسئلہ بھی ہر وقت یاد آتا رہا۔

ہمارے اخراجات بچت کے باوجود بھی کافی زیادہ تھے۔ ہوٹل اور دیگر ضروریات پر جو رقم خرچ ہو رہی تھی' اس نے ہماری مالی حالت تباہ کر دی تھی چنانچہ تین دن بعد ہی واپسی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ بعد میں ہمیں احساس ہوا کہ ہم کسی نسبتاً" سستے ہوٹل میں قیام کر سکتے تھے۔ ہوٹلوں کی تو اس شہر میں بھرمار تھی' مگر سستے ہوٹل صاف ستھرے نہیں ہوتے اور یہاں ماحول بھی خاصا گھٹا ہوا اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ہمارا ہوٹل زیادہ مہنگا تو نہیں تھا' مگر بہت معقول اور سلیقے کا تھا۔ قیام مختصر ہی سہی مگر دلچسپ اور دلکش ہونا چاہئے۔ سیر و تفریح کا مقصد یہ تو نہیں کہ انسان ہپیوں کی طرح ایک جوڑا پہن کر اور پھٹا پرانا بیگ گلے میں لٹکا کر گھر سے نکل کھڑا ہو۔ اور ملک ملک میں در در کی ٹھوکریں کھاتا پھرے اور حیوانوں کی طرح زندگی بسر کرے۔ سیر وسیاحت تو ذہن و دل کو سکون اور تازگی بخشنے والی چیز ہے۔ کم از کم اس بارے میں ہمارا یہی نظریہ ہے۔

بیروت کے ساحل دیکھے' سوئمنگ پول دیکھئے' ہوٹل اور بازار دیکھے' باہر باہر سے نائٹ کلب بھی دیکھ لئے تھے۔ ثمامہ نے ایک صبح کمرے کی صفائی کرتے ہوئے پوچھا "آپ نے بیروت کا لیڈو نائٹ کلب دیکھا ہے؟"

ہم نے فخریہ انداز میں کہا "ہم پیرس کا لیڈو دیکھ چکے ہیں بھئی تم لوگوں نے اس کا چربہ ہی تو بنایا ہو گا۔"

وہ بولی "بعض اوقات نقل اصل سے بڑھ جاتی ہے۔"

ہمارا دھیان اپنے ملک میں بنائی جانے والی چربہ فلموں کی طرف چلا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے بعض چربے اصل فلموں کے مقابلے میں کہیں زیادہ اچھے تھے۔

شامہ نے مسکراتے ہوئے کہا "یہ سچ ہے کہ ہم نے بیروت میں یورپ کی نقل کی ہے۔ بازار' دکانیں' ہوٹل' ساحل' نائٹ کلب مگر کیا آپ نے یہ نوٹ نہیں کیا کہ بہت سے معاملوں میں ہم یورپ سے بڑھ گئے ہیں۔" ہم نے اس کی جانب دیکھا تو وہ سیاہ چشم بڑی شوخی سے مسکرا رہی تھی۔ شائد یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ مثال کے طور پر مجھ ہی کو دیکھ لو۔ یورپ کے ہوٹلوں میں مجھ ایسی کوئی نظر پڑی تھی؟ ہم لاجواب ہو گئے۔

ناشتے پر (جو ہم اتنا زیادہ کرتے تھے کہ رات تک دوبارہ کھانے کی ضرورت نہ پڑے) ہم نے یہ نکتہ خان صاحب اور بٹ صاحب کے سامنے پیش کیا۔ فوری طور پر کسی نے اس تجویز کی مخالفت نہیں کی خان صاحب نے دبی زبان میں کہا "مگر وہاں تو ٹکٹ بہت زیادہ ہو گا۔"

بات ان کی معقول تھی۔ بہرحال یہ طے پایا کہ ہم لوگ نائٹ کلبوں کا کم از کم باہر سے تو نظارہ کرلیں۔"

نائٹ کلب واقعی بیروت کے قابل دید تھے (باہر سے تو یہی تاثر قائم ہوتا ہے) سنا ہے کہ انکے اندر جو کچھ ہوتا ہے وہ بھی دید کے قابل ہوتا ہے۔ پیسے ہمارے پاس ختم ہو رہے تھے۔ لیڈو میں جانے کے لئے کافی رقم کی ضرورت تھی۔ پہلے تو خان صاحب نے وہی تجویز پیش کر دی کہ تینوں چندہ کریں اور پرچی نکال لیں جس کے نام پر وہ پرچی نکلے وہ لیڈو میں تماشا دیکھے' مگر یہ مشورہ کسی کے دل کو نہ بھایا۔ ظاہر ہے پرچی تو صرف ایک ہی شخص کے نام نکلنی تھی۔ باقی دو یہ ظلم کیوں سہہ لیتے؟ پھر یہ طے ہوا کہ بیروت میں شاپنگ وغیرہ کرنے کا جو پروگرام ہے' اس پر نظر ثانی کی جائے۔ شاپنگ کا کیا ہے وہ تو ہر جگہ کی جا سکتی ہے مگر بیروت دیکھنے کا موقع تو بار بار ہاتھ نہیں آتا۔

خان صاحب نے ایک آہ بھری اور کہا "میری بیوی بہت ناراض ہو گی۔"

بٹ صاحب نے کہا "وہ تو یوں بھی تم سے ناراض رہتی ہو گی۔"

"کیا مطلب؟" وہ بگڑ کر بولے۔

"مطلب یہ کہ بیویاں تو عموماً ناراض ہی رہا کرتی ہیں۔" بٹ صاحب نے فوراً ہتھیار ڈال دیئے۔ طے یہ پایا کہ باقی دوسرے اخراجات کم کر کے "لیڈو" کا پروگرام ضرور دیکھا جائے۔ پیرس کا لیڈو مشہور نائٹ کلب ہے ہو سکتا ہے کہ دنیا میں اس سے اچھے نائٹ کلب بھی ہوں مگر اس جیسا کوئی دوسرا نہیں' مگر بیروت والوں نے اس جیسا بھی ایک نائٹ کلب بنا رکھا تھا اور سن رہے تھے کہ اس سے کہیں زیادہ اچھا تھا۔

بٹ صاحب نے کہا "ایک بات ماننی پڑے گی۔ یہ بیروت شہر ہے بہت انوکھا' یہ دوسرے سارے شہروں سے مختلف ہے۔"

خان صاحب نے ڈانٹا۔ "تم نے دنیا کے کتنے شہر دیکھے ہیں جو اتنے زور شور سے باتیں کر رہے ہو۔ زیادہ بڑھ بڑھ کر نہ بولو۔"

"دیکھے نہیں تو کیا ہوا۔ اندازہ تو ہے۔"

"اندازے اندازے ہی میں تم نے بیروت کو سب شہروں پر فوقیت دے دی۔ غلط اندازے مت لگایا کرو۔"

بٹ صاحب کھسیانے ہو کر چلے گئے تو خان صاحب مسکرائے اور کہنے لگے "ویسے بٹ نے بات ٹھیک ہی کہی ہے۔"

"تو پھر اسے ڈانٹ کیوں دیا؟"

"یہ ضروری ہے ورنہ وہ ہمیشہ اپنی رائے ہم پر ٹھونسا کرے گا۔"

نائٹ کلبوں کے علاقے میں حسب معمول روشنیوں' چہل پہل اور زندگی سے بھرپور نظاروں کا طوفان آیا ہوا تھا۔ نائٹ کلب کے اندر تو جو ہوتا ہے وہ ہوتا ہی ہے مگر باہر بھی کچھ کمی نہیں ہے۔ قسم قسم کے سیاح' جن میں خواتین کی تعداد زیادہ تھی' گلوں میں کیمرے لٹکائے گھومتے نظر آتے ہیں اور خواتین کا یہ عالم' اور ان کا لباس اس قدر آزاد اور بے باک کہ لگتا ہے نائٹ کلب کا پروگرام دیکھنے نہیں بلکہ اس میں حصہ لینے آئی ہیں۔ ہم یہ پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ یہاں مقامی و غیر مقامی کی تمیز بہت مشکل ہے اگر لباس مغربی نہ ہو تو انداز نہیں لگایا جا سکتا۔ یا پھر بعض چہرے نمایاں طور پر مشرقی نظر آتے

ہیں ورنہ اپنے پرائے کی تمیز بہت مشکل ہوتی ہے۔ کلب کے اندر پہنچے تو خوشبوؤں نے
گھیر لیا۔ خوبصورت چہرے مدھم روشنی کے باوجود دمک رہے تھے۔

پروگرام شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ پیرس کے لیڈو سے مختلف تھا۔ ان کے بعض
مخصوص آئیٹم ہوتے ہیں جو واقعی داد کے مستحق ہیں۔ یہاں کے لیڈو کے آئیٹم ان سے
مختلف تھے مگر رنگینی اور عریانی میں کسی طرح کم نہ تھے بلکہ کچھ زیادہ ہی ہوں گے۔ بیروت
میں رنگینیاں کچھ زیادہ ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ بہت غور کرنے کے بعد ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ
یورپ کے مقابلے میں بیروت والے رنگینی اور لطافت پیدا کرنے پر زیادہ زور دیتے ہیں
کیونکہ جو شخص بھی بیروت میں قدم رکھتا ہے وہ دراصل اس کی رنگینیوں' رعنائیوں اور
عشرتوں کا تذکرہ سن کر یہاں آتا ہے۔ یورپ کے شہر تو شہر ہیں۔ جبکہ بیروت ایک پلے
گراؤنڈ ہے جیسے جیسے اس کی شہرت پھیل رہی ہے اور عیش و عشرت کے دلدادہ امراء
خصوصاً" عرب روساء ادھر کا رخ کر رہے ہیں۔ اس حساب سے یہاں پر آسائشوں میں بھی
اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جس دن بیروت سے رخصت ہوئے تو ہم سب خواہ مخواہ بہت
جذباتی ہو رہے تھے۔ شائد ہم لوگ طبعی طور پر ایک جذباتی قوم ہیں۔ خان صاحب کو یہ
فکر تھی کہ "لڑکیوں" کو ٹپ دینے کے لئے پیسے کہاں سے آئیں گے؟ ہم نے کہا ان
ہوٹلوں میں ٹپ لازمی نہیں ہوتی۔ بل میں شامل ہوتی ہے۔"

بولے "مگر وہ لڑکیاں کیا سوچیں گی؟"

بٹ صاحب جل کر بولے "یار ہمیں کون سا روز روز یہاں آنا ہے اور اسی ہوٹل
میں ٹھہرنا ہے۔ چھوڑو' بلاوجہ پیسے ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے' بلکہ ہمارے پاس تو
پیسے ہی نہیں ہیں پھر ضائع کرنے کا کیا سوال ہے؟"

خان صاحب بہت شرمندہ تھے۔ اس لئے ٹہلتے ہوئے کچھ دیر پہلے ہی ہوٹل سے
باہر نکل گئے اور بل کی ادائیگی وغیرہ ہمارے سپرد کر گئے۔ ہوٹل میں سارے لوگ اپنے
کاموں میں مصروف تھے۔ کسی نے ہماری روانگی کا نوٹس تک نہیں لیا اور لیتے بھی کیوں
باہر نکل کر ٹیکسی میں سوار ہوئے تو خان صاحب پروگرام کے مطابق لپک کر آ گئے' پوچھنے
لگے "کیا ہوا؟ کسی نے میرا پوچھا تو نہیں؟ لڑکیاں کیا کہہ رہی تھیں؟"

بٹ صاحب نے کہا "تمہاری جان کو رو رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں کہ بڑے بے
وفا ہو' ٹپ دیئے بغیر چوروں کی طرح بھاگ رہے ہو۔ کم از کم ہفتے میں ایک بار خط ضرور
لکھا کرنا۔"

ٹیکسی والا ایک ہنس مکھ نوجوان تھا۔ خان صاحب نے اندر بیٹھتے ہی اس کا نام پوچھا
جو بہت گاڑھی عربی میں تھا۔ مجھ سے کہنے لگے "شکر ہے رخصت کے وقت ہمیں بیروت
میں ایک خالص مسلمان مل گیا۔"

ہم اس سے مخاطب ہو کر فخریہ انداز میں بولے "ہم پاکستانی ہیں۔"

اس نے گردن پھیر کر ہماری جانب دیکھا اور پھر سامنے دیکھنے لگا۔ ہم حیران تھے کہ
اس نے کسی خوشی یا تاثر کا اظہار کیوں نہیں کیا۔ ہم سے تو زیادہ خان صاحب حیران تھے
کہنے لگے "یار یہ تو شائد جاہل آدمی ہے۔ پاکستان کو بھی نہیں جانتا اس سے پوچھو تو۔"

ہم نے اس سے پوچھا "تم پاکستان کو جانتے ہو؟ کبھی نام سنا ہے؟"

اس نے کہا "بہت اچھی طرح' پاکستانی عربوں سے بھی زیادہ یہودیوں کے دشمن
ہیں۔"

ہم لوگ سناٹے میں رہ گئے۔ وہ بولا "یہ بتاؤ کہ یہودیوں اور اسرائیل نے تمہارا کیا
بگاڑا ہے جو تم لوگ ہر قدم پر ہماری مخالفت کرتے ہو۔"

ہم نے کہا "دیکھو' ہم یہودیوں کے خلاف نہیں ہیں ہم تو اسرائیل کے خلاف
ہیں۔ یہ ملک عربوں سے زبردستی علاقہ چھین کر بنایا گیا ہے جو ناانصافی ہے۔"

وہ بولا "یہ پہلے یہودیوں کا ملک تھا۔"

میں نے کہا "ہزاروں سال پہلے تو ہر ملک کا جغرافیہ کچھ اور تھا۔ کیا اس دلیل کے
پیش نظر تمام دنیا کا نقشہ بدلا جا سکتا ہے؟ جہاں ہم اس وقت موجود ہیں یہ ترکیہ کا حصہ تھا
تو پھر یہ ترکی کو مل جانا چاہئے؟"

وہ کوئی انتہائی ڈھیٹ شخص تھا۔ بڑی بے مروتی سے بولا "اگر ترکی میں طاقت ہے
تو وہ بھی اس پر قبضہ کر لے۔ تمہیں معلوم نہیں ہمیشہ طاقت ہی حق بجانب ہوتی ہے اور
یہی تمام فیصلے کرتی ہے۔"

ہم نے کہا "یہ تو جنگل کا قانون ہے۔"

کہنے لگا "یہ انسانوں کا جنگل ہی تو ہے اور ہم سب درندے ہیں بلکہ ان سے بھی

بد تر جیسے موقع ملتا ہے دوسرے کو چیر پھاڑ دیتا ہے۔"

یہ گفتگو کچھ کچھ خان صاحب کی سمجھ میں بھی آ رہی تھی۔ کہنے لگے "یہ تو بڑا غلط آدمی ہے کہیں ہمیں مروا ہی نہ دے۔ میں تو کہتا ہوں کہ ٹیکسی رکوا لو ہم کسی اور ٹیکسی میں بیٹھ جائیں گے۔"

ہم نے کہا "چپ رہو' یہ ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے؟"

بولے "یہ تو پوچھو کہ یہ ہے کون' مسلمان تو نہیں لگتا۔"

ہم نے اس سے پوچھا "معاف کرنا' آپ کہیں یہودی تو نہیں ہیں؟"

"جی نہیں۔ میں عرب ہوں۔"

"میرا مطلب ہے مذہبا"......

بات کاٹ کر کہنے لگا "میرا کوئی مذہب نہیں ہے میں فلسفے کا پروفیسر ہوں۔ خالی وقت میں ٹیکسی چلاتا ہوں۔"

ہم نے بے اختیار کہا "تو طالب علموں کو بھی یہی سبق پڑھاتے ہیں آپ؟"

"یہ میرے ذاتی خیالات ہیں۔" جواب ملا۔

ہم نے کہا "ویسے آپ کے والدین کا تو کوئی مذہب ہو گا یا وہ بھی آپ ہی کی طرح ہیں؟"

بولا "جی وہ تو مسلمان ہیں۔ بہت پرانے دقیانوسی خیالات کے لوگ ہیں۔ مجھے تو حیرت ہے کہ میرے والدین ہو کر ان کے ایسے خیالات کیوں کر ہو سکتے ہیں؟"

ہم نے کہا "یہی حیرت انہیں بھی ہوتی ہو گی۔"

"ہو سکتا ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

خان صاحب نے ہماری کہنی کو ٹھوکا دیا اور بولے "لعنت بھیجو' کیوں بلاوجہ دہریے سے بحث کرتے ہو۔ جاتے جاتے بیروت کو ایک بار اور محبت سے دیکھ لو۔"

مشورہ واقعی بہت مناسب تھا چنانچہ ہم نے ٹیکسی ڈرائیور پر لعنت بھیجی اور آس پاس کے مناظر سے لطف اندوز ہونے لگے۔ عجیب بات ہم نے یہ محسوس کی کہ دوسرے شہروں میں جا کر شروع میں تو بہت خوش ہوا کرتے تھے مگر بعد میں اکتا جاتے تھے۔ اور دل میں وہاں سے رخصت ہونے کی خواہش پیدا ہونے لگتی تھی مگر بیروت کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ ہمیں یہاں سے رخصت ہوتے وقت واقعی افسوس اور دکھ ہو رہا تھا حالانکہ ہمارا قیام بھی زیادہ طویل نہیں تھا اور کسی سے کوئی جذباتی یا رومانی وابستگی بھی نہیں ہوئی تھی۔

بیروت کا ایئرپورٹ حسب معمول جگمگا رہا تھا اور آس پاس کی پہاڑیوں پر غروب ہوتے ہوئے سورج کی شعاعیں عجیب طلسماتی منظر پیدا کر رہی تھیں۔ ایئرپورٹ کے اندر بھی چہل پہل اور گہما گہمی تھی۔ ڈیپارچر لاؤنج میں جا کر ہم نے بار کاؤنٹر کے پیچھے والی سیلز گرل کو تلاش کیا مگر وہ موجود نہ تھی۔ البتہ "بے ہودہ" کتابوں کی دکان والی خاتون ایک گہرے عنابی رنگ کے اسکرٹ اور سفید بغیر آستین والے بلاؤز میں دور ہی سے چمک رہی تھیں۔ کچھ دیر بے مقصد ادھر ادھر گھومتے رہے اور پھر فلائٹ کا اعلان ہوا تو پین ایم کے طیارے میں سوار ہو گئے جہاں بقول بٹ صاحب کے "سسٹرز" بہت اچھی تھیں اور بہت محبت اور پیار سے سارے کام کر دیا کرتی تھیں۔

کراچی پہنچ کر مایوسی اور محرومی کا بہت احساس ہوا۔ کہاں بیروت کا ایئرپورٹ اور کہاں کراچی کا انٹرنیشنل ایئرپورٹ' نہ ویسی عمارت نہ دلکشی' نہ صفائی نہ چمک دمک اور پھر متعلقہ حکام کا رویہ بھی بیزار کن' مگر اپنے وطن کی سرزمین پر قدم رکھ کر جو خوشی محسوس ہوئی وہ دنیا کے کسی بھی خطے میں کہاں؟

بیروت کافی عرصے ہمیں یاد آتا رہا۔ پھر بیروت کو غالباً" کسی کی نظر لگ گئی اور بیروت مستقلاً" خبروں میں رہنے لگا۔ اسرائیل نے بیروت میں فلسطینی مہاجرین کے ٹھکانوں پر بمباری شروع کر دی۔ پھر عیسائیوں سے جھڑپ ہو گئی۔ انہوں نے فلسطینی کیمپوں پر دھاوا بول دیا۔ اس کے بعد فلسطینیوں اور مقامی ملیشیا کے گروہوں میں جنگ چھڑ گئی۔ اس کے بعد عیسائیوں اور مسلمانوں میں ٹھن گئی۔ پھر خبر آئی کہ عیسائیوں کے مخالف گروہ ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں۔ کچھ عرصے بعد مسلمانوں کے مختلف گروہ آپس میں برسرپیکار ہو گئے۔ بیروت کی خبریں اور تصویریں اخباروں اور ٹی وی کے خبرناموں کی زینت بن گئیں۔ ہم سوچا کرتے تھے کہ ایسے خوبصورت شہر پر بیک وقت اتنے مصائب ٹوٹ پڑے ہیں۔ وہ ان سے کیسے جانبر ہو گا؟

چند سال گزر گئے اور ۱۹۸۷ء میں موسم سرما کے اوائل میں ایک کاروباری سلسلے میں باہر جانے کا اتفاق ہوا تو بیروت کی کشش نے ایک بار پھر ہمیں کھینچ لیا۔ اس دوران میں بارہا بیروت ایئرپورٹ بمباری کا نشانہ بنا اور کئی کئی دن تک بین الاقوامی پروازوں کے لئے بند رہا۔ بیروت ایک مستقل میدان جنگ بن چکا تھا۔ اس لئے جب ہم نے وہاں چوبیس گھنٹے رکنے کا ارادہ کیا تو سب نے ہمیں سمجھانا بجھانا شروع کر دیا کہ اس ارادے سے باز آ جائیں، مگر ہماری ضد دیکھ کر دعائیں دینے لگے امام ضامن باندھے گئے۔ منتیں مانگی گئیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے لام پر جا رہے ہیں۔ ہم یورپ جاتے ہوئے یا واپسی پر بیروت میں قیام کر سکتے تھے ہم نے بہتر یہی سمجھا کہ واپسی پر وہاں قیام کیا جائے۔ بشرطیکہ ان دنوں بیروت ایئرپورٹ بین الاقوامی پروازوں کے لئے کھلا ہو۔ یورپ میں ہم جتنے دن بھی رہے باقاعدگی سے بیروت کی خبریں پڑھتے اور سنتے رہے۔ جس طرح کوہ پیما اپنی مہم پر جانے سے پہلے موسمی پیش گوئیوں کا سہارا لیتے ہیں بالکل اسی طرح ہم بھی بیروت جانے سے پہلے وہاں کے سیاسی اور جنگی موسم سے باخبر رہنا چاہتے تھے۔

واپسی کی فلائٹ حسب معمول پر سکون تھی لیکن ہمیں رہ رہ کر خان صاحب اور بٹ صاحب یاد آ رہے تھے۔ ان کی رفاقت میں ہم نے جو سفر کیا تھا بعض اوقات وہ پریشان کن ضرور ہو جاتا تھا لیکن ان دونوں کی وجہ سے سفر میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ بات یہ ہے کہ انسان کسی حال میں خوش اور مطمئن نہیں رہتا۔ یہی حال ہمارا تھا۔ جب وہ ہمراہ تھے اس وقت بھی پریشان تھے اور اب جبکہ وہ ہمارے ساتھ نہیں تھے ہم اور زیادہ اداس ہو گئے تھے۔

بیروت کے ایئرپورٹ پر ہم دھڑکتے دل کے ساتھ ہوائی جہاز سے باہر نکلے۔ ہمارے خیال میں وہاں عمارت کی جگہ ملبے کا ڈھیر ہونا چاہئے تھا اور آس پاس کی پہاڑیوں پر توپیں

اور میزائیل مصروف عمل نظر آنا چاہئے تھے۔ مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔ بیروت کے ایئرپورٹ پر ہم نے بمباری یا بربادی کے کوئی آثار نہیں دیکھے۔ آس پاس کی پہاڑیاں بھی حسب سابق سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ ایئرپورٹ میں بظاہر کوئی فرق نظر نہیں آیا مگر وہ پہل سی چہل پہل اور چونچالی غائب تھی۔ ہمارے ساتھ تین چار مسافر بیروت میں، قیام کی غرض سے ہوائی جہاز سے برآمد ہوئے تھے۔ اور یہ سب کے سب مرد تھے رنگ و رنگت کی وہ بہاریں اس بار دیکھنے کو نہیں ملیں۔ ہم نے کتابوں کی دکان کی طرف دیکھا وہاں پہلے والی دلربا خاتون موجود نہ تھیں۔ ان کی جگہ ایک کافی عمر کی خاتون کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ کتابوں اور رسالوں کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ البتہ اس بار جنسی رسائل اور کتابوں کو پلاسٹک میں لپیٹ کر رکھا گیا تھا۔ ان کے نام اور عنوان تو نظر آ رہے تھے مگر یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی ان کی ورق گردانی کر سکے۔ خان صاحب جیسے شوقین حضرات کے لئے یہ ایک مایوس کن نظارہ تھا۔ بار کاؤنٹر پر تین بجلی لڑکیاں موجود تھیں مگر پہلی والی کوئی صورت جلوہ گر نہیں تھی۔ امیگریشن سے فارغ ہو کر باہر نکلے تو وہ اگلی سی رونق نہیں ملی۔ پتا نہیں یہ ہمارا وہم تھا یا حقیقت تھی۔ بس میں سوار ہونے کے بجائے ہم نے ایک ٹیکسی استعمال کرنے کا فیصلہ کیا دوسرے ہی لمحے ایک چمکتی ہوئی ٹیکسی اور اس سے زیادہ چمکتا ہوا ٹیکسی ڈرائیور ہمارے سامنے کھڑے تھے۔ ہم نے خان صاحب کی رسم کو تازہ کرنے کے لئے فوراً اس کا نام دریافت کر لیا: "الطاہر" اس نے خالص عربی لہجے میں بتایا۔

"نام سے تو مسلمان لگتے ہو۔"

"الحمدللہ۔" اس نے حلق کی گہرائی سے آواز نکالی۔

"بیروت کا کیا حال ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"وہ تو آپ خود ہی دیکھ لیں گے۔" پھر کہا "کیا آپ پہلے بھی بیروت آئے ہیں؟"

ہم نے کہا "اسی کی یاد تازہ کرنے دوبارہ آ گئے ہیں۔"

وہ کہنے لگا "جناب آپ جس شہر کو تلاش کرنے آئے ہیں، وہ آپ کو نہیں ملے گا۔ اس کی روح باقی نہیں رہی۔ ایک ٹوٹا پھوٹا زخمی جسم ضرور ہے مگر وہ بھی صحیح سلامت نہیں ہے۔ آپ جس بیروت کی بات کر رہے ہیں وہ مر چکا ہے۔ اب یہاں بھوت ناچ رہے ہیں۔ آگ برسا رہے ہیں، خاک اور خون کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ یہ شراب وباؤں

کی گرفت میں ہے۔"

ہم نے کہا "سنا تو ہم نے بھی یہی ہے، مگر اپنی آنکھوں سے دیکھنے آئے ہیں۔ دراصل ہم نے یہاں بہت اچھا وقت گزارا تھا"

اس نے سرد آہ بھری "اچھا وقت اب ناپید ہو گیا ہے۔"

ہم نے کہا "مگر یہ سب کون کر رہا ہے؟"

بولا "ہم لوگ خود ہی کر رہے ہیں۔ چاند ماری کا کھیل چل رہا ہے۔ سب ہی ایک دوسرے کو مار رہے ہیں۔ اور اپنے شہر کو برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ بہت مر گئے، بہت سے زخمی ہو گئے، بہت سے شہر چھوڑ کر چلے گئے جو مجبور ہیں وہ یہاں رہتے ہیں۔ معذوروں کی آبادی اب اس شہر میں بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا گھر ہو گا جہاں ماتم نہ ہو۔ ہزاروں گھر تو نیست و نابود ہو گئے ہیں۔"

ہم نے بڑے صبر و سکون سے بیروت کا یہ نوحہ سنا، مگر خاص بات یہ تھی کہ ٹیکسی ڈرائیور کا لہجہ اور آواز کسی بھی تاثر سے خالی تھا۔ وہ یوں بتا رہا تھا جیسے کسی اور کا قصہ سنا رہا ہے۔ خود اس پر یہ سب کچھ نہیں بیتا ہے۔ ہمیں بعد میں احساس ہوا کہ حالات اور واقعات نے بیروت کے لوگوں کو جذبات سے عاری کر دیا ہے۔ وہ اب ان چیزوں کو محض دیکھتے ہیں، محسوس نہیں کرتے۔

ٹیکسی ایک کمرشل علاقے سے گزری تو ہمیں جنگ کے نشانات بھی نظر آ گئے۔ مختلف مقامات پر اور سڑکوں، چوراہوں پر مورچے بنے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں فوجی بھی نظر آئے، مگر سڑکوں پر ٹریفک بھی جاری تھا اور لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ بعض جگہوں پر جہاں کبھی بہت بارونق شاپنگ سنٹر تھے اب خاک اڑ رہی تھی۔ سڑکوں پر کاروں کی تعداد پہلے سے کم نظر آئی مگر کاروبار زندگی جاری تھا ایک جلی ہوئی چار منزلہ عمارت کے سامنے سے گزرے تو الطاہر نے بتایا "وہ دیکھا آپ نے یہ کبھی بہت شاندار ہوٹل تھا۔ اب کھنڈر بن کر رہ گیا ہے۔" وہی نظارا تھا جو ہم نے وار کی فلموں میں دیکھا تھا۔

"مگر تم یہاں سے کیوں نہیں گئے؟" ہم نے سوال کیا۔

"کہاں جائیں؟ اور کہیں ٹھکانہ نہیں ہے۔ یہاں ہمارا گھر ہے، خاندان ہے، رشتے

دار ہیں، ہمارے آباؤ اجداد یہاں رہتے تھے۔ اب یہ سب چھوڑ کر کوئی نئی جگہ بسائیں؟ خدا جانے وہاں کتنی پریشانیاں ہماری منتظر ہوں۔ پھر یہی سوچا کہ یہیں رہ کر اچھے وقت کا انتظار کریں۔"

"تمہیں یقین ہے کہ اچھا وقت آئے گا؟" ہم نے پوچھا۔

"امید پر تو دنیا قائم ہے۔" وہ مسکرانے لگا۔

ہم نے اسے اپنے پرانے والے ہوٹل کا نام بتایا تھا۔ پتا تو ہمیں یاد نہیں تھا۔ مگر وہ جانتا تھا وہ مختلف علاقوں سے گزرتے ہوئے رننگ کمنٹری کرتا رہا۔ آہستہ آہستہ اس کی آواز اور لب و لہجے میں اداسی کی جھلک پیدا ہونے لگی تھی۔

ہوٹل "لاپریذیڈنسے" دور ہی سے ہمیں نظر آ گیا۔ شکر ہے کہ اس علاقے اور گرد و نواح میں بربادی کے آثار نظر نہیں آئے، ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر الوداع کہہ کر ہم ہوٹل کے اندر داخل ہو گئے۔ استقبالیہ پر حسب معمول تین چار یونیفارم میں ملبوس اسمارٹ سی لڑکیاں موجود تھیں۔ مگر یہ سب نئی تھیں۔ ہم نے وہی سنگل روم حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی جہاں ہم پہلی بار ٹھہرے تھے "گیارہ نمبر کمرہ خالی ہے؟"

لڑکی نے اداس مسکراہٹ سے کہا بہت سے کمرے خالی ہیں سر! آپ فکر نہ کریں۔ آپ کتنے عرصے قیام کریں گے؟"

ہم نے کہا "صرف ایک رات۔"

وہ مسکرائی "بیروت میں صرف ایک رات؟"

ہم نے کہا "بشرطیکہ صبح تک زندہ بچ جائیں"

وہ ہنس پڑی۔ خاصی دلکش ہنسی تھی، بولی "فکر نہ کریں، اس ہوٹل میں رہ کر مرنے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

پھر اس نے رپورٹر کو بلایا اور ایک لڑکی کو چابی دے کر ہمارے ساتھ کر دیا۔ وہ بھی نیلے اسکرٹ اور سفید بلاؤز میں خاصی اسمارٹ لگ رہی تھی۔ لفٹ میں سوار ہوئے تو ہم نے پوچھا "اس ہوٹل میں ایک لڑکی شامہ بھی تھی۔ کیا وہ اب بھی یہاں کام کرتی ہے؟"

وہ ایک لمحے خاموش رہی پھر کہنے لگی "اب وہ یہاں نہیں ہے۔"

"کہاں چلی گئی؟"

"آسمان پر' وہ مر گئی ہے۔"

ایک لمحے کے لئے میں ساکت رہ گیا۔ وہ شوخ و شنگ' نوجوان' حسین اور زندگی سے بھرپور لڑکی مر گئی مگر کیسے؟" میں نے پوچھا۔

اتنی دیر میں ہم ایک کمرے کے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ وہ کہنے لگی "ایک دن بازار میں بم پھٹا۔ وہ شاپنگ کے لئے گئی ہوئی تھی۔ اس کی لاش بھی نہیں ملی۔" اس نے دروازہ کھول کر کمرے کے اندر جانے کے لئے کہا۔ مگر میں کچھ دیر دروازے پر ساکت کھڑا رہ گیا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ شوخ و شنگ لڑکی جنگ کا ایندھن بن گئی ہے۔

"تمہاری اس سے دوستی تھی؟" اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"ارے نہیں' بس اسی ہوٹل میں ملی تھی۔ بہت افسوس ہوا۔"

وہ تلخی سے مسکرائی اور بولی "یہاں رہنے والوں کو اب کسی بات پر افسوس نہیں ہوتا۔ یہ بیروت ہے' یہاں کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" پھر وہ جاتے ہوئے پوچھنے لگی "آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟"

میں نے صرف انکار میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا' اور وہ چلی گئی۔

اداسی نے تنہائی کے احساس کو کچھ اور زیادہ کر دیا تھا۔ میں ایک صوفے پر گر گیا۔ سوچا شائد میں نے اس بار بیروت آ کر اچھا نہیں کیا۔

کھانے کے بعد سوئمنگ پول کا رخ کیا۔ وہاں بھی زیادہ رش نہیں تھا۔ ایک دو خواتین پیراکی میں مصروف تھیں۔ پول کے باہر دو تین درمیانی عمر کے لوگ جانگئے پہنے بیٹھے تھے' اور شائد بیئر پی رہے تھے۔ ایک ویٹریس کسی طرف سے نمودار ہوئی۔ "آپ کیا پینا پسند کریں گے؟"

ہم نے کہا "کوکا کولا۔"

اس نے حیران ہو کر دیکھا پھر بولی "بیٹھئے میں ابھی لے کر آتی ہوں۔ کیا برف بھی ساتھ لاؤں؟"

تھوڑی دیر ہم وہاں بیٹھے کوکا کولا پیتے رہے۔ سوئمنگ پول پر کوئی ہاؤ ہو نہیں تھی۔ قریب قریب خاموشی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں خواتین بھی حوض سے باہر نکل کر کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ ان کے جسموں اور بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

خاصی قبول صورت لڑکیاں تھیں۔ غیر ملکی تو نظر نہیں آتی تھی۔

دوسرے دن ہم نے بیروت کی سیر کرنے کی غرض سے پیٹ بھر کر ناشتا کیا اور ہوٹل سے نکل کھڑے ہوئے۔ ایک دو ٹیکسیوں والے رینگتی ہوئی کاروں سمیت ہماری طرف بڑھے مگر ہم پیدل چلنا چاہتے تھے۔ سڑک پر کاریں دوڑتی نظر آ رہی تھیں۔ لوگ بھی تھے' مگر غیر ملکیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ خانہ جنگی نے سب سے زیادہ نقصان بیروت میں سیاحت کے کاروبار کو پہنچایا تھا معلوم ہوا کہ عرب شیوخ نے تو ادھر کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ یورپ کا سفر کرتے ہیں یا پھر انڈیا اور مشرق وسطیٰ کی عشرت گاہوں کا رخ کرتے ہیں۔ بیروت میں ان کی دلچسپی ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ دوسرے غیر ملکی بھی محض کاروباری ضرورت کے تحت بیروت آتے ہیں۔ ایک حیرت انگیز بات یہ معلوم ہوئی کہ اس قدر جنگ و جدل اور تباہی کے باوجود کاروبار چل رہے ہیں' بلکہ بعض قسم کے کاروبار تو بہت زیادہ منافع دے رہے ہیں۔ پاکستان کے حبیب بنک سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب سے اس شام ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ ان کے بینک کا بزنس پہلے سے زیادہ ہو گیا ہے۔

بیروت کے بعض علاقوں میں تو پتا ہی نہیں چلتا کہ آس پاس کوئی جنگ ہو رہی ہے۔ خصوصاً" عیسائیوں کے مشرقی حصے میں کاروبار خوب زور و شور سے جاری تھا۔ البتہ مسلمان اس طرف جانے سے پرہیز کرتے تھے' مگر یہ بارونق اور خوبصورت علاقہ بھی چند سال بعد عیسائی ملیشیا کی باہمی کشمکش کی نذر ہو گیا اور خاصا جانی و مالی نقصان ہوا۔

ایک ٹیکسی حاصل کرنے کے بعد ہم نے بیروت کے فلسطینی کیمپ دیکھنے کی ٹھانی۔ ان میں سے بعض تو زمین بوس ہو چکے تھے۔ عیسائی ملیشیا اور پھر بعد میں شامی فوج کی مسلسل بمباری نے انہیں مٹی کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا تھا۔ معلوم ہوا کہ ان کے آس پاس کافی طویل عرصے سے لڑائیاں جاری ہیں' ان کا محاصرہ کیا گیا۔ کھانا پینا' بجلی' گیس سب کچھ بند کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ بالآخر فلسطینیوں نے بیروت کو خیرباد کہنے پر آمادگی ظاہر کر دی' اور نوجوان فلسطینی اپنے خاندانوں سے رخصت ہو کر بیروت چھوڑ گئے۔ کہتے ہیں ان کے رخصت ہونے کا منظر بھی بہت دلگداز تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہاں سے جانے والے پھر کبھی لوٹ کر بھی آئیں گے یا نہیں' وہ اپنے پیاروں سے پھر کبھی ملیں گے یا

نہیں۔ بیروت کے گرد و نواح میں فلسطینیوں کو ایک بار پھر ظلم و ستم سہنا پڑا اور وہ ایک بار پھر بے گھر اور بے وطن ہو گئے۔

بیروت کا گرین بیلٹ وہ علاقہ ہے جہاں عیسائی اور مسلم علاقوں کی سرحدیں ملتی ہیں۔ یہاں اکثر گولہ باری اور جنگ کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ بموں کی تباہ کاریوں تو دوسرے علاقوں میں بھی دیکھنے کو ملیں مگر بیروت کا ڈاؤن ٹاؤن کا علاقہ تو بالکل ہی برباد ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں اکثر تصادم اور فوجی مقابلے ہوتے رہتے ہیں۔ مختلف گروہوں سے تعلق رکھنے والے فوجی دستے آپس میں برسر پیکار رہتے ہیں اور ان کھنڈروں کو مرمت کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی جاتی حالانکہ دوسرے علاقوں میں جنگ ختم ہوتے ہی اصلاح و مرمت کا کام شروع کر دیا جاتا ہے۔ سڑکوں کی مرمت کر دی جاتی ہے' اور تھوڑے عرصے بعد ہی زندگی رواں دواں ہو جاتی ہے' مگر ڈاؤن ٹاؤن کا علاقہ ایک مستقل میدان جنگ اور بے آباد و ویران قبرستان بن چکا ہے۔

سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہوئی کہ اس قدر طویل خانہ جنگی اور جنگ و پیکار کے باوجود بیروت کے اکثر حصوں میں زندگی معمول کے مطابق رواں دواں تھی۔ جنگی مورچوں کے علاوہ خانہ جنگی کی کوئی اور علامت نظر نہیں آئی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ پانی اور گیس و بجلی کی فراہمی کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ بعض دنوں میں جب گھمسان کا رن پڑتا ہے تو بعض علاقوں میں کھانے پینے کی اشیا کی قلت ہو جاتی ہے وگرنہ ہر چیز دستیاب ہے۔ لطف یہ کہ بلیک مارکیٹ کی زیادہ شکایت بھی سننے میں نہیں آئی۔ اس سے بڑھ کر حیرانی ہمیں یہ جان کر ہوئی کہ مجموعی طور پر امن و امان کی صورت حال خاصی بہتر ہے۔ شہر میں عورتیں' بچے' اور مرد رات اور دن کے اکثر حصوں میں آزادی سے گھوم پھر سکتے ہیں۔ چوری' ڈکیتی بھی زیادہ نہیں ہوتیں۔ شائد اس لئے کہ اجتماعی طور پر قتل کا سلسلہ تو اکثر جاری رہتا ہے۔ بیروت میں دولت مند لوگ آج بھی موجود ہیں بہت سے لوگوں نے اپنا

مال و دولت باہر بھجوا دیا ہے۔ مگر کاروبار بیروت میں ہی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شہر میں بے روزگاری توقع سے کہیں کم ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بہت سے لوگ جان بچانے اور سکون سے زندگی گزارنے کی خاطر یہ شہر چھوڑ گئے ہیں۔ کراچی کے مقابلے میں بیروت کو زیادہ محفوظ، پرامن اور قانون پسند شہر کہا جا سکتا ہے۔ ایسے حالات میں کہ وہاں نہ کوئی حکومت موجود ہے۔ اور نہ ہی مستحکم انتظامیہ کا وجود ہے۔ وہاں نہ تو دن دیہاڑے ڈاکے پڑتے ہیں اور نہ تاوان کا مسئلہ ہے۔ کاریں چھین لینے کی شکایت بھی نہیں سنی۔ بیروت کو آپ ایک جنگ زدہ شہر کہہ سکتے ہیں۔ ایسے شہر بے قانون کا نام نہیں دے سکتے۔

بیروت کے نائٹ کلبوں کو واقعی نظر لگ گئی ہے۔ اکثر فنکار، ڈانسر اور موسیقار شہر چھوڑ گئے ہیں۔ سیاحوں اور بیرونی مہمانوں کا وہ زور نہیں ہے۔ جو منافع بخش ہو۔ اس وجہ سے نائٹ کلبوں اور ریسٹورانوں کے علاوہ ہوٹلوں کا دھندہ بھی خاصا مندا ہے۔ حسن جمال کی دکانیں لگانے والی خواتین بھی بہت کم ہو گئی ہیں۔ جب قدر دانوں ہی کی کمی ہو جائے تو انہیں وہاں رہ کر بھوکا مرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ساحلوں پر نہ وہ رش دیکھنے کو نہ وہ رونق اور بے فکری کا سماں۔ ہونے کو آج بھی سب کچھ ہوتا ہے۔ مگر وہ پہلے والی بات کہاں؟ ہمیں ڈاؤن ٹاؤن کا علاقہ دیکھنے کی تمنا تھی۔ ٹیکسی والے نے ہمیں اس سے خاصے فاصلے پر اتار دیا۔ اس ویران و تاراج علاقے میں کاروں اور ٹیکسیوں کی شکل نظر نہیں آئی۔ موٹر سائیکل اور اسکوٹر والے البتہ کبھی کبھار جان ہتھیلی پر رکھ کر چلے جاتے ہیں۔ ادھر سے تو پیدل راہ گیر بھی گزرنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ کون جانے کس وقت کس گروہ کے مابین "دنادن" شروع ہو جائے۔ ہم نے ایک جنگ زدہ گلی میں قدم رکھا اور سہمے ہوئے عالم میں قدم آگے بڑھائے۔ چند اور لوگ بھی ان گلیوں میں سے گزر رہے تھے۔ اچانک ایک ویران عمارت سے ایک خاکی پوش نوجوان ہاتھ میں خودکار گن تھامے ہوئے نکلا۔ ہماری تو روح فنا ہو گئی۔ اس نے آس پاس عقابی نظروں سے جائزہ لیا۔ ہمارے قدم تو جیسے زمین نے پکڑ لئے تھے۔ وہیں سہم کر کھڑے ہو گئے۔ اس نے چاروں طرف دیکھنے کے بعد جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک سگریٹ نکالی اور منہ میں دبالی پھر ایک لائیٹر نکال کر سگریٹ سلگائی اور دوبارہ عمارت کے اندر غائب ہو گیا۔ یہ علاقہ شہریوں کے لئے ویران ہو چکا ہے۔ مگر مختلف متحارب گروہوں کے لئے اس کی اہمیت کم نہیں ہوئی ہے۔ آج بھی ان عمارتوں اور کھنڈروں کے اندر مسلح لوگ رہتے ہیں اور اپنے اپنے علاقوں کی حدود کا تحفظ کرتے ہیں۔ کوئی دوسرا گروہ پیش قدمی کی کوشش کرے تو باقاعدہ مارا ماری اور جنگ شروع ہو جاتی ہے، مگر یہ لوگ محض ایک دوسرے کو ہی نشانہ بناتے ہیں۔ ہاں اگر کوئی بے گناہ اور معصوم شہری کراس فائر کی زد میں آ جائے تو یہ ان کی ذمہ داری نہیں ہے۔ ایک اور خاص بات یہ ہے، کہ یہ لوگ لوٹ مار بالکل نہیں کرتے۔ بس اپنی لڑائیوں سے کام رکھتے ہیں۔ لبنان کی فوج نسبتاً" بہت مختصر ہے اور مختلف فوجی گروہ کے مقابلے میں کمزور بھی ہے، اور براہ راست تصادم کی صورت حال پیدا نہ ہو تو آپس میں لڑنے والے جنگجو اس فوج اور لبنانی پولیس سے بھی کوئی تعرض نہیں کرتے۔ انہوں نے باہمی صلاح و مشورے اور اتفاق سے ایک انوکھا ضابطہ اور نظام بنا رکھا ہے جس پر یہ سختی سے کاربند رہتے ہیں۔

بیروت کی دکانوں اور تنگ گلیوں والے بازاروں میں آج بھی رونق ہے۔ بازاروں اور قہوہ خانوں کی چہل پہل اگر پہلے جیسی کہیں نظر آئی تو وہ یہی علاقہ ہے۔ اقتصادی اور صنعتی تباہی کے ساتھ ساتھ سیاحت کی صنعت کی تباہی نے یہاں ایک اور صورت بھی پیدا کردی ہے۔ حسین و جمیل لڑکیاں کھلے عام دعوتِ جمال دیتی ہیں اور نسبتاً" سستے داموں میسر ہو جاتی ہیں۔ ان میں قوم اور مذہب کی کوئی تمیز نہیں ہے۔

جب ایک ٹیکسی والے نے اشارتاً" ہمیں ایک حسین ساتھی کے ساتھ وقت گزارنے کی پیشکش کی تو کانوں پر یقین نہ آیا۔ یہ خصوصیت بینکاک کے ساتھ مخصوص ہے، مگر اب شاید حالات کے مارے لوگوں نے بیروت میں بھی یہ رواج قائم کرنے کی ٹھانی ہے۔

بیروت کی سڑکوں پر گھومتے ہوئے لوگوں کو بھی دیکھا اور ان کے حالات کو بھی۔ بیروت کا ایک حصہ ڈاؤن ٹاؤن تو بالکل ملیا میٹ ہو چکا ہے۔ ان مسمار شدہ، جلے ہوئے کھنڈروں پر قبضہ برقرار رکھنے کے لئے گھمسان کی لڑائیاں لڑتے ہیں۔ یہ لڑائیاں محض بندوق، پستول اور خودکار ہتھیاروں تک محدود نہیں رہتیں۔ میزائل اور طیارہ شکن توپیں بھی استعمال کی جاتی ہیں جس کی وجہ سے جانی و مالی نقصان ہوتا ہے۔ ڈاؤن ٹاؤن کے علاوہ گرین بیلٹ کے سرحدی علاقے میں بھی آئے دن مارا ماری ہوتی رہتی ہے۔ یوں لگتا

ہے کہ جیسے بیروت کے لوگوں نے باہمی رضا مندی سے جنگ کے لئے بعض علاقے مخصوص کر لئے ہیں۔ جہاں پر لڑنے والے لڑتے رہتے ہیں، مگر دوسرے علاقوں پر کاروبار زندگی معمول کے مطابق جاری رہتا ہے، اگر ان علاقوں کے رہنے والوں کو باہر جنگ و جدل کی خبر ملتی بھی ہے، تو وہ ایسا تاثر دیتے ہیں جیسے یہ سب کچھ کسی اور شہر میں ہو رہا ہے۔ شائد مصائب و آلام نے انہیں پتھر بنا دیا ہے۔ یا وہ اس کے عادی ہو چکے ہیں۔ لڑائی اور انسانوں کے مرنے کی خبر سن کر وہ محض کاندھے اچکا کر رہ جاتے ہیں۔

مگر دو باتوں نے خاص طور پر متاثر کیا۔ ایک تو یہ کہ عام لوگوں کو غربت اور عصبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں غریب او نادار لوگ جس قسم کے پھٹے پرانے کپڑے پہنتے ہیں، اس خرابی کے باوجود میں نے بیروت میں ایسے مفلوک الحال نہیں دیکھے اور تو اور فلسطینی عورتیں اور بچے بھی چیتھڑوں میں نظر نہیں آئے۔ خدا جانے یہاں کے غریبوں کا ذریعہ آمدنی کیا ہے؟ دوسری بات جو قابل ذکر تھی وہ یہاں کا امن و امان تھا۔ کراچی چند سال سے ایسا شہر بن کر رہ گیا ہے جہاں رات کے وقت گھر سے نکلتے ہوئے ہزار بار سوچنا پڑتا ہے اور عورتوں کے لئے تو رات کو گھر سے نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن بیروت کے رہنے والے مسلسل خانہ جنگی اور بربادیوں کے باوجود ایسے معاملے میں کراچی والوں سے زیادہ خوش قسمت ہیں۔ انہیں گھر سے باہر گھومتے ہوئے، کسی قسم کا خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ چوری چکاری کا بھی وہ عالم نہیں ہے جو ہمارے ہاں ہو گیا ہے۔ مسلح ڈاکوؤں کی خبریں بھی ہم نے نہیں سنیں نہ اخبار میں پڑھیں۔ جنگ زدہ شہروں میں سب سے زیادہ ستم زدہ عورتیں ہوتی ہیں لیکن بیروت میں عورتوں کے اغوا اور آبروریزی کے واقعات نہ ہونے کے برابر سنے اور پڑھے۔

ہم نے ایک دکان سے کچھ ٹائیاں وغیرہ خریدیں۔ سیلز گرل ایک اچھی شکل و صورت کی لڑکی تھی۔ قیمتوں کی حد تک بیروت ایک نارمل شہر لگتا ہے۔ مسلسل ایمرجنسی کے حالات سے دوچار رہنے اور جنگ کا نشانہ بنے رہنے کے باوجود دکانداروں کی وہ لوٹ کھسوٹ نہیں ہے۔ جو ہمارے ہاں دیکھنے میں آتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمیں اور ہمارے ملک کے رہنے والوں کو آخر کیا ہو گیا ہے۔ اور حکومتیں اپنی ذمہ داریوں سے یکسر آزاد کیوں ہو گئی ہیں؟"

سیلز گرل نے ٹائیوں کا ڈھیر ہمارے سامنے لگا دیا۔ ہم نے چند ٹائیاں پسند کیں۔ قیمت دیکھ کر ہم نے کہا "مس! یہ تو بہت مہنگی ہیں۔ آخر اتنی مہنگائی کی وجہ کیا ہے؟"

وہ مسکرائی اور کہنے لگی "آپ ہمارے مہمان ہیں، مگر میں آپ کی اس رائے سے اتفاق نہیں کر سکتی۔ اتنی مناسب قیمت آپ کو کہیں اور نہیں ملے گی۔" اور واقعی وہ درست ہی کہہ رہی تھی۔

رخصت ہونے سے پہلے ہم نے اس کا نام پوچھا "عمارہ۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

خان صاحب کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ہم نے پوچھا "مسلمان ہو؟"

"نہیں کرسچن ہوں۔"

"تم بیروت سے نہیں گئیں؟"

کہنے لگی "جسے بیروت سے پیار ہے وہ یہ شہر چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ یہیں مرجانے کو ترجیح دے گا۔"

"تمہارے شہر میں تو ہر ایک کسی نہ کسی سے لڑ رہا ہے تم اسکے لئے کس کو الزام دیتی ہو؟"

"قسمت کو۔ یہ سب پاگل ہو گئے ہیں موسیو! ایک دوسرے کو مارنے کے سوا انہیں اور کام نہیں ہے۔ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے گھر کو برباد کر رہے ہیں۔"

"لیڈر انہیں کیوں نہیں روکتے ہیں؟"

وہ ہنس پڑی "لیڈر ہی تو انہیں لڑا رہے ہیں، اگر ہمارے لیڈروں میں اتحاد و اتفاق ہوتا تو ہماری یہ حالت کیوں ہوتی اور پھر اب تو یہ بات بہت آگے نکل گئی ہے۔ حالات ہمارے لیڈروں کے ہاتھ سے بھی نکل گئے ہیں۔ ہم تو بس بے بسی سے تماشہ دیکھ رہے ہیں۔"

چلتے چلتے ہم نے کہا "بیروت پہلے جیسا بارونق نہیں رہا، اس شہر کی خوبصورتی کہاں چلی گئی؟"

بولی "سب کچھ وہی ہے۔ خوبصورتی کو دیکھنے کے لئے خوبصورت آنکھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ میری طرف دیکھ کر بتایئے، کیا واقعی بیروت میں حسن واقعی نہیں رہا؟"

وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔ جس شہر میں ایسی حسین و جمیل سیلز گرل ہو اُ
خوبصورتی سے محروم کیسے سمجھا جا سکتا ہے؟"

سڑک پر ایک جگہ فوجی گاڑیاں گزرتے دیکھیں تو ہم سمجھے شائد کہیں جنگ چھڑ گ
ہے، مگر ہمیں بتایا گیا کہ وہ شامی فوج کے دستے ہیں۔ بیروت میں شامی فوج کا کردار بھ
عجیب و غریب ہے۔ متحارب و مخالف گروہ آپس میں لڑ لڑ کر ہلکان ہو جاتے ہیں مگر شا
فوج بالکل بے تعلق رہتی ہے۔ جب کسی طرح مار دھاڑ کا سلسلہ ختم ہی نہ ہو تو شامی فو
علاقہ جنگ میں داخل ہو جاتی ہے اور وہاں امن و امان ہو جاتا ہے۔

ہوٹل پہنچ کر ہم نے کافی پی۔ چائے یہاں نہ پینا ہی بہتر ہے۔ یورپ اور مشر
وسطیٰ کے لوگوں کو چائے کا ذوق و شوق نہیں ہے' نہ ہی انہیں چائے بنانی آتی ہے۔ اس
لئے کافی اور قہوہ پر گزارا کرنا زیادہ بہتر ہے۔ ویٹریس خاصی ہنس مکھ اور صحت مند لبنان
لڑکی تھی۔ نام اس کا راحیلہ تھا اور اس نے بتایا کہ وہ فلسطینی ہے۔ ہم نے پوچھا "تم
بیروت سے کیوں نہیں گئیں؟"

کہنے لگی "صرف فلسطینی مردوں کو یہاں سے نکالا گیا ہے۔ عورتوں کے یہاں رہنے
پر کوئی پابندی نہیں ہے۔"

"تمہارے گھر میں صرف عورتیں ہی باقی رہ گئی ہیں؟"

کہنے لگی "نہیں' بچے بھی ہیں' میرے تین چھوٹے بھائی ہیں۔"

"وہ کیا کرتے ہیں؟ پڑھتے ہیں؟"

"پڑھتے وڑھتے تو کم ہیں۔ نشانہ بازی اور فوجی ڈرل کرتے رہتے ہیں۔ انہیں بڑا ہو
کر مرد بنتے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ آخر یہ کتنے فلسطینیوں کو ماریں گے؟"

راحیلہ سے گفتگو کی تو معلوم ہوا کہ پولیٹیکل سائنس کی طالبہ رہ چکی ہے۔ مگر تعلی
پوری نہ کر سکی۔ ماں اور چھوٹے بھائیوں کی پرورش کا مسئلہ درپیش تھا۔ میں اس کے
پرعزم چہرے اور گہری براؤن آنکھوں کو دیکھتا رہا جس میں ایک خاص قسم کی چمک تھی۔
میں نے پوچھا "راحیلہ! تم اس شہر میں اکیلی رہتی ہو؟ تمہاری حفاظت کے لئے کوئی مرد بھ
نہیں ہے۔ تمہیں کبھی اپنی جان اور عزت کھو جانے کے خیال سے ڈر نہیں لگتا؟"

وہ بے ساختہ ہنسنے لگی اور بولی "یہاں ایسا کوئی ڈر نہیں ہے اور پھر میں کراٹے بھی
جانتی ہوں۔ دو چار آدمی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

"اگر وہ لوگ بھی کراٹے جانتے ہوں تو پھر؟"

بولی "ایسا کبھی ہوا تو نہیں' مگر میں ہر قسم کے حالات کے لئے تیار رہتی ہوں۔" یہ
کہ کر اس نے اپنے اسکرٹ کو اوپر کھسکایا اور تسمے کے ساتھ بندھا ہوا ایک چھوٹا سا
پستول نکال لیا "یہ دیکھا آپ نے؟"

"مجھے تو یہ کھلونا معلوم ہوتا ہے۔"

"مگر ہے بہت خطرناک' کھلونا ہے مگر بالکل اصلی۔"

"تمہارے پاس اس کا لائسنس ہے؟ میں نے پریشان ہو کر سوال کیا۔

کہنے لگی "ہم فلسطینی ہیں' ہم ہتھیاروں کے لائسنس نہیں رکھتے۔ یہ بات سبھی
جانتے ہیں۔"

میں نے کہا "راحیلہ! یہ کیا بات ہے کہ ایسی بہادر اور سرفروش قوم آج تک اپنے
مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی؟"

اس کی آنکھوں میں دکھ کی پرچھائیاں لرزنے لگیں۔ کہنے لگی "آپ نے دیکھا
نہیں ساری دنیا کی طاقتیں ہمارے خلاف ہیں۔ امریکہ' یورپ' روس' اسرائیل اور دنیا
بھر کے ممالک بھی ہمارے حق میں نہیں ہیں۔ وہ ہمیں فٹ بال سمجھ کر کھیلتے رہتے ہیں۔
جب ضرورت سمجھتے ہیں ٹھوکر مار کر دوسرے میدان میں پھینک دیتے ہیں' اگر کوئی اور
قوم ہوتی تو نہ جانے کب کی ہمت ہار چکی ہوتی' مگر فلسطینیوں کو خدا نے بہت ڈھیٹ اور
سخت جان بنایا ہے۔ اچھا میں چلتی ہوں' ڈیوٹی کا وقت ہے۔ خدا حافظ۔"

وہ اپنا چھوٹا سا پستول تسمے میں رکھ کر تیز تیز قدموں سے رخصت ہو گئی۔ میں اسے
جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ فلسطینیوں اور بیروت کے باشندوں کا جذبہ اور
زندہ رہنے کا عزم کوئی بھی ختم نہیں کر سکا۔ یہ دونوں ہی برے سے برے اور انتہائی
ناساعد حالات میں بھی جانبر ہونے کا گر جانتے ہیں۔

آج بیروت پہلے کے مقابلے میں ایک اداس' سوگوار اور بے رونق شہر تھا۔ کسی بیوہ
کی مانند جس کے سہاگن ہونے کی اب کوئی توقع نہیں ہے۔ اس شہر کو بقول خان صاحب
اس کے گناہوں کی سزا ملی ہے یا کسی فقیر کی بددعا نے یہ دن دکھائے ہیں؟ یہ فیصلہ کون
کرے گا؟

کہتے ہیں کہ روم کا شہر سات پہاڑیوں پر آباد ہے۔ خاں صاحب نے
ایئرپورٹ سے ٹیکسی میں سوار ہوتے ہی آس پاس پہاڑیاں تلاش کرنی شروع کر دیں۔
جب کوئی پہاڑی نظر نہیں آئی تو ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھنے لگے "معاف کرنا' میرا مطلب
ہے ایکسکیوزمی سر"

بٹ صاحب نے فوراً ان کو ٹھوکا دیا اور آہستہ سے کہا "یار وہ ڈرائیور ہے۔ تم
اسے سر کہہ رہے ہو۔"

بولے "انسان کو تمیز سے بات کرنی چاہئے۔ ان لوگوں پر ہمارے اخلاق کا رعب
جائے گا۔"

بٹ صاحب نے فوراً حملہ کیا "یہ کیوں نہیں کہتے کہ گوروں کو صاحب اور سر کہنے
کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ اپنے ملک میں تو آپ نے کبھی کسی تانگے والے یا رکشا والے کو
سر نہیں کہا" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "یہ غلامی بہت بری بیماری ہے۔ انسان
کو ذلیل کر کے رکھ دیتی ہے۔"

خاں صاحب کو ان کی یہ بات پسند نہیں آئی۔ پھر یہ سوچ کر کہ پردیس میں بات
بڑھانے سے کوئی فائدہ نہ ہو گا مجھ سے کہنے لگے "بھائی جان' آپ ذرا اس سے پوچھیں
روم کی پہاڑیاں کدھر ہیں؟"

"تم خود کیوں نہیں پوچھ لیتے۔ ان کی انگریزی تم سے بھی زیادہ خراب ہوگی۔
انگریز نہیں اطالوی ہیں۔"

انہیں ذرا حوصلہ ہوا تو پھر ٹیکسی ڈرائیور کی طرف متوجہ ہوئے جو کار کے ریڈیو
کوئی اطالوی نغمہ سن رہا تھا اور جھوم جھوم کر سرہلا رہا تھا۔ اسٹیرنگ پر وہ اپنی انگلیوں
طبلہ بھی بجاتا جا رہا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور خاصا صحت مند' گورا چٹا اور خوش شکل آدمی تھا

نیلے سوٹ میں بہت جامہ زیب اور باوقار لگ رہا تھا۔ اس کی شخصیت ایسی تھی کہ جب
ایئرپورٹ پر خاں صاحب نے اسے دیکھا تو سمجھے کہ کوئی مسافر ہے مگر پھر ڈیش بورڈ پر رکھی
ہوئی ڈرائیور والی ٹوپی دیکھی تو انہیں یقین آیا کہ وہ ٹیکسی ڈرائیور ہے۔ بہت ڈرتے
ڈرتے وہ ٹیکسی کی طرف بڑھے اور بڑی لجاجت سے پوچھنے لگے' "ایکسکیوزمی سر' یور
ٹیکسی فارہائر؟" اس نے مسکرا کر سرہلایا۔ اس نے بھی شاید اٹکل سے یہ اندازہ لگا لیا ہو گا
کہ وہ کیا سوال کر رہے ہیں۔ ہمارے ٹیکسی میں سوار ہوتے ہی اس نے میٹر گرا دیا اور
ساتھ ہی کار کا ریڈیو بھی آن کر دیا اور پھر اس تیزی سے ٹیکسی چلانی شروع کی کہ تھوڑی
دیر کے لئے تو ہم لوگ واقعی چکرا کر رہ گئے۔

خان صاحب نے میرے کان میں کہا "آپ کو یقین ہے کہ یہ اردو پنجابی نہیں
سمجھتا؟"

میں نے جواب دیا "ظاہر ہے یہ اٹلی کا رہنے والا ہے۔ یہاں کوئی اردو میڈیم
اسکول نہیں ہے۔"

پھر وہ کہنے لگے "ایک بات میں بتائے دیتا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ روم کے ٹیکسی
ڈرائیور بہت بے ایمان ہوتے ہیں۔

بٹ صاحب نے حسب معمول ان کی بات کاٹ دی "خان صاحب زیادہ بے
اعتباری بھی نہیں کرنی چاہئے۔ شکل سے تو بے چارہ بہت ایماندار اور شریف لگتا ہے اور
پھر ہم اس شہر میں نئے ہیں۔ کیا پتا یہ جس شارٹ کٹ سے ہمیں لے جائے وہی زیادہ لمبا
راستہ ہو۔" چنانچہ اس گفتگو کے بعد خان صاحب نے ٹیکسی ڈرائیور کی نیت پر کوئی شک
نہیں کیا۔

ڈرائیور نے بہت تیز رفتاری سے ایک موڑ کاٹا اور ٹیکسی ایک لمبی سی سرنگ میں
داخل ہو گئی۔ ٹیکسی میں سے ہم نے جتنا روم دیکھا تھا وہ بہت خوبصورت تھا۔ چاروں
طرف ہریالی' سبزہ زار جو ٹیلوں کی شکل میں بنے ہوئے تھے۔ خوبصورت اور کشادہ سڑکیں'
خوشنما روشنیاں' جگہ جگہ چکردار سڑکیں جو ایک دوسرے کے اوپر سے گزرتی تھیں۔ لمبی
لمبی سرنگیں' یہ سرنگیں بھی خاصی چوڑی اور بہت روشن تھیں۔ ان کے اندر سفر کرتے
ہوئے بالکل دن کا گمان گزرتا تھا' اور پھر انہیں بہت خوبصورتی سے تعمیر کیا گیا تھا۔ روم

پہلا غیر ملکی شہر تھا جو ہم نے دیکھا تھا۔

پاکستان سے پہلی بار سیر و سیاحت اور کاروباری مقاصد کے پیش رفت دیکھنے ارادہ کر کے نکلے تھے۔ راستے میں چند گھنٹے بیروت میں قیام کیا تھا مگر بیروت شہر کو دیکھنے موقع نہیں ملا تھا۔ اسی لئے روم کی ہر چیز نئی اور خوبصورت لگ رہی تھی۔ روم ہم فلموں میں دیکھا تھا۔ اس کی تعریف بھی بہت سنی تھی۔ کہتے ہیں کہ روم ایک غیر فانی ہے۔ اس کو زوال نہیں ہے۔ خدا جانے کب سے یہ شہر موجود ہے' اور نہ جانے کب تک رہے گا۔ پھر جب اٹلی کی فلمیں پاکستان میں آنی شروع ہوئیں تو روم کے علاوہ اس ملک کی دوشیزائیں بھی اچھی لگنے لگیں۔ سلوانا منگانو' صوفیہ لارین' جینا لولو بریجیڈا' یگنانی اور نہ جانے کون کون سی ہیروئنیں تھیں۔ جنہوں نے ہمارا ہی نہیں دنیا بھر کے لوگوں کا چین چھین لیا تھا۔ رسالوں میں پڑھا تھا' کہ روم میں حسن و جمال کی بارش ہوتی ہے۔ حسن کی اس قدر بہتات ہے کہ اللہ کی قدرت یاد آ جاتی ہے۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ روم فنون لطیفہ کا مرکز ہے وغیرہ وغیرہ یہی وجہ ہے کہ جب سے ٹیکسی نے اپنا سفر شروع کیا تھا ہم کھڑکی سے باہر دیکھ دیکھ کر حیران اور خوش ہو رہے تھے۔ پھر صفائی ایسی اپنے ملک میں بھلا کب دیکھی ہو گی۔ ہر چیز صاف شفاف اور چمک دار نظر آ رہی تھی۔ شاید ہمارے ملک میں خاک کم ہوتی ہے۔ جب مزید کم ہونے لگتی ہے تو مختلف محکموں کے فرض شناس کارندے سڑکیں کھودنے آ جاتے ہیں اور پھر ہفتوں مہینوں یہ خاک اور گرد غبار فضا میں اڑتا رہتا ہے۔

ایک اور خوبی یہ بھی ہے کہ ایک تو ہمارے ملک میں پختہ سڑکیں ہوتی بہت تنگ ہیں۔ پھر بڑی باقاعدگی سے ان کے دو طرفہ کناروں پر مٹی کے ڈھیر ڈال کر انہیں چھپایا جاتا ہے۔ یہ ساری خاک کاروں کے ذریعے لوگوں کے پھیپھڑوں میں منتقل ہو جاتی ہے روم میں بھی ہمیں مٹی نظر آ رہی تھی۔ مگر وہ وطن عزیز کے مقابلے میں برائے نام تھی ویسے بھی نئی چیزیں اور نئی جگہیں بہت مرعوب کن اور خوبصورت لگتی ہیں۔ پھر روم کا رعب داب ہی بہت زیادہ تھا۔

مگر خان صاحب کو فکر یہ تھی کہ روم کی سات پہاڑیاں کہاں ہیں؟ بٹ صاحب بولے "خان صاحب! آپ کو کوئی پہاڑی الاٹ کرانی ہے کیا؟"

"بکو مت یار" وہ جل کر بولے "دوسرے ملک میں جاتے ہیں تو بہت غور سے گہرا مشاہدہ کرتے ہیں' اگر پرانے مورخ ایسا نہ کرتے تو آج ہمیں اس زمانے کے حالات کیسے معلوم ہوتے؟"

اتنی دیر میں ٹیکسی ڈرائیور نے کار کے ریڈیو کا اسٹیشن بدل دیا تھا اور کوئی مرد نغمہ سرا تھا' یوں لگتا تھا جیسے رو رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی المیہ گانا ہو جس کے بول ہماری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے مگر ٹیکسی ڈرائیور کی اداسی دیکھ کر تصدیق ہو گئی کہ یہ غمناک گیت ہے۔ اس نے اب جھومنا بند کر دیا تھا اور اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ ٹٹول رہا تھا۔ ہم سمجھے شاید آنسو پونچھنے کے لیے رومال تلاش کر رہا ہے۔ چند لمحے بعد اس نے سگریٹ کا ایک پچکا ہوا پیکٹ تلاش کر کے جیب سے نکالا اور کار میں لگے ہوئے لائٹر کی مدد سے سگریٹ سلگا کر لمبے لمبے کش لینے لگا۔

خان صاحب کہنے لگے "کس قدر بدتمیز شخص ہے مسافروں سے اجازت تک نہیں لی۔ لوگ ہمارے تانگے والوں کو خواہ مخواہ برا کہتے رہتے ہیں۔"

بٹ صاحب نے مشورہ دیا "خان صاحب! آپ اس کو ڈانٹ دیں' کچھ تمیز سکھائیں۔ اسے بھی پتا چلے کہ کسی پاکستانی سے پالا پڑا تھا۔"

خان صاحب نے جوش میں آ کر ٹیکسی ڈرائیور کے کندھے پر دستک دی اور سگریٹ کی طرف اشارہ کر کے انگریزی میں یہ کہنے کی کوشش کی کہ تمہیں ہماری اجازت کے بغیر سگریٹ نہیں پینی چاہئے۔ وہ سمجھا کہ شاید وہ سگریٹ طلب کر رہے ہیں۔ اس نے بڑی خندہ پیشانی سے سگریٹ کی ڈبیا ان کی طرف بڑھائی اور اپنی زبان میں بہت تیزی سے کچھ کہا جو ہم میں سے کسی کی سمجھ میں نہیں آیا مگر خان صاحب ہماری طرف دیکھ کر بولے "نہ جانے کیا بک رہا ہے مگر آواز اچھی ہے۔"

اتنی دیر میں ٹیکسی ڈرائیور نے سگریٹ کا پیکٹ ان کے ہاتھ میں تھما دیا تھا' اور بڑی گرم جوشی اور خلوص سے انہیں سگریٹ آفر کر رہا تھا۔ اس کا پیار بھرا انداز دیکھ کر خان صاحب اپنا غصہ بھول گئے۔

"تھینک یو" کہ کر ایک سگریٹ نکالی۔ اس نے فوراً اپنی جلی ہوئی سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور وہ سگریٹ خان صاحب کی طرف بڑھا دی۔ انہوں نے سگریٹ سے سگریٹ

سلگائی ایک لمبا کش لیا اور کہنے لگے "کیا بات ہے اٹلی کی سگریٹ کی اس کا تو مزہ ہی کچھ اور ہے۔ خوشبو کتنی اچھی ہے کیوں نہ ہو بھئی' روم پھر روم ہے۔ اٹلی والوں کی تو ہر چیز ہی اچھی ہوتی ہے۔"

بٹ صاحب اتنی دیر میں سگریٹ کے پیکٹ کا بغور معائنہ کر چکے تھے' بولے "خان صاحب یہ سگریٹ انگلستان کی بنی ہوئی ہے۔ اٹلی والوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ واقعی دیکھا تو کیپسٹن سگریٹ کا پیکٹ تھا۔ مگر کیونکہ اطالوی زبان میں لکھا ہوا تھا اس لئے پہلی نگاہ میں خان صاحب صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے تھے۔ کیونکہ خان تھے اور اتنی جلدی ہار ماننا ان کی سرشت میں شامل نہیں تھا اس لئے کہنے لگے "ماحول کا بھی بہت اثر پڑتا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ روم میں سگریٹ پینے کا سواد ہی کچھ اور ہے۔" پھر وہ ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھنے لگے "فرینڈ یو نو سیون ہلز آف روم؟"

ٹیکسی ڈرائیور ان کی اردو زدہ انگریزی سمجھنے سے قاصر تھا پھر بھی زور زور سے سر ہلانے لگا۔ شاید اپنے نئے دوست کی دل شکنی اسے منظور نہ تھی۔ خان صاحب نے پھر پوچھا "وہیراز روم آئی مین سیون ہلز' سمجھتے ہو ہلز' پہاڑیوں کو کہتے ہیں؟"

انہوں نے جملہ اردو میں مکمل کیا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے پھر زور زور سے سرہلانا شروع کر دیا اور مسکرانے لگا۔ خان صاحب جل گئے' کہنے لگے "یہ تو بالکل ہی جاہل لگتا ہے۔"

جواب میں ٹیکسی ڈرائیور نے اپنی اطالوی زبان میں ایک لمبی سی تقریر کر دی جسے سن کر خان صاحب دم بخود رہ گئے۔ ہم لوگوں نے منہ پھیر کر ہنسنا شروع کر دیا۔

مگر ٹھہریے۔ ٹیکسی کے سفر سے پہلے آپ کو روم کے ایئرپورٹ کی بابت بھی کچھ بتا دیں۔ خان صاحب' بٹ صاحب اور میں جب بیروت سے پہلی امریکن ایئرویز کی فلائٹ سے روم کے لئے روانہ ہوئے تو بہت دیر تک خان صاحب بیروت کو یاد کر کے آہیں بھرتے رہے۔ یہاں تک کہ انہیں نیند آگئی۔ تھوڑی دیر میں ایئرہوسٹس پھر ناشتا لے کر آ گئی۔ ایک تو ہم لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ ہر جگہ فلائٹ روانہ ہوتے ہی دوبارہ ناشتا اور کھانا کیوں پیش کر دیا جاتا ہے؟ جب زیادہ ہوائی سفر کئے تو معلوم ہوا کہ ہر ایئرپورٹ سے جو نئے مسافر سوار ہوتے ہیں ان کی مدارات کے لئے یہ اہتمام کیا جاتا

ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ جو مسافر اس سے پہلے ناشتا یا کھانے سے فارغ ہو چکے ہوں وہ اخلاقاً معذرت کر دیں۔ مگر توبہ کیجئے جب سامنے لذیذ چیزوں سے بھری ہوئی ٹرے دھری ہو اور اس میں خوشبو بھی اٹھ رہی ہو تو انکار کون کافر کرے اور کس دل سے کرے۔ بہرحال بیروت سے روم تک کا سفر سوتے جاگتے طے ہوا تھا۔ البتہ خان صاحب تھوڑے تھوڑے وقفے سے برابر سے گزرنے والی ایئرہوسٹس کی کمر اور پنڈلیاں دیکھنے کے لیے پلکوں کی جھریوں میں سے جھانک لیتے تھے' اور دبی زبان سے ماشاء اللہ' سبحان اللہ کہہ کر دوبارہ آنکھیں موند لیتے۔ ہوائی جہاز کے روم ایئرپورٹ پر پہنچنے کا اعلان کیا گیا تو خان صاحب بہت جذباتی ہو گئے کہنے لگے "کتنی خوبصورت لڑکیاں ہوتی ہیں یہاں۔ لگتا ہے سنگ مرمر سے بنائی گئی ہیں اور اب یہ سفر ہی ختم ہو رہا ہے۔"

ہم نے کہا "غم نہ کریں۔ روم بھی یورپ ہی کا حصہ ہے۔ وہاں بھی ایسی ہی لڑکیاں نظر آ جائیں گی۔ وہ ایک دم ہوشیار ہو کر اٹھ بیٹھے "کیا واقعی؟ ایسی ہی گوری گوری اور خوبصورت؟"

ہم نے کہا "شاید تم نے فلموں میں نہیں دیکھا۔ اٹلی کی عورتیں کتنی پیاری ہوتی ہیں۔ ساری دنیا ان کی دیوانی ہے۔"

"یہ تو ٹھیک کہا آپ نے۔ تو پھر جلدی کریں۔ روم کا ایئرپورٹ کب آئے گا؟"

روم ایئرپورٹ پر اترنے سے پہلے جب ایئرہوسٹسوں نے مسافروں کو بوقت رخصت خدا حافظ کہا تو بٹ صاحب نے جذباتی ہو کر ان سے ہاتھ بھی ملایا۔ خان صاحب دو قدم آگے بڑھ چکے تھے۔ بٹ صاحب کو مصافحہ کرتے دیکھا تو واپس پلٹ کر گئے اور انہوں نے بھی دوبارہ "گڈ بائی" کہہ کر ایئرہوسٹس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ پھر اس کی مسکراتی ہوئی نیلی آنکھوں میں دیکھ کر بولے "پھر ملیں گے اگر خدا لایا"

ہم نے کہا "بس کرو یار یہ بسوں پہ لکھے ہوئے شعر ان لڑکیوں کو کیوں سنانے لگے؟"

اتنی دیر میں پیچھے قطار میں کھڑے ہوئے مسافروں نے آہستہ سے دھکے دینے شروع کر دیئے تھے۔ بٹ صاحب نے خان سے کہا "خان صاحب! یہ کہہ رہے ہیں کہ ہارن دے کر راستہ لیں۔" خان صاحب نے بہ امر مجبوری ایئرہوسٹس کا ہاتھ چھوڑا مگر

بہت دیر تک اپنے ہاتھ میں اس کے سینٹ کی خوشبو سونگھتے اور "واہ واہ" کرتے رہے۔

روم کا ایئرپورٹ دیکھا تو بیروت ایئرپورٹ اس کے سامنے ماند نظر آنے لگا۔ ایک تو یہ بہت بلند و بالا عمارت تھی۔ دوسرے یہ کہ بالکل شیشہ گھر لگتی تھی۔ اتنے بڑے بڑے اونچے اونچے شیشوں کی دیواریں ہم نے پہلے نہیں دیکھی تھیں' یہاں نفاست اور نزاکت کچھ زیادہ تھی۔ زیادہ تر مسافر گورے ملکوں سے تعلق رکھنے والے تھے۔ جن کو بقول خان صاحب اللہ میاں نے دنیا ہی میں جنت اور حوریں عطا کر دی ہیں۔ بٹ صاحب نے اس پر تبصرہ کیا کہ یہ دوسری دنیا میں ان چیزوں سے محروم رہیں گے۔ بہرحال یہ دیکھئے کہ انسان دل کو تسلی دینے کے لئے کیسی کیسی باتیں سوچتا ہے۔ اب تک ہم لوگوں نے اتنی ہمت سے یورپین مرد اور عورتیں دیکھ لئے تھے کہ اس سے پہلے ساری زندگی میں نہیں دیکھے تھے۔ ہمارے ملک میں تو اکا دکا گوری میم نظر آ جائے تو ٹریفک رک جاتا ہے۔ پھر یہاں تو سینکڑوں ہزاروں تھیں۔ اس لئے اگر خان صاحب کی دل کی دھڑکن رکی جا رہی تھی تو کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ انہوں نے اس سے پہلے ہالی وڈ کی فلموں میں "میموں" کو دیکھا تھا اور اس قدر حسین و جمیل چہرے اور ترشے ہوئے جسم دیکھ کر وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے' کہ ہو نہ ہو یہ سب کیمرا ٹرک ہے ورنہ ایسے متناسب جسم اور اتنے خوبصورت چہرے بھلا سچ مچ کی دنیا میں کہاں ہوتے ہیں؟ مگر اب جو انہوں نے بنفس نفیس میموں کی ڈاریں کی ڈاریں دیکھیں تو کلیجہ تھام کر رہ گئے۔ ان کی سمجھ میں یہ راز نہیں آ رہا تھا کہ اس قدر خوبصورت اور دلکش جسم اور اتنی بڑی تعداد میں ان لوگوں کو کیسے مل گئے' کہ یوں لگتا ہے جیسے سچ مچ کے انسان نہیں مصور کے بنائے ہوئے شاہکار ہیں۔ بٹ صاحب اصولی طور پر اس خیال کے مخالف تھے وہ فرنگی لوگوں کی تعریف و توصیف کرنے کے قائل نہیں تھے۔ اس لئے بار بار یہ شبہ ظاہر کر رہے تھے کہ یہ سب "نظربندی" کا کمال ہے۔ یورپ والوں نے نظربندی کی تکنیک سے کام لیا ہے ورنہ ایسی کوئی بات نہیں ہے مگر کن انکھیوں سے وہ بھی ان گوریوں کو دیکھنے سے باز نہیں آتے تھے۔ آس پاس کے ماحول سے خان صاحب اتنے متاثر ہوئے کہ روم میں چار دن کے بجائے آٹھ دس دن رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے علاوہ جب ان کا سامان گھومنے والے پٹے پر باہر آیا تو ان کا دھیان کسی اور طرف تھا' جس کے نتیجے میں ان کا سوٹ کیس کئی بار چکر کھاتا رہا۔ یہاں تک کہ بعض

لوگ سمجھے کہ شاید یہ لاوارث ہے۔

خان صاحب تو بیروت کا ائرپورٹ دیکھ کر ہی بہت حیرت زدہ تھے' اب جو روم کا ائرپورٹ دیکھا تو بس آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یہاں ہر چیز نرالی اور نئی سی تھی۔ ٹرالیوں پر سامان رکھ کر ہم امیگریشن سے باہر نکل گئے' لاؤنج میں پہنچ کر ہمیں سب سے بڑی فکر یہ تھی' کہ پہلے کرنسی تبدیل کرائیں۔ ہماری کل کائنات ساتھ پاکستانی روپے اور بیس امریکی ڈالر تھے' جب تک ہمیں روم میں وہ صاحب نہ مل جائیں جن سے ہمیں رقم وصول کرنی تھی اس وقت تک ہمیں اسی رقم سے گزارہ کرنا تھا۔ ہماری چھٹی حس ہمیں خبردار کر رہی تھی کہ جن صاحب سے ہمیں ڈالر ملنے تھے ان سے ہماری ملاقات کچھ آسان نہ ہو گی۔

روم ائرپورٹ بہت صاف ستھرا اور روشن تھا۔ غالباً" وہاں گھومنے پھرنے والے روشن چہروں اور شاداب جسموں نے بھی اس روشنی میں کچھ اضافہ کیا تھا۔ ایک جانب بینک نما کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں' جن کے اوپر مختلف زبانوں میں لکھا تھا کہ کرنسی یہاں تبدیل کی جاتی ہے۔ ہم نے خان صاحب کو سامان کے پاس کھڑا رہنے کی ہدایت کی کیونکہ بٹ صاحب کے سپرد یہ خدمت نہیں کی جا سکتی تھی۔ ان کی نگاہیں ہر طرف گھوم رہی تھیں اور ہر خوبصورت چہرے کو دیکھ کر وہ زیر لب "سبحان اللہ" ضرور کہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ میں تو کشمیریوں کو دنیا میں سب سے زیادہ خوبصورت سمجھتا تھا' مگر اب معلوم ہوا کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ یورپ والے تو ان سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ اور اٹلی کے حسن کی تو بات ہی کیا ہے۔

خان صاحب کے جذبہ حب الوطنی کے لئے یہ بیان ناقابل برداشت تھا۔ انہوں نے دانت پیس کر کہا "اوئے بٹ۔ شرم کر کشمیری ہو کر کشمیریوں کی بھد اڑا رہا ہے۔ یہ ان کی خوبصورتی نہیں ہے' ان کے ننگے جسم اور بے شرمی ہے جو تجھے اچھی لگ رہی ہے۔ ارے ظالم۔ کشمیریوں کی رنگت' کشمیریوں کے نقش و نگار' کشمیریوں کے بال اور کشمیریوں کی آنکھیں انہیں بھلا کہاں نصیب ہو سکتی ہیں۔"

ان دونوں حضرات کو اس "اکیڈیمک" بحث میں مصروف چھوڑ کر ہم ان کھڑکیوں کی جانب گئے۔ جن پر مختلف زبانوں میں لکھا تھا کہ وہاں غیر ملکی کرنسی تبدیل کی جاتی

ہے۔ کھڑکی کے پیچھے ایک خوشنما چہرے کو مسکراتے دیکھا تو یوں لگا جیسے ہماری کوئی پرانی شناسا ہیں مگر رفتہ رفتہ ہم پر یہ عقدہ کھلتا جا رہا تھا کہ یورپ والے اخلاق کے مارے مسکراتے ہیں۔ ان کی مسکراہٹوں اور اظہار محبت کا اخلاق سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کھڑکی کے پیچھے ایک فریم میں جڑی ہوئی تصویر کے مانند جو حسینہ فروکش تھیں انہوں نے پہلے تو اطالوی لہجے میں ہمیں "ہیلو" کہا اور پھر جواب میں ہمارے مسکرانے پر مزید خلوص کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑی رسیلی آواز میں پوچھا "میں آپ کے لئے کیا کر سکتی ہوں؟" دل میں تو نہ جانے کیا کیا خیالات آئے مگر ہم نے ان سے دریافت کیا کہ آج کل لیرا (اطالوی سکّے) کے مقابلے میں امریکی ڈالر کا کیا بھاؤ ہے؟ ہمارے طرز گفتگو سے وہ سمجھیں کہ شاید ہمیں لاکھوں نہیں تو ہزاروں ڈالر تو ضرور بھنانے ہوں گے۔ مگر جب ہم نے ان کے سامنے بیس ڈالر کا نوٹ نکال کر رکھا تو وہ حیران رہ گئیں۔ پھر ہم سے پوچھنے لگیں "بس؟" ہم نے فوراً جیب سے ساٹھ پاکستانی روپے بھی نکال کر ان کے سامنے رکھ دیے اور بڑے فخریہ انداز میں انہیں دیکھنے لگے۔ تعریف کی بات یہ ہے کہ مسکراہٹ اس کے باوجود بھی ان کے چہرے سے غائب نہیں ہوئی۔

انہوں نے تقریباً ساڑھے پانچ ہزار لیرا کے نوٹ ہمارے ہاتھ میں تھما دیے۔ بیس ڈالر اور ساٹھ روپے کے عوض ساڑھے پانچ ہزار ایک بہت بڑی رقم تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے تو ہم بھی اپنے آپ کو رئیس سمجھنے لگے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ ہمارا کھڑکی کے سامنے سے ہٹنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے تو اخلاقاً مسکراتے ہوئے پوچھا "اور کچھ؟" ہم نے دانت نکال کر ان کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے ہٹ گئے۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس زمانے میں پاکستانی کرنسی کی اتنی ناقدری نہیں ہوئی تھی۔

خاں صاحب کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ بڑے ٹھاٹ سے پتلونوں کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑے ہیں۔ ہمیں دیکھ کر مسکرائے اور سامنے اشارہ کیا جہاں ایک تنومند اور خوش شکل اطالوی لوڈر ایک ٹرالی پر ہم لوگوں کا سامان رکھے منتظر تھا۔ خان صاحب بولے "یہ بہت پیچھے پڑ رہا ہے۔ بے چارہ ضرورت مند معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے سوچا اسی کو خدمت کا موقع دے دیں۔"

ہم نے کہا "یاد نہیں ہم نے آپ سے کہا تھا کہ لوڈر وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے؟

یورپ میں مسافر اپنا سامان خود اٹھاتے ہیں، صرف لکھ پتی کروڑ پتی لوگ ہی لوڈر کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔"

بولے "یار ہم بھی تو رئیس ہیں۔"

ان سے بحث کرنا لاحاصل تھا، اس لئے ہم نے لوڈر سے پوچھا "کتنے پیسے ہوں گے؟"

بولا "ساڑھے سات سو لیرا۔"

یعنی زیادہ سے زیادہ تیس گز کے فاصلے تک معمولی سامان پہنچانے کا معاوضہ وہ ساڑھے سات سو لیرا طلب کر رہا تھا۔ لیرا کی بے وقعتی کا ہمیں اندازہ ہو چکا تھا۔ مگر پھر بھی ساڑھے سات سو لیرا کی فضول خرچی اور وہ بھی اتنی تنگ دستی کے عالم میں ہم کو پسند نہیں آئی۔ ہم نے خان صاحب سے کہا "سن لیا آپ نے۔ اتنی سی دور سامان لے جانے کے لئے وہ ساڑھے سات سو لیرا مانگ رہا ہے۔"

خان صاحب کا منہ حیرت سے پھٹا کا پھٹا رہ گیا۔ "ساڑھے سات سو لیرا! یار یہ تو اندھیر ہے۔ یہ تو کوئی نوسرباز معلوم ہوتا ہے مجھے۔ بھائی اس سے کہو کہ معاف کردے اور ہماری جان چھوڑے۔"

ہم نے کہا "خاں صاحب یہ اٹلی ہے اور یہاں کی مافیا اور غنڈے ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ اب ذرا ایک نظر لوڈر کی جانب بھی ڈال لیجئے۔ کس قدر ہٹا کٹا اور خونخوار آدمی نظر آتا ہے۔"

خان صاحب نے لوڈر کو دیکھا اور مایوسی سے بولے "اب کیا ہوگا؟"

ہم نے کہا "ہوگا کیا، گروی پڑ جائیں گے۔ تمہیں تو پتا ہے کہ ہمارے پاس صرف ساٹھ پاکستانی روپے کی کل کائنات ہے۔ یہ ساڑھے سات سو لیرا کہاں سے آئیں گے۔"

وہ قریب قریب روہانسے ہو کر بولے "بھائی غلطی ہو گئی مجھے تو لگتا ہے، کہ ہم لوگوں کو اپنی گھڑیاں وغیرہ بیچنی پڑیں گی۔"

بٹ صاحب نے اپنے گلے میں پڑی ہوئی سونے کی زنجیر کو ٹٹولا اور کہنے لگے "یہ بھی تھوڑی بہت رقم میں بک جائے گی۔"

اس دوران میں لوڈر ہم تینوں کے منہ تک رہا تھا۔ تنگ آ کر کچھ بولا مگر نہ جانے

کیا بولا۔ وہ اطالوی زبان میں بولا تھا جو ہماری سمجھ سے بھی بالا تر تھی۔ مگر اتنا یقین تھا کہ وہ ہمیں ڈانٹ رہا ہے کہ فضول وقت کیوں ضائع کرتے ہو۔ جلدی سے مجھے فارغ کرو۔ ہم نے اسے سامان کی ٹرالی لے کر چلنے کا اشارہ کیا۔ خان صاحب انتہائی سوگوار انداز میں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی کو پرسہ دینے جا رہے ہیں۔ بٹ صاحب بھی انہیں گھورتے ہوئے ساتھ چل رہے تھے۔ امیگریشن سے نکل کر ہم مسافر لاؤنج میں پہنچے جہاں مختلف کاؤنٹرز پر ٹیکسیوں والے اور ہوٹل والے (اور والیاں) براجمان تھے۔ ایک کاؤنٹر پر دو لڑکے اور ایک خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر ہم اس طرف بڑھ گئے۔ ان تینوں نے بھی گرمجوشی سے مسکرا کر ہمارا خیر مقدم کیا اور پھر ٹوٹی پھوٹی بلکہ بالکل نیم جان انگریزی میں ہمیں بتایا کہ وہ ہمارے لئے بہت اچھے ہوٹل میں بہت سستا بندوبست کر دیں گے۔ ہوٹل ریلوے اسٹیشن کے پاس ہے' اور شہر کے وسطی علاقے میں ہے' جہاں سے آپ سیاحت کے لئے ہر قابل دید مقام تک پیدل ہی جا سکتے ہیں اور بہت رونق والی جگہ ہے' بھاؤ تاؤ کیا تو انہوں نے تین بستروں والے ایک کمرے کا کرایہ نو ڈالر بتایا۔ ہم فوراً راضی ہو گئے۔ پھر انہوں نے سامنے کھڑے ایک درمیانی عمر کے شخص کو آواز دے کر بلایا اور ہم سے کہا کہ یہ روم کا شریف ترین ٹیکسی ڈرائیور ہے' آپ کو ہوٹل لے جانے کے لئے صرف ڈھائی ہزار لیرا لے گا۔

ہم نے پوچھا "اور بس کتنا کرایہ لیتی ہے اور کہاں سے چلتی ہے؟"

لڑکی نے فوراً جواب دیا "بس تو اب جا چکی اور پھر اس ہوٹل تک بس نہیں جاتی آپ کو خواہ مخواہ زحمت ہو گی۔ یہ ٹیکسی بھی یوں سمجھئے کہ بس ہی کا کرایہ لے رہی ہے۔ دیکھئے نا بس میں آپ کو تین الگ الگ ٹکٹ خریدنے ہوں گے جب کہ ٹیکسی ایک ہی کرائے میں۔ آپ تینوں کو ہوٹل پہنچا دے گی اور پھر یہ شخص روم کا بہترین ڈرائیور ہے۔ راستے میں آپ کے لئے گائیڈ کے فرائض بھی سرانجام دے گا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے' کہ یہ بہت اچھی انگریزی جانتا ہے۔ اتنی بہت سی سفارشیں سننے کے بعد ہم نے بھی ہتھیار ڈال دیے اور ہمارے اشارے پر لوڈر نے ہمارا سامان ٹیکسی میں رکھ دیا۔ جب ہم نے لوڈر کو آٹھ سو لیرا دئے تو اس نے مسکرا کر سلام کیا اور رخصت ہو گیا حالانکہ ہم نے اسے ٹپ دینے کا ارادہ تک نہیں کیا تھا۔ مگر اس نے بذات خود ٹپ وصول کر لی۔ ٹیکسی ڈرائیور کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں اور وہ بھی خوبصورت آدمی تھا۔ ہوٹل والے نے اس سے اطالوی زبان میں جلدی جلدی بہت سی باتیں کیں اور ہمیں ٹیکسی میں لاد دیا یہ راز ہم پر بعد میں کھلا کہ دراصل یہ سب لوگ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ مثلاً لوڈر' ہوٹل کی بکنگ کرنے والے' ٹیکسی ڈرائیور اور بعد میں ہم جس ہوٹل میں جا کر ٹھہرے وہ سب ایک دوسرے سے تعلق رکھتے تھے مگر ظاہریوں کر رہے تھے جیسے ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی ہیں۔

روم کے ایئرپورٹ سے ٹیکسی روانہ ہوئی تو تازہ ہوا کے جھونکوں نے ہمارا خیر مقدم کیا۔ پھر روم کے سبزہ زار، خوبصورت سڑکیں اور سرنگیں شروع ہو گئیں۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم شہر کے گردونواح میں پہنچے تو بعض قدیم تاریخی عمارات یا ان کے کھنڈر نظر آئے اور اس کے ساتھ ہی ڈرائیور کی زبان لترلتر چلنے لگی۔

وہ اپنی اپنی انگریزی اور اطالوی کی ملاوٹ زدہ زبان میں ہمیں روم کے اسرار و رموز بتا رہا تھا اور مختلف عمارتوں کا تعارف کرا رہا تھا۔ ہمیں حیرت اس بات پر ہوئی کہ مشہور زمانہ تاریخی عمارتیں جو فلموں اور تصویروں میں بہت خوبصورت اور شاندار نظر آتی تھیں اس وقت کھنڈر دکھائی دے رہی تھیں۔ روم کا یہ پہلو ہمیں ایک آنکھ بھی نہیں بھایا۔

کھلی سڑکوں کا علاقہ ختم ہوا تو ہم وسطی شہر میں داخل ہو گئے۔ جسے انگریزی میں ڈاؤن ٹاؤن کہتے ہیں۔ سڑکوں پر خوب رونق اور چہل پہل تھی۔ حسن و جمال کی یہاں بھی بہتات تھی۔ کاریں، بسیں، ٹرک اور موٹرسائیکلیں بھی حد سے زیادہ تھیں۔ پرانے روم کی اکثر سڑکیں لاہور کی سڑکوں سے بھی زیادہ پتلی ہیں۔ اور ٹریفک بھی بہت زیادہ اور انتہائی تیز رفتار ہے۔ ان پتلی پتلی سڑکوں پر اگر ٹریفک کے اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر کاریں بھگائی جائیں تو کیا صورت حال ہو سکتی ہے اس کا اندازہ آپ کو خود روم جائے بغیر نہیں ہو سکتا۔ بہرحال ٹریفک کے بارے میں پھر بیان ہو گا۔ پہلے تو ہوٹل تک کے سفر کی روداد سن لیجئے۔ ٹریفک کا جام ہونا ایک عام رواج ہے۔ دنیا کے ہر بڑے شہر میں ایسا ہوتا ہے۔ لیکن روم میں ٹریفک جام ٹریفک کی کثرت کے باعث نہیں بلکہ ڈرائیوروں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مثلاً ایک پتلی سی سڑک ہے جس کے ایک یا دو جانب کاریں پارک کی گئی ہیں اور درمیان میں ایک نہایت پتلا سا راستہ باقی رہ گیا ہے۔ جس پر ایک

وقت میں ایک گاڑی ہی چل سکتی ہے۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ دونوں طرف سے گاڑیاں یا ٹرک سڑک پر داخل ہو جاتے ہیں۔ سڑکیں بہت لمبی لمبی ہوتی ہیں اس لئے جب سڑک کے بیچوں بیچ دو گاڑیاں آمنے سامنے کھڑی ہو جاتی ہیں تو پھر ان کے پیچھے چند لمحوں میں دوسری گاڑیوں کی بہت طویل قطار لگ جاتی ہے اب منظر یہ ہے کہ دونوں آمنے سامنے والی گاڑیوں کے ڈرائیور ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرا رہے ہیں۔ پھیپھڑوں کا زور لگا لگا کر چلا رہے ہیں۔ پیچھے والی دوسری گاڑیوں کے ڈرائیور مسلسل ہارن بجا رہے ہیں اور اپنے تبصرے بیان فرما رہے ہیں۔ جب جذبات میں زیادہ گرمی پیدا ہو جاتی ہے تو ڈرائیور صاحبان گاڑیوں سے اتر کر دور دور ہو جاتے ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے ابھی ہاتھاپائی شروع ہو جائے گی۔ روم میں ہمارا پہلا پہلا دن تھا۔ اور پہلا پہلا ٹریفک کا تجربہ تھا۔ ہماری ٹیکسی بھی اس لمبی قطار میں کھڑی تھی جو ٹریفک کا ہجوم صاف ہونے کی منتظر تھی۔ عجب بلکہ اچھی بات یہ دیکھی کہ ڈرائیور شور و غل چاہے کتنا ہی مچائیں محض زبانی کلامی دھمکیوں اور گالیوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ ہم نے کبھی دو حضرات کو آپس میں دست و گریبان ہوتے نہیں دیکھا جب کہ ہمارے ملک میں چند لمحوں کی زبانی جنگ کے بعد باقاعدہ جسمانی مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہم ٹیکسی میں بیٹھے آس پاس کا نظارہ دیکھ رہے تھے اور خان صاحب بار بار کھڑکی کے باہر جھانک کر رننگ کمنٹری کرتے جا رہے تھے۔ ہماری ٹیکسی کا ڈرائیور اصل فریقوں سے کافی فاصلے پر تھا لیکن وہ اپنی جگہ بیٹھا بیٹھا بڑے جوش و خروش سے مسلسل کچھ بولے جا رہا تھا۔ ہم یہ نہیں سمجھ سکے کہ وہ کس کا حامی تھا؟ اتنی دیر میں یکایک پولیس کی گاڑی کے سائرن کی آوازیں سنائیں دیں اور شور و غل میں مزید اضافہ ہو گیا، مگر ہم نے روم (اور اٹلی) میں یہ دیکھا کہ لوگ پولیس کا بہت احترام کرتے ہیں یا اس سے ڈرتے ہیں۔ کیونکہ جوں ہی پولیس کا سائرن سنائی دے یا پولیس والا دکھائی دے مجمع چھٹ جاتا ہے۔ اور لوگ فوراً غائب ہو جاتے ہیں یا راہ راست پر آ جاتے ہیں۔ چنانچہ اس بار بھی یہی ہوا پولیس کے خوبصورت وردی پوش سپاہیوں نے ایک جانب کے ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ پیچھے جائے۔ اس کے ساتھ ہی گاڑیوں کی ایک بہت لمبی قطار ریورس گیئر میں پیچھے روانہ ہو گئی۔ لیکن فائدہ یہ ہوا کہ چند منٹ کے اندر ہی راستہ صاف ہو گیا۔ پہلے سامنے والا ٹریفک گزرا پھر ہمارے ٹریفک کی باری آئی۔ ہم نے روم کے ایک شہری

سے پوچھا کہ بھائی' جب ہر روز ہر سڑک پر یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے اور سڑکیں بھی بہت
تنگ ہیں تو انہیں ون وے کیوں نہیں کر دیا جاتا؟

وہ بولے کہ اس کا کوئی فائدہ نہ ہو گا کیونکہ لوگ ون وے کی بھی پابندی نہیں
کرتے۔

ہم نے حیران ہو کر پوچھا "مگر کیوں؟"

کہنے لگے "اس لئے کہ ہم اطالوی ہیں۔" اور کندھا اچکا کر چلے گئے۔

اٹلی والوں کی ایک خاص ادا یہ ہے کہ وہ دنیا بھر کی ہر بے قاعدگی کے مرتکب
ہوتے ہیں۔ اور اگر کسی غلط کام پر انہیں ٹوکا جائے تو وہ شانہ ہلا کر بے پروائی سے کہتے ہیں
"آپ نہیں جانتے' ہم اطالوی ہیں۔"

ٹریفک جام تو ختم ہو گیا مگر ہمارے ٹیکسی ڈرائیور کی تقریر ختم نہیں ہوئی۔ چند اور
تنگ گلیوں اور سڑکوں سے گزر کر جب تک ہم ہوٹل پر نہ پہنچ گئے اس کا تبصرہ جاری
رہا۔ خدا جانے وہ کس موضوع پر بول رہا تھا اور اپنی تقریر کسے سنا رہا تھا یا وہ خود اپنی آواز
سننے کا شوقین تھا۔ یہ خوبی بعد میں ہم نے یورپ کے دوسرے ملکوں کے ٹیکسی ڈرائیوروں
میں بھی پائی کہ وہ جب بولنا شروع کرتے ہیں' تو یہ خیال کئے بغیر کہ سننے والا ان کی زبان
سے ناواقف ہے مسلسل بولتے رہتے ہیں۔ بہرحال اپنی اپنی عادت ہے ٹیکسی ڈرائیور تو خیر
بول ہی رہا تھا مگر اب خان صاحب بھی شروع ہو گئے تھے۔ اور اٹلی والوں کے ٹریفک کے
شور پر ماتم کر رہے تھے کہ کس قدر بے قاعدہ اور بے ہودہ لوگ ہیں۔ ٹریفک کے اصولوں
کی تو پابندی ہی نہیں کرتے۔ ہم نے کہا "خان صاحب آپ کو یہ باتیں زیب نہیں
دیتیں۔ ہمارے شہروں میں ٹریفک کا کیا حال ہے؟"

بولے "یار وہ بات علیحدہ ہے۔ ہم تو ترقی پذیر ملک کے لوگ ہیں مگر یہ تو ترقی یافتہ
ہیں اور یورپین بھی ہیں ان کا یہ گناہ کسی طرح معاف نہیں کیا جا سکتا۔"

ٹیکسی اچانک ایک دھچکے سے رک گئی۔ دیکھا تو سامنے ایک ہوٹل کا بورڈ لگا ہوا
تھا۔ ایک معروف سڑک پر یا گلی کہہ لیجئے جس پر دو طرفہ پارکنگ کے بعد صرف ایک ہی
گاڑی گزرنے کی گنجائش تھی۔ یہ ایک معروف ہوٹل تھا۔ سامنے سے دیکھنے میں زیادہ بڑا
نہیں لگتا تھا۔ مگر اندر داخل ہونے کے بعد پتا چلتا تھا کہ اچھا خاصا بڑا ہے۔ ڈرائیور نے
ہمارا سامان اتار کر اندر پہنچا دیا اور کاؤنٹر پر موجود ایک پچاس سالہ بزرگ سے اپنی زبان
میں کچھ باتیں کرنے کے دوران میں ہماری طرف بھی اشارہ کرتا رہا۔ ہم اس دوران میں
آس پاس دیکھتے رہے اور ہوٹل کا جائزہ لیتے رہے۔ اس ہوٹل میں بیس پچیس کمرے
ہوں گے۔ یورپ میں ایسے ہوٹل بکثرت ہوتے ہیں۔ ان کے مالک ہی سارے کام کرتے
ہیں اور بہت خوبی سے ہوٹل چلاتے ہیں۔ ریسپشن پر کھڑے باوقار اطالوی نے ہماری
جانب مسکرا کر دیکھا اور کہا "آپ بالکل صحیح جگہ آئے ہیں کیونکہ اتنی اچھی انگریزی بولنے
والا ہوٹل اسٹاف آپ کو روم میں بہت مشکل سے ملے گا۔" ان کی انگریزی کا یہ عالم تھا
کہ ان کا یہ فقرہ ہم نے محض اٹکل ہی سے سمجھا تھا۔ مگر بعد کے تجربات سے پتا چلا کہ یہ
بھی بہت غنیمت تھا۔ انہوں نے اطالوی لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے ہمیں خوش آمدید
کہا اور پھر بولے کہ ایئرپورٹ والوں نے آپ کو بہت سستا کرایہ بتایا ہے ورنہ ہمارے
کمروں کا کرایہ اس سے دوگنا ہے۔ مگر خیر اب کیا ہو سکتا ہے۔ آپ اپنے فارم وغیرہ
بھریں اور پھر کمرے کا معائنہ فرمائیں۔"

ان سب کاموں سے فارغ ہونے کے بعد وہ ہمیں لکڑی کی خوبصورت سیڑھیوں
کے ذریعے اوپر کمرے میں لے گئے۔ کمرا خاصا اچھا تھا اور اس میں برابر برابر تین صاف
ستھرے بیڈ لگے ہوئے تھے۔ ایک جانب دیوار میں چھوٹا سا واش بیسن نصب تھا اور
دوسری جانب ایک پردہ سا لٹکا ہوا تھا۔ ہم سمجھے یہ غسل خانے کا دروازہ ہو گا۔ خان
صاحب واش بیسن دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ منہ ہاتھ دھونے میں آسانی رہے گی۔
ہوٹل کے مالک نے اپنا نام گوویدو بتایا۔ کمرا دکھانے کے بعد انہوں نے پھر ایک لمبی تقریر
کی جو ہماری سمجھ میں نہیں آئی مگر بعد میں پتا چلا کہ وہ ہمیں یہ بتا رہے تھے کہ اس کمرے
میں غسل خانہ نہیں ہے۔ غسل کرنے کے لئے ہمیں باہر اسی منزل پر غسل خانے میں جانا
ہو گا البتہ حوائج ضروریہ سے فارغ ہونے کے لئے کمرے میں مناسب انتظام تھا۔ ان کے
جانے کے بعد سب سے پہلے خان صاحب نے واش بیسن میں منہ دھویا (حالانکہ اس کی
ضرورت نہ تھی) پھر وہ پردہ اٹھا کر غسل خانے کی جانب گئے۔ مگر تصویر حیرت بنے رہ
گئے۔ انہوں نے ہمیں بھی بلا کر سامنے کا نظارہ دکھایا۔ یہ چار فٹ اور چھ فٹ کا ایک مربع
حصہ تھا جس کا فرش انتہائی خوبصورت تھا۔ ایک خوشنما کموڈ (یعنی فلش) تو خیر تھا ہی مگر

اس کے برابر ہی ایک اور فلش سے ملتی جلتی چیز بھی تھی۔ ہم سب نے بہت غور و فکر کیا
مگر سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس مصرف کے لئے تھا۔ بعد میں ہمیں معلوم ہو گیا کہ یہ
دراصل طہارت کے لئے تھا۔ آپ اس پر تشریف فرما ہو جائیں اور ایک بٹن دبائیں تو
فوارے کی مانند ٹھنڈا پانی یا دوسرا بٹن دبانے پر گرم پانی باہر نکلے گا۔ یہ ہمارے لئے بالکل
نئی چیز تھی چھت پر بہت تلاش کیا مگر کوئی شاور قسم کی چیز نظر نہیں آئی اور آتی بھی کیسے۔
مسٹر گوویدو ہمیں پہلے ہی بتا چکے تھے کہ اس کمرے میں غسل خانہ (یعنی نہانے والا غسل
خانہ) موجود نہیں ہے۔ بٹ صاحب تو خیر خاموش رہے مگر خان صاحب بولے "سوائے
نہانے کے اس کمرے میں ہر کام کیا جا سکتا ہے۔ اگر ایک شاور بھی یہیں لگا دیتے تو کیا
ہرج تھا؟"

بعد میں جب ہم نے زیادہ سفر کئے تو ہمیں پتا چلا کہ یورپ و امریکا کے بہت سے کم
خرچ ہوٹلوں میں کمروں کے ساتھ غسل خانے نہیں ہوتے۔ ہر منزل پر مشترکہ غسل خانہ
ہوتا ہے۔ اور کمرے سے ملحق غسل خانہ دراصل ایک عیاشی تصور کی جاتی ہے اور ایسے
کمروں کا کرایہ زیادہ ہوتا ہے۔ ہمیں پہلے اندازہ نہیں تھا کہ اچھے خاصے ہوٹل میں ہمیں
اتنے کم کرائے پر کمرا مل گیا دراصل اس کا سبب یہی تھا کہ اس کے ساتھ باتھ روم نہیں
تھا خان صاحب کو اس سسٹم پر بہت اعتراض تھا اور وہ اٹلی والوں کی اس حرکت پر خاصے
برہم تھے۔

ہم منہ ہاتھ دھو کر فارغ ہو گئے بلکہ خان صاحب اس غسل خانے کا جائزہ بھی لے
آئے جہاں ہمیں غسل کرنا تھا تو یہ مسئلہ سامنے آیا کہ جن صاحب سے ہمیں روم میں
ڈالر وصول کرنے تھے انہیں کہاں اور کیسے تلاش کریں؟ انہیں تو ہمارے بارے میں کچھ
علم ہی نہ تھا کہ اتنے بڑے شہر روم میں ہم کہاں مقیم ہیں۔ مگر ہمیں بتایا گیا تھا کہ پی آئی
اے کے دفتر سے یا پاکستانی سفارت خانے سے ہم ان کا پتا معلوم کر سکتے ہیں۔

ہماری مالی حالت انتہائی پریشان کن تھی۔ اس رقم سے ہم شاید ایک یا دو وقت کا
معقول کھانا بھی نہیں کھا سکتے تھے۔ پھر ہم ایک ہوٹل میں بھی فروکش ہو گئے تھے جہاں
کرایہ ادا کرنا لازمی امر تھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ ہم پہلی فرصت میں ان صاحب کو
تلاش کریں جو ہمارے حصے کے امریکی ڈالر لئے روم کے کسی گوشے میں بیٹھے ہوئے تھے۔
خان صاحب نے تلاش کر کے ان کا نام بتایا' کوئی انصاری صاحب تھے۔ جنہیں بعد میں ہم
لوگوں نے پنساری صاحب کہنا شروع کر دیا تھا۔ بیڈ کے سرہانے رنگین خوبصورت ٹیلی
فون رکھا ہوا تھا۔ ہم نے فون اٹھایا اور زیرو نمبر گھمایا تو ریسپشن سے مسٹر گوویدو کی آواز
آئی۔ ہم حیران تھے کہ یااللہ یہ ایک شخص ہوٹل میں تمام ذمہ داریاں کیسے پوری کرتا
ہے۔ یعنی چوکیدار وہ' دربان وہ' ریسپشن پر وہ' منیجر وہ' صفائی کرنے والا وہ' بیرا وہ اب ٹیلی
فون آپریٹر بھی وہی۔ یہ تو ہمیں بعد میں پتا چلا کہ اس کے علاوہ بھی وہ موصوف بہت سے
فرائض سرانجام دیا کرتے تھے۔ ہم نے ان سے درخواست کی کہ ہم پی آئی اے کے دفتر
بات کرنا چاہتے ہیں۔ وہ حسب معمول بہت خوش ہوئے "اچھا اچھا' پی آئی اے ویری گڈ
پیپل' ویری گڈ ائیرلائین ویری فائن' اس کے بعد انہوں نے پی آئی اے کے دفتر کا فون نمبر
ملایا۔ چند لمحے بعد انہوں نے مطلع کیا کہ دفتر میں کوئی نہیں ہے۔ شاید وہ لوگ ائیرپورٹ

گئے ہوئے ہیں۔ ہم نے درخواست کی کہ ایئرپورٹ کے دفتر سے بات کرا دیں۔ انہوں نے پھر پی آئی اے کی شان میں کچھ تعریفی کلمات کہے اور نمبر ملا دیا۔ ادھر سے کوئی صاحب خالص اطالوی زبان میں بات کر رہے تھے۔ ہم نے گھبرا کر گوویدو صاحب کو مدد کے لئے پکارا۔ وہ شاید پہلے ہی لائن پر منتظر اور موجود تھے۔ انہوں نے اطالوی زبان میں گفتگو شروع کر دی جو چھ سات منٹ جاری رہی۔ ہم اس دوران میں سانس روکے ان دونوں کی باتیں سنتے رہے۔ فون ختم کرنے کے بعد مسٹر گوویدو نے ہمیں بتایا کہ آج پی آئی اے کی کوئی فلائٹ نہیں ہے اس لئے وہاں کوئی اسٹاف ممبر موجود نہیں ہے۔ گویا چھ سات منٹ کی بات چیت کا یہ خلاصہ تھا۔ خدا جانے وہ اتنی دیر تک کیا باتیں کرتے رہے تھے۔

پی آئی اے سے مایوس ہونے کے بعد ہم نے پاکستانی سفارت خانے سے رجوع کیا اور مسٹر گوویدو سے درخواست کی کہ اگر ان کے پاس پاکستانی سفارت خانے کا نمبر ہو تو ملا دیں۔

وہ بولے "پاکستان ایمبیسی، ویری گڈ پیپل، ویری فائن کنٹری، ویری ویری گڈ" پھر پوچھنے لگے "کس سے بات کریں گے اور ہم آپ کے بارے میں کیا بتائیں؟"

ہم نے کہا "سفیر کے سوا ہر ایک سے بات کر لیں گے اور ہمارے بارے میں صرف اتنا بتائیں کہ پاکستان سے آئے ہیں۔"

مسٹر گوویدو نے فوراً پاکستانی سفارت خانے کا نمبر ملایا اور تھوڑی دیر بعد ہمیں بتایا کہ ہزایکسی لینسی سفیر کے علاوہ سفارت خانے میں کوئی موجود نہیں ہے۔ ایک ٹیلی فون آپریٹر بھی ہے۔ چاہیں تو اس سے بات کر لیں۔ ہم نے آپریٹر سے بات کرنے کی فرمائش کی۔ دوسری طرف سے انتہائی خالص اطالوی زبان میں کوئی صاحب بول رہے تھے۔ ہم نے اردو، پنجابی، ہندی، انگریزی ہر زبان میں ان سے بات کرنے کی کوشش کی۔ جواب میں انہوں نے بڑے اطمینان سے کہا "نو انگلش" ہم نے دوبارہ مسٹر گوویدو کی خدمات حاصل کیں، جنہوں نے مختصر (چند منٹ) بات چیت کے بعد ہمیں بتایا کہ سفارت خانے میں مسٹر لوبو کے سوا کوئی موجود نہیں ہے۔ وہ اطالوی ہیں کوئی اور زبان نہیں جانتے۔

"مگر وہ تو ٹیلی فون آپریٹر ہیں۔"

گوویدو صاحب بولے "وہ دراصل چوکیدار ہیں۔ کیونکہ آپریٹر موجود نہیں ہے اس

لئے یہ کام بھی کر رہے ہیں۔" ہم نے دل میں سوچا کہ ایسے ہرفن مولا شخص کے ہوتے ہوئے پاکستانی سفارتخانے میں کسی اور شخص کی ضرورت بھی کیا ہے۔ جس وقت سفیر صاحب موجود نہیں ہوتے ہوں گے غالباً سفیر کے فرائض بھی سرانجام دیتے ہوں گے۔

اس تمام قصے میں تقریباً ایک گھنٹا لگ گیا۔ اس دوران میں خان صاحب اور بٹ صاحب خاموش بیٹھے دیکھتے اور سنتے رہے۔ جب مذاکرات ختم ہو گئے تو ہم نے انہیں مختصر طور پر تمام احوال سنایا ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ "اب کیا ہو گا؟ ہمارے پاس تو پیسے بھی نہیں ہیں۔"

ہم نے کہا "دیکھو بھائی، جو ہونا ہے وہ ہو جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ ہوٹل والے ہمیں گروی رکھ لیں گے۔ تو پھر کیا ہوا۔ ہم نے سنا ہے کہ روم کی جیلیں بہت اچھی اور آرام دہ ہوتی ہیں۔"

ظاہر ہے صبر اور شکر کے سوا کیا کیا جا سکتا تھا۔ پی آئی اے اور پاکستانی سفارتخانے کی شان میں گستاخیاں کرنے کے بعد خان صاحب نے اپنا دل ٹھنڈا کر لیا۔ اب سوال یہ تھا کہ کھانے پینے کا کیا بندوبست کیا جائے۔ ہمارے پاس سرمایہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ ادھر مزید پیسوں کی فراہمی کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ خان صاحب اور بٹ صاحب کی بھوک خوب چمک گئی تھی "بھئی ابھی تو آپ لوگوں نے ہوائی جہاز میں کھایا پیا تھا۔"

وہ بولے "دراصل یہاں کا پانی بہت ہاضم ہوتا ہے نا، اس لئے بھوک لگ گئی۔"

ہم نے کہا "ابھی تو آپ لوگوں نے ایک قطرہ پانی بھی نہیں پیا ہے پھر کھانا کیسے ہضم ہو گیا؟"

کہنے لگے "آب و ہوا بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ کتنی دیر سے ہم یہاں کی ہوا کھا رہے ہیں۔ بہرحال اب کچھ کھانے کا بندوبست کرو۔"

ہم نے کچھ دیر غور کیا پھر نیچے گوویدو کے پاس گئے جو موقع پا کر ہوٹل کے شیشے صاف کرنے میں مصروف تھے۔ ہمیں دیکھ کر مسکرائے اور اسی جھاڑن سے اپنا منہ صاف کرتے ہوئے ہماری طرف آ گئے "پاکستان ایمبیسی ویری گڈ، ویری نائس۔"

ہمیں ان کی یہ بے وقت کی راگنی زہر لگ رہی تھی۔ پھر بھی ہم نے مسکراتے ہوئے کہا "مسٹر گوویدو! ہمیں اچھی سی چائے پینی ہے۔ یہ بتائیے کہ ہمیں بل ادا کرنا ہو گا

یا سائین کرنا ہوں گے؟؟"

وہ ہنس کر بولے "نو پرابلم' یو سائین' پے وی بل دھین گو آؤٹ" (ترجمہ' آپ دستخط کر دیں' جب رخصت ہونے لگیں تو بل کی ادائیگی کر دیں۔"

چلئے' یہ پرابلم تو حل ہو گئی۔ ہم نے فوراً چائے اور بریڈ کا آرڈر دیا۔ زیادہ اخراجات ہم احتیاطاً" نہیں کرنا چاہتے تھے۔ خدا جانے ہمیں ڈالر ملیں یا نہ ملیں' ملیں گے بھی تو کتنے؟ ہم ہوٹل کے خوبصورت سے ریسٹورنٹ میں جا کر بیٹھ گئے۔ چھوٹا سا ہال تھا مگر بے حد خوبصورتی سے سجا ہوا۔ دیواروں پر لکڑی کے پینل تھے اور ہر طرف آئینے لگے ہوئے تھے۔ اچھی شکل کے گاہکوں کے لئے یہ بہت مناسب جگہ تھی۔ کرسیاں بدنما تھیں۔ مگر بہت آرام دہ۔ ہم نے کہا "دیکھو دوستو' چائے زیادہ نہ پینا۔ ہمارے پاس زیادہ پیسوں کا انتظام نہیں ہے۔"

اتنی دیر میں مسٹر گوویدو جھٹ پٹ چائے لے کر آ گئے تھے۔ چائے کے ساتھ نہایت خوبصورت گول گول بریڈ تھی۔ مکھن اور جام وغیرہ بھی تھا مگر دودھ کہیں نظر نہ آیا۔ ہم نے مسٹر گوویدو کو پکارا اور بتایا کہ وہ دودھ لانا بھول گئے ہیں۔ وہ بولے "مگر آپ نے دودھ کا آرڈر تو نہیں دیا۔"

ہم نے کہا "مگر چائے کے لئے تو کہا تھا۔"

وہ بولے "چائے تو آپ کے سامنے رکھی ہے۔"

"مگر دودھ کی بھی ضرورت ہے۔"

انہوں نے ہم سب کو بغور دیکھا اور پوچھنے لگے "آپ میں سے دودھ کون پیتا ہے؟"

غصہ تو بہت آیا مگر پردیس کا معاملہ تھا اور پھر ہم پیسوں کے بغیر ان کے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس لئے غصہ پی گئے۔ بہر حال ہم نے قصہ مختصر کرنے کے لئے ان سے کہا کہ تھوڑا سا دودھ بھی لے آئیں۔ وہ منہ بناتے ہوئے چلے گئے۔ یہ ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ یورپ میں چائے دودھ کے بغیر پی جاتی ہے۔ صرف انگلستان ایسا ملک ہے جہاں چائے میں دودھ ملایا جاتا ہے اور کسی جگہ اس کا رواج نہیں ہے۔ بریڈ پر مکھن اور جام لگا کر کھایا تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ مکھن اور جام اپنے ملک میں بھی کھاتے تھے مگر

اس کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ خان صاحب کا خیال تھا کہ ہم نے کیونکہ زندگی میں پہلی بار خالص چیز کھائی ہے اس لئے لطف زیادہ آ رہا ہے۔ سوچا تو ان کی بات میں معقولیت بھی نظر آئی۔ چائے خاصی اچھی تھی۔ گوویدو صاحب ٹھنڈا دودھ لے کر آئے تھے مگر وہ بھی لطف دے گیا۔ ہم نے کہا "خوب پیٹ بھر کر کھا لو۔ خدا جانے رات کا کھانا ملے یا نہ ملے۔"

چائے سے فارغ ہو کر لاؤنج میں آئے تو وہاں خاصی چہل پہل نظر آئی۔ کچھ تو مسافر تھے جن میں خواتین کی تعداد زیادہ تھی' اور سب کی سب یورپین تھیں۔ شکل و صورت بھی اچھی تھی اس وقت روم میں موسم گرما تھا اس لئے لباس نہایت مہین اور مختصر تھے۔ ایک صاحبہ نے کالی جالی کا بلاؤز پہن رکھا تھا جس کے اندر کچھ اور نہ تھا اگر وہ بلاؤز کے بغیر ہوتیں تو شاید اتنی توجہ کا مرکز نہ بنتیں۔ بیشتر مردانہ نگاہیں ان کے جسم پر مرکوز تھیں مگر وہ اس ہنگامہ خیزی سے بے پروا تھیں۔ ادھر ہوٹل کے باورچی خانے میں بھی چند چہرے نظر آ رہے تھے جن میں دو مرد اور ایک خاتون تھیں۔ ہماری نظر پڑی تو مرد حضرات فوراً اوٹ میں ہو گئے۔ ہم نے کوئی دھیان نہ دیا مگر کچھ دیر بعد بٹ صاحب نے ہمارے کان میں کہا کہ ایئرپورٹ پر ہمیں جو لوگ ملے تھے وہ دونوں باورچی خانے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا مگر بعد میں یہ عقدہ کھلا کہ ایئرپورٹ سے لے کر ٹیکسی اور ہوٹل تک سب کے سب ایک ہی خاندان کے رکن تھے اور مسٹر گوویدو اس خاندان کے سربراہ تھے۔

ہمارا پروگرام تھا' کہ باہر نکل کر روم کی سیر کریں۔ کچھ پرانی عمارتوں کے نظارے دیکھیں مگر جب تک باریک بلاؤز پوش ہوٹل میں موجود رہیں ہمارے ساتھیوں نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ اوپر کمرے میں چلی گئیں تو خان صاحب نے ٹھنڈی اور لمبی آہ بھری اور کہا "اب کہو کہاں جانا ہے؟؟"

بٹ صاحب کو اچانک پیاس لگنے لگی تھی۔ انہوں نے مسٹر گوویدو سے پانی کی درخواست کی تو وہ حیران ہو کر ان کی صورت دیکھنے لگے "پانی؟ وہ کس لئے؟ کیا آپ نے اوپر کمرے میں اپنا منہ نہیں دھویا تھا؟؟"

ہم نے کہا "انہیں پینے کے لئے پانی چاہئے۔"

"پانی پینے کے لئے!" وہ پریشان ہو گئے۔ "کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟"

ہوٹل کے لاؤنج میں موجود دوسرے خواتین و حضرات بھی یہ گفتگو سن کر ہم لوگوں کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ پینے کا پانی ہوٹل میں موجود نہ تھا۔ ویسے ہر قسم کا مشروب موجود تھا۔ پانی وہ لوگ چائے بنانے کے لئے' منہ ہاتھ دھونے کے لئے اور کبھی کبھار نہانے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ طہارت کے سلسلے میں وہ ڈرائی کلین کے قائل تھے۔ مسٹر گوویدو سمیت سبھی نے بٹ صاحب کو پانی پینے سے روکا اور دوسری چیزیں پینے کا مشورہ دیا۔ مگر جب وہ باز نہ آئے تو مسٹر گوویدو کے اشارے پر ایک البیلی سی خوبصورت لڑکی ایک بوتل میں پانی لے کر حاضر ہو گئیں۔ بوتل بھی شراب ہی کی تھی۔ مگر اس سے زیادہ نشیلی ساقی گری کرنے والی خاتون تھیں۔ سفید بلاؤز اور سیاہ اسکرٹ میں ان کا سرخ و سفید رنگ دمک رہا تھا۔ چہرہ آفتاب اور باقی جسم آتش فشاں سمجھ لیجئے

ہمیں علم ہی نہیں تھا کہ مسٹر گوویدو نے اس ہوٹل میں کیسے کیسے گوہر آبدار اکٹھے کر رکھے تھے۔ جتنی دیر بٹ صاحب پانی پیتے رہے ان کی نگاہیں ساقی پر اور ساقی کی حیرت زدہ نظریں بٹ صاحب پر جمی رہیں۔ بٹ صاحب غٹاغٹ پوری بوتل کا پانی صاف کر گئے تو خان صاحب کو بھی پیاس ستانے لگی۔ انہوں نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں درخواست کی کہ انہیں بھی پانی کی ضرورت ہے۔ جب وہ بوتل لے کر چلی گئی تو بٹ صاحب نے یاد دلایا "اس کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔"

ہم نے کہا "وہ انگریزی بالکل نہیں جانتی۔"

بولے "یہ تو اور بھی اچھی بات ہے کافی دیر تک باتیں کرنے کے لئے اچھا بہانہ ہے۔"

واقعی ترکیب اچھی تھی۔ اب وہ ایک اور بوتل بھر کر واپس آئی تو خان صاحب نے پوچھا "وہاٹ از یور نیم؟"

وہ حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگی۔ خان صاحب نے مختلف انداز میں اور مختلف زبانوں میں اس کا نام پوچھنے کی کوشش کی۔ وہ بے چاری یہ سمجھ رہی تھی کہ شاید ہمیں کسی اور چیز کی ضرورت ہے۔ دوڑی دوڑی گئی اور مسٹر گوویدو کو بلا لائی۔ مسٹر گوویدو اب

رات کے ڈنر کے موقعے پر موسیقی بجانے کے خیال سے گٹار ہاتھ میں لئے ہوئے تھے۔ ہم نے سوچا یا اللہ! یہ شخص میوزیشن بھی ہے؟ وہ کون سا کام ہے جو یہ نہیں کرتا؟

مسٹر گوویدو نے آتے ہی پوچھا کہ معاملہ کیا ہے آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟

ہم نے کہا "ہم دراصل اس دوشیزہ کا نام پوچھنا چاہتے ہیں۔"

وہ ہنس پڑے "اوہ! ویری فائن ویری نائس۔" پھر انہوں نے لڑکی کو سارا معاملہ سمجھایا وہ بھی ہنس پڑی۔ خاصی دلکش مسکراہٹ تھی۔ گویا دوسری ہر چیز کے مانند مسکراہٹ بھی دلکش تھی۔ پھر مسٹر گوویدو نے بتایا کہ اس کا نام سلوی ہے اور یہ میری بیٹی ہے۔ ابھی اس کی عمر صرف اٹھارہ سال ہے۔ اگلے سال میں اسے ایکٹریس بنانے کے لئے اسٹوڈیو روما لے جاؤں گا۔

ہم سب نے دوبارہ لڑکی کا جائزہ لیا۔ خان صاحب نے تو اسے فوراً پاس کر دیا۔ بٹ صاحب نے تھوڑے تامل کے بعد کہا کہ چل جائے گی۔

خان صاحب نے مسٹر گوویدو سے کہا کہ ہم لوگ اپنے ملک میں اٹلی کی فلمیں خوب دیکھتے ہیں اور آپ کے ملک کی ہیروئنوں کے پرستار ہیں۔ بہت خوبصورت ہوتی ہیں۔

مسٹر گوویدو کی باچھیں کھل گئیں۔ کہنے لگے "اب ذرا سلوی کی طرف غور سے دیکھیں اور بتائیں کہ اس میں کس چیز کی کمی ہے۔"

ان کے کہنے پر ہم نے ایک بار پھر سلوی کو غور سے دیکھنا شروع کر دیا بلکہ یوں کہئے کہ گھورنا شروع کر دیا۔ وہ بھی بہت بے باکی سے کھڑی مسکراتی رہی اور پوز بناتی رہی۔ خیر ہمیں تو اس کا ہر انداز پسند آ رہا تھا۔ خوبصورت لڑکی جو تھی۔ مسٹر گوویدو کہنے لگے "دیکھا آپ نے؟ کس چیز کی کمی ہے اس میں' چہرہ کتنا اچھا ہے' ہونٹ کس قدر پیارے ہیں' آنکھیں کتنی نشیلی ہیں اور فگر کس قدر قیامت خیز ہیں۔ یہ صوفیہ لورین وغیرہ تو اس کے سامنے پانی بھریں گے۔ ذرا غور سے دیکھئے کیسا' خوبصورت جسم ہے اس کا؟ ان کے اصرار پر ہم سب نے پھر سلوی کو غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ دونوں ہمیں یوں دیکھ رہے تھے جیسے ہماری منظوری ملتے ہی لڑکی کو فوراً ہیروئن کا چانس مل جائے گا۔

خان صاحب بولے "لڑکی تو اچھی ہے مگر سیکس کی کمی ہے۔"

سلوی کے دریافت کرنے پر مسٹر گوویدو نے اسے خان صاحب کی رائے بتائی تو غصے

کے مارے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے اطالوی زبان میں اس قدر طویل اور مسلسل تقریر جھاڑی کہ ہم سب واقعی اس کا منہ تکتے رہ گئے۔ مسٹر گوویدو وقفے وقفے سے اسے سمجھاتے جا رہے تھے۔ شاید اس کا غصہ کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سلوی بہت دیر تک صلواتیں سناتی رہی اور اس دوران میں اپنے جسم کو جھٹکے بھی دیتی رہی۔ جب خدا خدا کر کے وہ خاموش ہوئی تو مسٹر گوویدو نے اس کی تقریر کا خلاصہ بیان کیا وہ کہہ رہی تھی کہ میں صوفیہ لورین سے زیادہ سیکسی ہوں۔ جدھر سے گزرتی ہوں' لوگ سیٹیاں بجاتے اور آہیں بھرتے ہیں۔ بہت سے تو موقع پا کر چٹکیاں بھی بھر لیتے ہیں۔ کتنے ہی لوگ ہیں۔ جو میرے لئے ہر چیز قربان کرنے کو تیار ہیں فی الحال میں اور لباس میں ہوں۔ جس وقت مناسب لباس پہن کر آؤں گی تو آپ سب کی سانسیں رک جائیں گی۔

مناسب لباس سے نہ جانے اس کی کیا مراد تھی۔ اس کی جسم کی حرکتیں اور زبان کی کاٹ دیکھ کر خان صاحب کی پیاس اور زیادہ چمک اٹھی اور وہ پانی کی پوری بوتل پی گئے۔ مسٹر گوویدو کو شام کی محفل موسیقی کے لئے تیاری کرنی تھی۔ اس لئے وہ معذرت کر کے چلے گئے۔ سلوی کچھ دیر تو اطالوی زبان میں ہم سے کچھ کہتی رہی اور اپنے جسم کو جھٹکے دے دے کر اپنے ہاتھوں سے سمجھاتی رہی' پھر وہ چلی گئی۔ یوں لگا جیسے روٹھ گئے دن بہار کے۔ خان صاحب نے ایک آہ سرد بھری اور بولے "بڑی غلطی ہو گئی۔ تھوڑی سی اٹیلین سیکھ کر آنا چاہئے تھا۔"

ہم نے کہا "تھوڑے دن یہاں رہو گے تو خود بخود سیکھ جاؤ گے۔"

ابھی شام کے پانچ چھ بجے تھے۔ ہم لوگوں نے شہر کی سیر کا ارادہ کیا اور ہوٹل سے باہر نکلے۔ بٹ صاحب جو کافی دیر سے چپ تھے اچانک بول پڑے "کس قدر بے شرم باپ ہے اپنی بیٹی کے بارے میں کتنی بے حیائی سے باتیں کرتا ہے۔"

خان صاحب نے کہا "بھئی ان کی تہذیب ہی ایسی ہے۔ یہ لوگ ان چیزوں کو برا نہیں سمجھتے۔ اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے۔ ان کا اور ہمارا معاشرہ مختلف ہے۔"

"بہت بے ہودہ معاشرہ ہے" بٹ صاحب نے ناراضی کا اظہار کیا۔

"مگر اس میں دلکشی کتنی ہے" خان صاحب نے ریمارک پاس کیا۔ "یار ہم تو غلط جگہ پیدا ہو گئے۔"

ہوٹل سے باہر نکلے تو روم کا شہر بازو پھیلائے ہمارا منتظر تھا۔ خوبصورت صاف ستھری دکانیں' ریسٹورنٹ اور چائے خانے' فٹ پاتھ پر ریسٹورنٹ ہم نے پہلی بار روم میں ہی دیکھے اور یہ طریقہ ہمیں بہت پسند آیا۔ سڑک کے کنارے فٹ پاتھوں پر چھوٹی چھوٹی کرسیاں اور میزیں رکھ کر لوگ بیٹھے سیر دیکھتے رہتے ہیں۔ اور چائے کافی یا دوسرے مشروبات سے بھی لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ وہ گزرنے والوں کا تماشہ دیکھتے ہیں اور گزرنے والے ان کا تماشا دیکھتے ہیں۔ طرفین کی دل بستگی اور دلداری کا سامان ہے۔ ان ریسٹورانوں اور کافی خانوں میں چیزیں بھی مہنگی نہیں ہوتیں۔ ایک آدھ ویٹریس ہوتی ہے۔ جو سارے گاہکوں کو بھگتاتی ہے۔ عام طور پر ہم نے جس ویٹریس کو بھی دیکھا نہایت بھرپور اور بے باک ہی پایا۔ فٹ پاتھ کے نزدیک سے گزرتے ہوئے جب ویٹریسوں کا بے بہا حسن دیکھا تو خاں صاحب کو چائے کی طلب پیدا ہونے لگی مگر ظاہر ہے کہ ہمارے مالی حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

ہم روم کے جس حصے میں تھے یہ قدیم شہر کا حصہ تھا۔ سڑکیں، گلیاں اور بازار تنگ اور پرانے قسم کے تھے۔ آس پاس بے شمار گرجا گھر اور دوسری تاریخی عمارتیں کھڑی تھیں۔ روم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جہاں سے ایک اینٹ اٹھاؤ وہیں کوئی تاریخی یادگار مل جائے گی۔ سڑکیں اور گلیاں تارکول کی بھی تھیں اور پتھر کی بھی۔ پتھر کے ٹکڑوں کو جوڑ جوڑ کر بنائی ہوئی سڑک ہم نے پہلی بار روم ہی میں دیکھی۔ غالباً" پرانے زمانے میں پتھروں کی سڑکیں بنائی جاتی ہوں گی۔ اس لئے آج کل بھی وہی رواج باقی ہے۔ ہمیں کچھ خبر نہیں تھی کہ ہمیں کس طرف جانا ہے اور کس سڑک یا علاقے کا کیا نام ہے۔ احتیاطاً" ہم نے ہوٹل سے ایک کارڈ اٹھا لیا تھا کہ جب ضرورت پڑی کسی کو بھی دکھا کر پتا دریافت کر لیں گے۔ بس جدھر کو منہ اٹھا چل پڑے۔ خاصی رونق والی جگہ تھی۔ ہوٹل والی سڑک آگے چل کر ذرا کشادہ سڑک سے جا ملتی تھی۔ اس سڑک پر ٹریفک اور زیادہ تھا۔ روم کے کار والوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ سروں سے کفن باندھ کر گھر سے نکلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نہ انہیں اپنی جان کی پروا ہوتی ہے، نہ دوسروں کی۔ اس بے دردی سے کاریں دوڑاتے ہیں کہ جان بچانی دشوار ہے۔ ٹریفک کے اصولوں کی پابندی کے معاملے میں یہ لوگ ہماری طرح ہیں۔ سگنل کی روشنی کوئی بھی رنگ دکھائے یہ کار دوڑاتے ہوئے تیزی سے نکل جاتے ہیں۔ اور ٹریفک کا سپاہی بھی شانے اچکانے کے سوا کچھ اور نہیں کرتا۔ فٹ پاتھوں پر جہاں ریسٹورنٹ نہیں ہوتے وہاں کاریں پارک ہوتی ہیں۔ اگر کہیں فٹ پاتھ خالی ہے تو کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ ان فٹ پاتھوں پر کار والے بڑی بے تکلفی سے کاریں چڑھا دیتے ہیں۔ تیز رفتاری کا یہ عالم ہے کہ لگتا ہے ہر شخص دوسرے سے ریس لگا رہا ہے۔ کسی کار کو دیکھ کر یہ اندازہ نہیں ہوتا ہے کہ یہ آ رہی ہے یا جا رہی ہے۔ صرف ژوں ژوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اور کوئی چیز آندھی طوفان کی طرح آپ کے برابر سے گزر جاتی ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اس قیامت خیز ٹریفک سے جاں بر ہو کر صحیح سلامت اپنی منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔

بعد میں جب یورپ گئے تو وہاں دیکھا کہ سب سے زیادہ اہمیت اور اولیت پیدل چلنے والوں کو دی جاتی ہے۔ کسی سڑک پر خواہ کتنا ہی تیز رفتار ٹریفک جاری ہو، جوں ہی کوئی راہ گیر زیبرا کراسنگ پر قدم رکھتا ہے دونوں طرف کا ٹریفک ایک دم رک جاتا ہے۔ اب راہ گیر کی شان ملاحظہ فرمائیے۔ دیکھ رہے ہیں کہ سڑک پر دونوں طرف کاروں والے منتظر ہیں اور بے چینی سے پیدل چلنے والے کے گزرنے کا انتظار کر رہے ہیں مگر کیا مجال جو یہ سڑک عبور کرنے کے معاملے میں کوئی تیزی یا پھرتی دکھائیں۔ نہایت اطمینان سے ٹہلتے ہوئے سڑک عبور کرتے ہیں۔ اس دوران میں کاروں والے صبر و شکر سے بیٹھے رہتے ہیں مگر یہ تو یورپ والوں کا دستور ہے۔ اٹلی اگرچہ یورپ ہی میں واقع ہے مگر اس ملک اور قوم کی بہت سی عادتیں اور رسم و رواج یورپ والوں سے مختلف ہیں۔ بعض معاملات میں تو یہ بالکل ہماری طرح لگتے ہیں چنانچہ ٹریفک کے معاملے میں بھی یہ ہمارے بھائی بند ہیں بلکہ بڑے بھائی کہ لیجئے۔

دوسری باتوں کا تذکرہ تو مناسب موقع پر آئے گا۔ ٹریفک کے بارے میں ان کی بعض عادتوں کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ سڑکوں پر نصب ٹریفک سگنل کی بے توقیری ہماری شہروں میں بھی ہوتی ہے مگر روم والے بھی کچھ کم نہیں ہیں حالانکہ وہاں کی پولیس خاصی مستعد ہے۔ اس کے باوجود اکثر ٹریفک لائٹس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا۔ یک طرفہ ٹریفک والی سڑک پر دوسری طرف سے بھی داخل ہو جاتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان لوگوں میں بھی ہماری طرح صبر کا مادہ نہیں ہے۔ دیکھ رہے ہیں کہ تنگ سے راستے پر دوسری جانب سے بھی گاڑی آ رہی ہے، مگر رکنے کا نام نہیں لیں گے۔ اپنی کار بھی سامنے لا کر کھڑی کر دیں گے۔ سامنے سے آتی ہوئی کار کو راستہ دینا غالباً" یہ اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ فٹ پاتھ پر کاریں کھڑی کرنا بلکہ فٹ پاتھ پر کاریں بھگانا بھی روم والوں کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ گویا اس معاملے میں وہ ہم سے بڑھ گئے ہیں۔ پیدل چلنے والوں پر ہم پاکستانی بھی رحم نہیں کھاتے، مگر روم کے کار والوں کو تو جیسے پیدل راہ گیروں سے دشمنی ہے۔ کوئی شخص اگر سڑک عبور کرنا چاہتا ہے۔ تو اپنے رسک پر ایسا کر سکتا ہے۔ کار والے اس کا مطلق لحاظ نہیں کریں گے بلکہ اس قدر تیزی سے کار لے کر گزریں گے کہ اگر پیدل چلنے والا پھرتیلا نہ ہو تو وہیں اللہ کو پیارا ہو جائے۔ ہم لوگ بھی جب ایک سڑک کو عبور کرنے کی غرض سے زیبرا کراسنگ پر پہنچے تو ہمارا خیال تھا کہ کار والے ہمارے احترام میں رک جائیں گے۔ یورپ کے بارے میں ہم نے ایسا ہی پڑھا اور سنا تھا، مگر توبہ کیجئے۔ ایک کار والی خاتون اس تیزی سے ہماری طرف بڑھیں کہ اگر ہم چند

قلابازیاں نہ کھاتے تو شاید یہ سفرنامہ لکھنے کے لئے زندہ نہ رہتے۔ جب ہم قلابازیاں کھا کر سڑک کے دوسرے کنارے پر کھڑے ہوئے تو خان صاحب نے ہمیں توصیفی نظروں سے دیکھا اور بولے "معلوم ہوتا ہے کرکٹ کھیلتے رہے ہو اور بہت اچھے فیلڈر بھی رہے ہو۔"

ہم نے پوچھا "آپ دونوں کا کیا حال ہے زندہ ہیں یا فوت ہو گئے؟"

بولے "ہم دونوں نے تو کار کو آتا ہوا دیکھ کر پہلے ہی دوڑ لگا دی تھی۔ ویسے آپ کو شاید علم نہیں ہے کہ میں کالج اور اسکول کے زمانے میں دوڑوں کے مقابلوں میں حصہ لیا کرتا تھا۔" گویا ہم لوگوں کا اسپورٹس میں ہونا ہماری زندگی بچانے کا سبب بن گیا۔ ورنہ روم والوں نے تو ہمارا قلع قمع کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس کے بعد سے یہ معمول ہو گیا کہ ہم سڑک عبور کرنے کے لئے زیبرا کراسنگ کی ضرورت سے مبرا ہو گئے۔ جہاں سے جی چاہتا سڑک عبور کر لیتے۔ دیکھئے نا اگر آپ کو دوڑ کر ہی سڑک عبور کرنی ہے اور اپنے ذاتی رسک پر عبور کرنی ہے: تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

یعنی پھر زیبرا کراسنگ کی پابندی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

فٹ پاتھوں اور تنگ سڑکوں اور گلیوں سے گزرتے ہوئے ہم ایک بڑے سے پلازہ میں پہنچ گئے۔ اس کے آس پاس ایک گول دائرے میں چوڑی سی سڑک تھی اور اس کے ساتھ دکانیں درمیان کے باغ میں خوب سبزہ تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ رونق بھی خوب تھی۔

روم میں عمارتیں عام طور پر پرانی وضع کی نظر آتی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان لوگوں نے عمارتوں کی بیرونی شکل و صورت تو وہی رکھی ہے جو پہلے تھی۔ مگر اندرونی حصے میں جدید ترین تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں کر لی ہیں۔ مثلاً یہ پلازا خدا جانے کتنی صدیوں پہلے تعمیر کیا ہو گا۔ اب یہ جدید شاپنگ سینٹر تھا

ہر قسم کی دکانیں' شو روم اور شاپنگ سینٹر یہاں موجود تھے۔ یہاں تک کہ انہی قدیم سی نظر آنے والی عمارتوں کے اندر جدید ترین سینما گھر اور نائٹ کلب بھی تھے۔ روم کے لوگوں کی ایک اور خوبی جو ہم لوگوں سے ملتی جلتی ہے ان کا شوق آوارگی اور سیر بازی ہے۔ بڑے اطمینان سے گھومتے پھرتے ہیں۔ آئس کریم کی دکانیں قدم قدم پر ہیں۔ اس وقت تک ہمارے لاہور میں کون آئس کریم کی صرف ایک ہی دکان تھی۔ مگر اس پلازہ

تھا بہت سی بڑی دکانوں کے سامنے وسیع و کشادہ برآمدے میں کون آئس کریم فروخت کرنے والیاں موجود تھیں۔ چنانچہ جسے دیکھئے ہاتھ میں کون آئس کریم لئے دکانوں میں جھانک رہا ہے۔ اور بے فکری سے گھوم رہا ہے۔ ہمیں تو ہر قسم کی آئس کریم واقعی پسند ہے لیکن خان صاحب اور بٹ صاحب نے جب حسین و طرحدار لڑکیوں اور خواتین کو آئس کریم فروخت کرتے ہوئے دیکھا تو فوراً اعلان کر دیا کہ آئس کریم ہماری کمزوری ہے۔ مشکل یہ تھی کہ ہمارے پاس محض زہر کھانے کو پیسے رہ گئے تھے اس لئے آئس کریم کھانے سے پرہیز ہی بہتر تھا۔ پھر بھی وہ دونوں حضرات اور خود ہم بھی ہر آئس کریم فروش کے پاس جا کر کھڑے ہو جاتے اور پوچھتے "آپ کے پاس کون سا فلیور ہے" وہ جو بھی بتاتیں ہم اس کے علاوہ کسی اور فلیور کے بارے میں دریافت کرتے۔ وہ مسکرا کر اور شانے ہلا کر "سوری" کہہ دیتیں۔ شانے ہلانا اٹلی والوں کا خاص انداز ہے۔ بعد میں دیکھا کہ فرانس کے لوگ بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ بہت اچھی اور خوبصورت ادا ہے۔ خاص طور پر جب صاحب جمال عورتیں شانے ہلاتی ہیں۔ تو اٹلی والوں کی اس عادت پر قربان ہونے کو جی چاہتا ہے۔

اس پلازہ میں ہم بھی دکانوں کے اندر باہر چکر لگاتے رہے۔ سامان تو خوبصورت اور انوکھا تھا ہی۔ بیچنے والیاں بھی کچھ کم نہ تھیں۔ یورپ میں "ونڈو شاپنگ" ایک مخصوص عادت ہے یعنی لوگ اشیاء خریدنے کے بجائے کھڑکیوں میں سجی ہوئی چیزوں کو دیکھ دیکھ کر جی خوش کرتے رہتے ہیں۔ ہم بھی ایسا ہی کرتے رہے بعد میں جب ہم نے کہا کہ بھئی یہاں مال و اسباب تو بہت اچھا ہے۔ مگر قیمتیں بہت زیادہ ہیں' تو خان صاحب سادگی سے کہنے لگے "مجھے تو معلوم نہیں نہ میں نے مال و اسباب دیکھا نہ ان کی قیمتیں"

ہم نے پوچھا "تو پھر ہر دکان میں جھانک کر اور اندر جا کر آپ کیا دیکھتے رہے؟"

بولے "سیلز گرلز' سامان تو ہر جگہ دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ مگر ایسی خوبصورت سامان فروش لڑکیاں روز روز دیکھنے کو نہیں ملتیں"

گویا وہ تمام وقت سیلز گرلز کی ونڈو شاپنگ کرتے رہے تھے۔ خیر آئیڈیا برا نہیں ہے۔ اس پلازہ میں آئس کریم کی دکانوں کے علاوہ اور بھی بہت سے "کھوکھے" والے اور والیاں تھیں۔ سب سے پہلے تو ہم یہ دیکھ کر حیران تھے کہ دکانداروں کی اکثریت خواتین پر

مشتمل تھی۔ لگتا ہے بیچنے کا شعبہ اٹلی والوں نے عورتوں کے سپرد کر دیا ہے۔ پھر جب
یورپ اور امریکا دیکھا تو انکشاف ہوا کہ اس کام میں ہر جگہ عورتیں زیادہ ہیں۔ مرد
کے شعبے میں بہت کم نظر آتے ہیں۔ جوں جوں روم ہماری آنکھوں کے سامنے بے نقاب
ہو رہا تھا۔ ویسے ویسے اس کی خصوصیات ہم پر منکشف ہو رہی تھیں۔ یہاں دیکھا
خوانچہ فروش، ٹھیلے والے اور تھڑے والے بھی موجود ہیں۔ جہاں ذرا سی خالی جگہ دیکھی
ایک دلربا نے اپنا خوانچہ لگا دیا۔ پتا چلا کہ پھلیاں بیچ رہی ہیں۔ ہم بھی ان کے پاس جا
کھڑے ہو گئے۔ یہ جاننے کے لئے کہ کس قسم کی پھلیاں ہیں مگر پھلیوں سے زیادہ پھلی
فروش پر ہماری توجہ تھی۔ اس زمانے میں اٹلی کی ایکٹریسوں نے فلموں میں جو بے باک
اور نظارہ بخش لباس پہننے شروع کئے تھے، اکثر خواتین بھی ان ہی میں ملبوس نظر آتی تھیں۔
اس قسم کے لباس کی ایک خوبصورتی یہ ہے کہ لباس سے زیادہ لباس پہننے والی پر نظر پڑتی
ہے۔ اور یہ لباس ان کے جسم کی رعنائیوں کو ڈھانپنے کے بجائے انہیں بڑی خوبصورتی
سے آشکارا کرنے کا فریضہ ادا کرتا ہے۔ چنانچہ یہ "پھلی فروش" خوانچے والی بھی کسی فلم
کا مجسم پوسٹر بنی کھڑی تھی۔ ایک مردانہ گلے کی تنگ سی قمیص تھی جس کے بٹن خدا
جانے درزی نے لگائے ہی کیوں تھے کیونکہ اس نے بیشتر بٹن کھول رکھے تھے۔ قمیص کا
رنگ عنابی تھا اور اس کے جسم کی رنگت گلابی اور سفید تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کا مطلب
مقصد پورا ہو رہا تھا۔ جسم کے زیریں حصے کو اس نے منی اسکرٹ کے ذریعے نمایاں کرنے
کی کوشش کی تھی۔ اور اس میں بہت کامیاب تھی۔ ان دنوں یورپ بھر میں منی اسکرٹ
کا رواج تھا۔ یہ کہنے کو تو اسکرٹ ہے لیکن اسے آپ انتہائی مختصر جانگیا کہہ سکتے ہیں۔
کمر اور کولہوں پر سے چست ہوتی ہے اور اس کی لمبائی گھٹنوں سے کبھی کبھی تو اتنی اونچی
ہوتی ہے کہ آدھی رانیں بھی کھلی رہتی ہیں۔ خان صاحب ان لباسوں اور ان میں ملبوس
ہوئی خواتین کو دیکھ دیکھ کر "لاحول" پڑھ رہے تھے۔

پھلی فروش کے پاس جا کر بھی انہوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کا سر سے پاؤں
تک جائزہ لیا اور کہیں کہیں ان کی نظریں اٹک کر رہ گئیں۔ ساتھ ہی ان کی زبان سے
"لاحول ولا قوت" کے الفاظ نکل گئے۔ ہم نے کہا "خان صاحب! آپ لاحول کس پر پڑھ
رہے ہیں؟"

بولے "یہ لباس بنانے والے پر، بے چاری پہننے والی تو بے قصور ہے۔"

پھلیوں والی خاتون نے ایک پلاسٹک کی ڈوری کے ذریعے اپنا "خوانچہ" گلے میں لٹکا
رکھا تھا مگر یہ خوانچہ اس کے جسمانی اور نسوانی خطوط کی نمائش کی راہ میں بالکل حائل
نہیں تھا بلکہ شاید کسی قدر اضافے کا سبب تھا۔

بٹ صاحب نے سرگوشی کی "اس کا نام تو پوچھو۔"

ہم نے انہیں گھور کر دیکھا۔ ظاہر ہے۔ کسی دکاندار کے پاس جا کر سب سے پہلے
اس کا نام پوچھنے کی کوئی تک نہیں تھی۔ ہم نے خاتون سے پھلیوں کے بارے میں
معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنی زبان میں بہت میٹھے انداز میں کچھ
بیان کیا جو ہماری سمجھ میں نہیں آیا پھر انہوں نے دست حنائی میں چند پھلیاں اٹھا کر ہماری
طرف بڑھائیں۔ غالباً" ان کا مطلب تھا کہ خود ہی چکھ کر دیکھو کہ یہ کیا چیز ہے اور اس کا
مزہ کیا ہے؟ ہم نے ہاتھ آگے بڑھایا مگر اس سے پہلے خان صاحب ساری پھلیاں اس کی
ہتھیلی پر سے اٹھا چکے تھے۔ ہمارے شکایتی انداز پر انہوں نے ازراہ کرم ایک ایک پھلی
بٹ صاحب اور ہماری نذر کی۔ چکھی تو کچھ مونگ پھلی جیسا مزہ تھا۔ حالانکہ صورت شکل
قدرے مختلف تھی۔ "خوانچہ فروش" نے مسکراتے ہوئے یہ اطلاع دی کہ ان پر نمک
مرچ اور مصالحہ بھی چھڑکا جاتا ہے، پھر اس نے ایک کاغذ اٹھا کر اس کی پونگی سی بنائی اور
اس کے اندر پھلیاں ڈال دیں۔ لیجئے پیکنگ تیار ہو گئی۔ ہمارے چنا جور گرم والے اور
تلی ہوئی دال بیچنے والے جس طرح کی پڑیاں بناتے ہیں، یہ ان سے مختلف نہیں تھی۔ یہ
سب کام کرنے کے بعد انہوں نے اپنی شربتی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھا اور آنکھوں
سے اشارہ کیا کہ کیا ارادہ ہے؟

خان صاحب بولے "کم از کم تین پڑیاں تو فوراً خرید لینی چاہئیں۔"

ہم نے کہا "خان صاحب! آپ جانتے ہیں کہ ہمارے مالی حالات سخت نازک ہیں۔
ہمیں ایک ایک پائی حفاظت سے رکھنے کی ضرورت ہے۔" پھر ہم نے خاتون سے پوچھا
"ہاؤ مچ؟"

ہمیں تجربے نے بتا دیا تھا کہ کسی بھی ملک کے دکاندار چاہے آپ کی گفتگو کا ایک
لفظ بھی نہ سمجھیں مگر "ہاؤ مچ" کا مطلب سب سمجھتے ہیں۔

خاتون نے اپنا گورا گورا ہاتھ اٹھا کر شہادت کی انگلی کو حرکت دی اور بولیں "ہنڈرید لیرا اونلی۔"

خان صاحب بولے "یار اتنی منت کر رہی ہے تین پڑیاں خرید لو نا ورنہ پاکستانیوں کے متعلق کیا سوچے گی؟"

ہم نے کہا "فضول باتوں کی ضرورت نہیں ہے اول تو وہ منت نہیں کر رہی۔ دوسرے اس کو کیا معلوم کہ ہم پاکستانی ہیں؟ ہمارے چہرے پر تو ہمارا پاسپورٹ چسپاں نہیں ہے۔"

بٹ صاحب اتنی دیر تک سرتاپا خوانچہ فروش کے ایک ایک چپے کا جائزہ لے چکے تھے۔ بولے "دیکھئے' اس سے آپ کو کچھ ضرور خریدنا پڑے گا۔ ورنہ میں اپنی گھڑی بیچ دوں گا۔"

ان کی اس دھمکی کے پیش نظر ہم نے خاتون سے کہا "ون"

اس نے ایک پڑیا ہمارے حوالے کی۔ ہم نے سولیرا کا ایک سکہ جو دیکھنے میں روپے کی شکل کا تھا ان کے دست حنائی پر رکھ دیا وہاں سے رخصت ہونے کے بعد بھی ہم لوگ مڑ مڑ کر اسے دیکھتے رہے۔ اور وہ ستمگر بھی مسکراتی اور ہاتھ ہلاتی رہی۔ خان صاحب کہنے لگے "کتنی خوش اخلاق ہے۔ اصل دکانداری یہ ہوتی ہے۔ دیکھو ابھی تک ہاتھ ہلا رہی ہے۔"

بٹ صاحب نے شکایت کی "اور آپ نے اس کا نام بھی نہیں پوچھا۔"

دکانوں سے ہٹ کر ہم نے باغ کا رخ کیا۔ باغ سے زیادہ یہ ایک سبزہ زار تھا۔ جس میں یہاں وہاں پودے اور پھول بھی لگے ہوئے تھے۔ ایک جگہ مداری تماشا دکھا رہا تھا۔ دوسری جگہ ایک صاحب گھاس پر ایک تولیا بچھا کر کچھ جڑی بوٹی نما چیزیں فروخت کر رہے تھے اور الفاظی کے دریا بہا رہے تھے۔ بالکل پاکستان والا نقشہ تھا۔ باغ کے ایک اور گوشے میں ایک طرحدار اور نازک اندام خاتون وزن کرنے والی مشین سامنے رکھے کرسی پر بیٹھی مسکرا رہی تھیں اور لوگ جوق در جوق مشین پر وزن کرا رہے تھے۔

اس کا معاوضہ بھی سولیرا تھا۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ سولیرا سے کم قیمت کی کوئی چیز وہاں نہیں ہوتی۔ یوں سمجھئے کہ وہ ہمارے روپے کی طرح ہے فرق صرف یہ ہے کہ سو

بہت سی چیزیں خریدی جا سکتی ہیں۔ خان صاحب اور بٹ صاحب دونوں ہی وزن کرانے کے لئے بے تاب ہو گئے تھے۔ مگر پھر پیسے کی کمی آڑے آئی مگر وہ بہت دیر تک وہاں کھڑے مشین اور مشین والی کو دیکھتے رہے۔ ہم نے آگے چلنے کے لئے ٹھوکا دیا تو بولے "لگتا ہے کہ ہر روز اپنا وزن تولتی ہے۔ کس قدر متناسب اور خوبصورت جسم ہے جیسے تراشا ہوا مجسمہ۔"

اسی باغ میں جوان جوڑے بانہوں میں بانہیں ڈالے گھوم رہے تھے۔ کچھ پودوں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں اپنے دلی جذبات کا کھلے عام مظاہرہ کر رہے تھے۔ بچے بھی تھے جو غبارے والے سے غبارے خریدنے کے بعد باغ میں ادھر سے ادھر تک بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ کچھ بزرگ مرد اور خواتین بھی بینچوں پر بیٹھے نظر آئے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے نوجوان جوڑے رومانٹک سین کر رہے تھے۔ مگر وہ ان سے بے خبر اور بے تعلق نظر آ رہے تھے۔ بٹ صاحب نے ریمارک پاس کیا "بہت بے شرم لوگ ہیں۔ بزرگوں کا بھی لحاظ نہیں ہے انہیں۔"

ہم نے کہا "بزرگوں کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ خود بھی جوانی میں یہی کچھ کرتے رہے ہیں۔"

روم میں چند روز کے قیام کے دوران میں ہم نے دیکھا کہ ان لوگوں کا مزاج بالکل مشرقی ہے۔ یہ یورپ کا وہ ملک ہے جہاں مشترکہ خاندانوں کا رواج آج بھی موجود ہے۔ سارے یورپ میں گھومنے پھرنے کے بعد ہمیں یہی ایسا ملک نظر آیا جہاں گھر کے سب لوگ سیر و تفریح کے لئے اکٹھے گھر سے باہر نکلتے ہیں۔ بچے' بڑے' بوڑھے' جوان سب یکجا نظر آتے ہیں۔

ایک بار دیکھا کہ ایک خوبصورت نوجوان جوڑا ریسٹورنٹ میں آیا۔ ہمراہ دو بچے بھی تھے۔ ایک بڑی بی باہر کھڑی کار میں بیٹھی تھیں۔ جب کھانا آیا تو بچوں نے دوڑ دوڑ کر کھانے کا سامان بڑی بی کو پہنچانا شروع کر دیا۔ نہ جانے وہ ان کی دادی تھیں یا نانی تھیں۔ مگر بہت نورانی چہرے والی خاتون تھیں۔ سفید براؤن بال جھریوں بھرا گورا چہرہ' لباس ماڈرن بار بار اپنا میک اپ درست کر رہی تھیں۔ روم میں یکجا خاندانوں کے جو مناظر دیکھنے میں آئے ہیں وہ یورپ کے دوسرے ملکوں اور شہروں میں ناپید ہیں۔ اٹلی کے لوگ

خوش مزاجی، کھلنڈرا پن، تماشا دیکھنے کا شوق، خوش خوراکی میں وہ بہت حد تک ہماری طرح ہیں۔ قد و قامت اور رنگ و نقش سے بھی پنجابی یا کشمیری نظر آتے ہیں۔ زور زور سے بلند آواز میں باتیں کرنا، ہنسنا اور لڑنا جھگڑنا بھی ہم ہی جیسا ہے۔ اٹلی، یورپ کے ان ملکوں میں ہے، جہاں جرائم بہت ہوتے ہیں۔ دھوکا بازی کی وارداتیں بھی عام ہیں۔ سارے یورپ میں اگر ہمیں جھوٹ بولنے اور کوئی بات کہ کر مکرنے والے لوگ ملے تو اٹلی میں۔ ایک بار ہم نے ایک ٹیکسی والے کو ریلوے اسٹیشن چلنے کے لئے راضی کیا۔ کافی لمبا سفر تھا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم وہاں پہنچے اور کرایہ بھی کافی ادا کیا مگر واپسی میں جب ہم نے بس میں سوار ہونے کے لئے بس کا نمبر پوچھا اور بتایا کہ ہم فلاں ہوٹل جانا چاہتے ہیں تو ایک صاحب نے ہمیں بتایا کہ دو سڑکیں چھوڑ کر ہمارا ہوٹل ہے۔ پیدل چلے تو چار منٹ میں ہم اپنے ہوٹل پہنچ گئے۔

اٹلی جانے والے سیاحوں کو خاص طور پر خبردار کیا جاتا ہے کہ وہ نوسربازوں اور جیب تراشوں سے ہوشیار رہیں۔ جس وقت سیاح کوئی منظر یا کوئی حسین چہرہ دیکھنے میں مصروف ہوتے ہیں "جیب کترے ہاتھ کی صفائی دکھا دیتے ہیں۔ بسوں، ریل گاڑیوں اور سینما گھروں میں جہاں پر...... لوگوں کی قطاریں لگی ہوتی ہیں۔ اور رش کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے سے جڑے کھڑے ہوتے ہیں، ایسے میں جیب تراشوں کی بن آتی ہے۔ اور وہ بڑی آسانی سے جیب صاف کر دیتے ہیں۔ یہاں تک سنا ہے کہ حسین لڑکیاں بھی ایسے مقامات پر جسمانی قربت سے فائدہ اٹھا کر جیبیں اور پرس صاف کر دیا کرتی ہیں۔

روم میں دیکھا کہ ٹھیلے اور کھوکھے والے خوب کاروبار کرتے ہیں۔

پہلے دن پلازہ کی سیر کرتے ہوئے ایک بغلی سڑک پر دیکھا کہ ایک ٹھیلا کھڑا ہوا ہے۔ برف کی سلیں رکھی ہوئی ہیں جن پر کٹے ہوئے تربوز کے ٹکڑے سجے ہوئے ہیں۔ لوگ رکتے ہیں، تربوز کی قاشیں خریدتے اور چلے جاتے ہیں۔ کچھ تو وہیں کھڑے کھڑے نوش جان کر لیتے ہیں مگر چھلکے سڑک پر نہیں پھینکتے۔ اس مقصد کے لئے ٹھیلے والے نے ٹھیلے کے نیچے ٹوکریاں رکھی ہوئی ہیں۔ سڑکوں پر کیوں کہ خاک دھول نہیں ہوتی اس لئے گندگی کا احتمال نہیں ہوتا۔ تربوز ہم نے پاکستان، ہندوستان میں بھی کھائے اور مصر و امریکا میں بھی لیکن یہ حقیقت ہے کہ اٹلی کے تربوز اپنی مٹھاس اور لطف کے اعتبار سے منفرد ہوتے ہیں۔ تربوز کی ایک قاش کی قیمت بھی ایک سولیرا تھی۔ ہم نے ایک قاش خریدی اور باری باری کھائی۔ ان دنوں ہمیں یہ احساس بہت شدت سے ہوا ہے کہ خالی جیب اور تنگ دستی بھی کس قدر تکلیف دہ چیز ہے۔ ہمارے چاروں طرف کھانے پینے کی چیزیں بک رہی تھیں مگر ہم سولیرا خرچ کرنے سے پہلے بھی ہزار بار سوچنے پر مجبور تھے۔

پتا پوچھنے اور بتانے والے ہمارے ملک میں بھی ہوتے ہیں اور دوسرے ملکوں میں

بھی پائے جاتے ہیں۔ ہر ملک اور ہر شہر کے پتا بتانے والوں کا دستور الگ پایا۔ یورپ کے اکثر ملکوں میں تو وہ شانے ہلا کر یا سوری کہہ کر رہ جاتے ہیں یا پھر ایک جانب اشارہ کر دیتے ہیں۔ بہت سے لوگ تو جواب دینا ہی گوارہ نہیں کرتے ہمارے ملک کے پتا بتانے والے پتا بتاتے ضرور ہیں چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو اور وہ بھی اس قدر وثوق کے ساتھ کہ دریافت کرنے والا ان کے دھوکے میں آ جاتا ہے اور پھر بھٹکتا پھرتا ہے روم میں دیکھا کہ جب آپ کسی سے پتا دریافت کرتے ہیں تو وہ فوری طور پر جواب نہیں دیتا بلکہ سوچ میں گم ہو جاتا ہے کچھ دیر غور و خوض کرتا ہے اور پھر معذرت کر لیتا ہے سب سے بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ اس کا بتایا ہوا پتا سمجھنا بھی ایک مصیبت ہے۔ کیونکہ وہ تو اپنی زبان میں پتا بتاتا ہے اگر آپ کو اطالوی زبان نہیں آتی تو اس میں پتا بتانے والے کا کیا قصور ہے؟ خالی گھومنے والے بے فکرے ہمارے ملک میں تو ہوتے ہی ہیں مگر روم میں بھی بہت بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں ایسا لگتا ہے جیسے ان خواتین و حضرات کو دنیا کی کوئی فکر ہی نہیں ہے۔ نہ انہیں کوئی کام ہے' وقت اور فرصت کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آرام سے گھومتے پھرتے ہیں۔ کہیں کوئی چیز خرید لی' کہیں تماشا دیکھنے کھڑے ہو گئے۔ کہیں ٹھیلے والے کے پاس کھڑے ہو کر کھانے پینے لگے۔ ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اگر کوئی ایک جگہ کھڑا کسی چیز کو دیکھ رہا ہو گا تو وہاں تھوڑی دیر میں ایک مجمع اکٹھا ہو جائے گا۔ دراصل یہ فارغ وقت کی نشانی ہے۔ شفیق الرحمٰن نے ایک بار اپنے افسانے میں لکھا تھا کہ ایک دن ان کے دوست سلطان سڑک پر کسی جگہ کھڑے ہو کر سامنے والی بند کھڑکی کو دیکھنے لگے۔ انہیں دیکھ کر ایک اور صاحب بھی آن کھڑے ہوئے۔ انھیں دیکھتے ہوئے کچھ اور لوگ بھی آ گئے یہاں تک کہ ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا سب سامنے والی کھڑکی کی جانب دیکھ رہے تھے

کچھ دیر بعد سلطان چپکے سے کھسک گئے مگر مجمع وہیں کھڑا رہا یہاں تک کہ کھڑکی والے گھر میں رہنے والوں نے باہر جھانکنا شروع کر دیا۔ لوگ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ معاملہ کیا ہے مگر کسی کو معلوم ہوتا تو بتاتا۔

اسی طرح ایک سیاح نے لکھا کہ وہ راستوں کی تلاش کے سلسلے میں روم میں ایک سڑک پر کھڑا ہو کر شہر کا نقشہ دیکھنے لگا۔ پاس سے گزرتے ہوئے ایک اطالوی نے اسے نقشہ دیکھتے ہوئے' پایا تو وہ بھی بغور نقشہ دیکھنے لگا۔ سیاح نے بتایا کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے' مگر راستہ معلوم نہیں ہے۔ اطالوی نے نقشے پر غور کرنا اور سوچنا شروع کر دیا۔ پاس سے گزرنے والے بھی ان کے آس پاس اکٹھے ہو گئے۔ یہاں تک کہ مجمع اکٹھا ہو گیا۔ کافی دیر بعد اطالوی نے سیاح کو ایک راستہ بتایا اور وہ چل پڑا لیکن ہجوم وہیں کھڑا آپس میں جھگڑتا رہا کہ اطالوی نے سیاح کو درست راستہ بتایا ہے یا غلط؟ یہ سب عادتیں ہم میں اور اٹلی والوں میں مشترک سی لگتی ہیں۔ روم کے پلازہ میں جسے اطالوی پیازہ کہتے ہیں اور پیازہ کا کوئی نہ کوئی نام ہوتا ہے مثلاً "پیازہ نیوونا" "پیازہ سانتا لوسیا" وغیرہ۔ ہم جس پیازہ میں گھوم رہے تھے۔ ہمیں اس کا نام یاد نہیں رہا مگر بہت رونق اور چہل پہل والا پیازہ تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ ہر پیازہ اتنا ہی بارونق ہوتا ہے۔ یہاں بے فکروں اور خوش باش عورتوں' مردوں اور کھلنڈرے بچوں کا ہجوم تھا۔ کسی کے ہاتھ میں آئسکریم' کسی کے ہاتھ میں مونگ پھلیاں یا تربوز کی قاش کسی کے ہاتھ میں محبوب یا محبوبہ کا ہاتھ' ہر کوئی وقت اور مقام کی پابندی سے ماورا نظر آتا تھا۔ ہر پلازہ میں اور بڑے چوک میں کبوتر ضرور ہوتے ہیں۔ یہاں بھی بے شمار کبوتر گھاس پر غٹرغوں کرتے پھر رہے تھے۔ اور لوگ جن میں سیاحوں کی تعداد زیادہ تھی' ان کے لئے دانہ خرید خرید کر انہیں کھلا رہے تھے۔ یہ کبوتر بہت بے تکلف اور دوستانہ طبیعت کے مالک ہوتے ہیں۔ لوگوں کے سروں' کندھوں اور ہاتھوں پر بھی بیٹھ جاتے ہیں۔ انسانوں سے قطعی خوف زدہ نہیں ہوتے۔ بہت سے لوگ اپنے ساتھیوں کو کبوتروں کے نرغے میں گھرا ہوا پا کر ان کی تصویریں اتار رہے تھے۔ ہمارے پاس کوئی کیمرا نہیں تھا' اس لئے ہم ہر ایک کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ اچانک ایک خوشبو کا جھونکا آیا اور اس کے ساتھ ہی ایک چمکتا دمکتا چہرہ آنکھوں کے سامنے طلوع ہو گیا۔ یہ ایک امریکی سیاح لڑکی تھی۔ خوشی' جوش اور ہیجان کے باعث اس کا خوبصورت چہرہ تمتما رہا تھا۔ بے تکلفی سے کہنے لگی "معاف کیجئے' کیا آپ ہماری تصویر کھینچ دیں گے؟" ہم نے چونک کر دیکھا وہ تو خود ہی مجسم تصویر تھی۔ مگر اس کے ساتھ دو لڑکیاں اور بھی تھیں' جو اس وقت کبوتروں کے غول میں گھری ہوئی تھیں۔ اب اس کی خواہش تھی کہ ان تینوں کی یکجا تصویر اتار لی جائے۔ ہم نے فوراً رضامندی کا اظہار کر دیا اور اس کے ہاتھ سے کیمرا لے کر فوکس ٹھیک کرنے لگے۔ کیمرا خاصا پیچیدہ تھا مگر ہم نے

کوئی ایک بٹن دبا دیا وہ چمکتی ہوئی آئی اور شکریہ ادا کر کے کیمرا ہاتھ سے لے لیا پھر پوچھا "کیا آپ ہندوستانی ہیں؟"

ہم نے کہا "نہیں، ہم پاکستانی ہیں"

وہ سوچ میں پڑ گئی "پاکستانی؟" پھر بولی "خیر ہو گا کوئی ملک بہر حال بہت بہت شکریہ میرا نام جینی ہے۔ اور میں امریکا کی ریاست جارجیا کی رہنے والی ہوں' بائی" یہ کہ کر وہ اچھلتی کودتی واپس چلی گئی۔

برابر سے بٹ صاحب کی آواز آئی "آپ نے اس کو اپنا نام تو بتا دیا ہوتا۔"

پلازہ میں لاؤڈ اسپیکر بھی لگے ہوئے تھے جن سے کبھی میوزک بجائی جا رہی تھی اور کبھی اطالوی زبان میں لمبی لمبی تقریریں نشر ہو رہی تھیں۔ ہم سمجھے کوئی وعظ وغیرہ ہو گا۔ سننے والے بھی کوئی توجہ نہیں دے رہے تھے۔ اچانک لاؤڈ اسپیکر سے ایک ہیجان خیز آواز آئی اور سب لوگ ادھر متوجہ ہو گئے۔ چند لمحے کے لئے خاموشی طاری ہو گئی اور پھر نعرے لگنے شروع ہوئے

ہم نے اپنے پاس کھڑے ایک سیاح سے انگریزی میں دریافت کیا کہ کیا الیکشن کے نتائج نشر ہو رہے ہیں؟

وہ بولا "نہیں' لاٹری کا انعام جیتنے والوں کے ناموں کا اعلان ہو رہا ہے۔"

ایک دو دن بعد ہمیں لاٹری کی اہمیت کا بھی اندازہ ہو گیا۔ ایک جگہ دیکھا کہ ایک موٹے تازے مگر گنجے صاحب سوٹ پہنے ہوئے اور گردن مین نوٹوں کا ہار ڈالے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ آس پاس چند لوگوں کا مجمع بھی ہے۔ یکایک انہوں نے ایک نوٹ ہار میں سے پھاڑ کر ایک بڑی بی کے حوالے کر دیا۔ بڑی بی نے جواب میں ان کے ہاتھ میں کوئی چیز تھما دی اور دولھا میاں پھر آگے چل پڑے مگر ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیسے دولھا ہیں' نہ معقول لباس' نہ براتی' نہ بینڈ باجا کسی نے بتایا کہ یہ دولھا نہیں ہیں۔ لاٹری کا ٹکٹ فروخت کر رہے ہیں۔ گلے میں ٹکٹوں کا موٹا ہار لٹکا ہوا ہے جس میں سے وہ ٹکٹ پھاڑ پھاڑ کر خریداروں کو دے رہے ہیں۔ لاٹری کے ٹکٹ فروخت کرنے والے ہم نے گلی کوچوں' ریستورانوں کے باہر' ریلوے اسٹیشن' اور بسوں میں ہر جگہ دیکھے۔ لاٹری یہاں کے لوگوں کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ خدا جانے انعام بھی نکلتے ہیں یا نہیں مگر خریدنے

والوں کے جوش و خروش میں کوئی کمی نظر نہیں آئی۔ لاٹری ٹکٹوں سے ہونے والی آمدنی کا ایک حصہ خیراتی اور فلاحی کاموں کے لئے عطیہ کر دیا جاتا ہے۔

"پیازہ" کی رونق چھوڑنے کو جی تو نہیں چاہتا مگر خان صاحب کا خیال تھا کہ ابھی تو ڈھیر سارا روم ہمارے دیکھنے کو پڑا ہے۔ اس ایک پلازہ میں کہاں تک وقت گزاریں گے۔ بات ان کی معقول تھی۔ جہاں تک رونق اور خوبصورت مناظر کا تعلق ہے وہ تو روم میں ہر جگہ بکھرے پڑے تھے۔ پھر ایک ہی پلازہ میں ساری شام گزار دینا کہاں کی دانش مندی تھی۔ چنانچہ ہم اندازے کے مطابق پلازا سے نکل کر اپنے ہوٹل کی جانب چل پڑے۔ بڑی مشکل سے بھاگتے دوڑتے سڑک عبور کی اور دکانوں کی طرف جا نکلے۔ مختلف چیزوں کی دکانیں سجی ہوئی تھیں۔ ملبوسات کی دکانوں کے بڑے بڑے شوکیسوں میں عورتوں اور مردوں کے مجسمے مختلف قسم کے ملبوسات پہنے کھڑے اور بیٹھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ خان صاحب بہت غور سے ملبوسات کو دیکھ رہے تھے۔ ہر شوکیس کے سامنے کھڑے ہو کر گھورتے رہتے اور جب تک ہاتھ پکڑ کر نہ کھینچو وہاں سے حرکت کرنے کا نام بھی نہ لیتے۔ تنگ آ کر بٹ صاحب نے کہا "خان صاحب! آپ کے پاس پیسے تو ہیں نہیں اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہیں؟ اور پھر یہ تو زنانہ لباس ہیں۔ آپ تو اپنی بیگم کے لئے ایسے ننگے لباس خرید بھی نہیں سکتے۔"

خان صاحب مسکرائے اور بولے "میرے عزیز' میں لباس نہیں مجسموں کو دیکھ رہا ہوں۔"

بٹ صاحب نے حیران ہو کر انہیں دیکھا "وہ کیوں' کیا اتنی بہت سی چلتی پھرتی جاندار اور خوبصورت عورتیں دیکھ کر آپ کا دل نہیں بھرا؟"

کہنے لگے "میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ یہاں سچ مچ کی عورتیں بھی مجسموں کی طرح حسین اور دلکش ہیں۔ اصلی اور نقلی میں ذرا سا بھی تو فرق نہیں ہے۔"

اس سے پہلے کہ بٹ صاحب کچھ رائے زنی کرتے' برابر سے ایک انتہائی شائستہ مردانہ آواز نے انگریزی میں کہا "معاف کیجئے' کیا آپ لوگ ہندوستان سے آئے ہیں؟"

ہم اس قسم کے سوال سے خاصے بیزار ہو چکے تھے۔ جھنجھلا کر دیکھا تو ایک نہایت خوش پوش وجیہہ اور ہنس مکھ نوجوان ہم سے مخاطب تھا۔

ہم نے ناراضی سے کہا "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے ہم ہندوستانی نہیں، پاکستانی ہیں۔"

"اخاہ!" وہ خوش ہو کر بولا "پھر تو مجھے بالکل غلطی نہیں لگی میرا اندازہ بالکل درست نکلا' میں تو دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ آپ پاکستانی ہیں۔"

"وہ کس طرح؟" ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بس، آپ لوگوں کا اسٹائل، آپ کی شکل و صورت، آپ کی وجاہت' ہر چیز یہ گواہی دے رہی تھی کہ ہو نہ ہو آپ پاکستانی ہیں۔"

پردیس میں اگر کوئی اجنبی اس طرح آپ کی اور آپ کے ملک کی تعریف کرنا شروع کر دے تو ظاہر ہے کہ بے حد خوشی ہوتی ہے بلکہ دل بلیوں اچھلنے لگتا ہے۔ ہمارے دل نے بھی اسی قسم کی اچھل کود شروع کر دی۔ خان صاحب اور بٹ صاحب انگریزی میں کتنے ہی گئے گزرے سہی اتنی بات تو وہ بھی سمجھ گئے تھے اور اجنبی کو دیکھ دیکھ کر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔

اجنبی نے مسکرا کر اپنے سفید موتیوں جیسے خوبصورت دانتوں کا مظاہرہ کیا اور پوچھا "کیا میں آپ لوگوں کے نام جاننے کا شرف حاصل کر سکتا ہوں؟"

ہم نے خان صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ خان صاحب ہیں......"

"اوہ" اس نے بات کاٹ کر خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا "خان' یعنی دی گریٹ خان۔"

اس قدر توصیف کی تو ہم بھی توقع نہیں رکھتے تھے۔ اس نے خان صاحب سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی مسٹر خان! میں نے خانوں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے مگر ملنے کا اعزاز آج ہی حاصل ہوا ہے۔"

خان صاحب کا سر فخر سے کچھ اور بلند ہو گیا۔ شاید ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ خان صاحب چھ فٹ لمبے اور مناسب جسامت کے آدمی ہیں۔ رنگ سانولا ہے ناک نقشہ بھی مناسب ہے۔ سر کے بالوں میں قدرے سفیدی جھلکنے لگی ہے۔ جس نے ان کی باوقار شخصیت میں کچھ اور اضافہ کر دیا ہے۔ وہ کوئی حماقت بھی کرتے ہیں تو بڑے وقار کے ساتھ کرتے ہیں۔ اجنبی نے ان کے بارے میں اگر غلط اندازہ لگایا تھا تو اس کے لئے اس بے چارے کو قصور وار نہیں ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ وہ بہت دیر تک خان صاحب کا ہاتھ اپنے سفید ہاتھ میں تھامے کھڑا رہا اور ان کی جانب دیکھ دیکھ کر بار بار زیر لب کہتا رہا "دی خان! گریٹ خان!" خان صاحب بڑے فخر کے ساتھ ہم دونوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جیسے کہہ رہے ہوں کہ دیکھ لیا۔ میرے قدردان کہاں کہاں بکھرے ہوئے ہیں اور ایک تم بے قدرے لوگ ہو۔ اتنی دیر میں بٹ صاحب نے ہمیں کہنی مار کر اپنی طرف متوجہ کیا اور بولے "میرا بھی تعارف کراؤ۔"

ہم نے کہا "اور یہ مسٹر بٹ ہیں، کبھی کشمیر کا نام سنا ہے۔ جسے جنت ارضی بھی کہتے ہیں۔ یہ وہیں کے رہنے والے ہیں۔"

اس نے بٹ صاحب کے سرخ و سفید چہرے اور پھولے پھولے گالوں کی طرف دیکھا۔ پھر ان کی شربتی آنکھوں اور بالوں پر نظر ڈالی اور کہا "واقعی' آپ تو جنت کے باسی ہی نظر آتے ہیں۔ کس قدر خوبصورت شخصیت ہے۔" اس نے خان صاحب کا ہاتھ چھوڑ کر بٹ صاحب کا ہاتھ تھام لیا اور زور زور سے ہلانے لگا "کشمیر' زمین پر جنت خوبصورت لوگوں کا وطن' بہت خوب" بٹ صاحب بھی اس کی جانب دیکھتے اور مسکراتے رہے۔ آخر میں ہم نے اپنا تعارف کرایا "اچھا اچھا' بہت خوب' بہت خوب" اس نے ہم سے بھی گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کیا۔

بٹ صاحب نے حسب عادت ہمارے کان میں کہا "اس کا نام بھی تو پوچھو۔"

ہم ابھی ہونٹ کھولنے بھی نہیں پائے تھے کہ اس نے مسکراتے ہوئے کہا "دوستو میرا نام لیونارڈو ہے۔ میں میکسیکو کا رہنے والا ہوں۔"

اب ہمیں پتا چلا کہ اس کا لب و لہجہ بھی اطالوی کیوں لگ رہا تھا لیکن وہ خاصی اچھی اور صحیح انگریزی بول رہا تھا۔

"آپ لوگ روم کب پہنچے؟"

"بس آج ہی آئے ہیں۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے ہمیں بطور خاص اس موقع پر اس جگہ یکجا کر دیا ہے۔ آیئے اس خوشی میں کافی پی جائے۔"

ہم تینوں نے پریشانی سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ مگر وہ خود ہی بول اٹھا

"یقیناً آپ لوگ میرے مہمان ہوں گے۔ مجھے آپ کی میزبانی کا شرف حاصل کر کے بے حد خوشی ہو گی۔"

خان صاحب کے چہرے کی تنی ہوئی رگیں ڈھیلی پڑ گئیں اور وہ مسکرانے لگے۔ بٹ صاحب بولے "خیال برا نہیں ہے۔"

مگر ہم نے کہا "اس وقت تو ہم مصروف ہیں، پھر کسی وقت سہی۔"

اس نے اصرار کیا "ارے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اچھا یوں کرتے ہیں کہ کسی بار میں چلتے ہیں، نئی دوستی اور اس ملاقات کی خوشی میں۔"

خان صاحب پھر خوشی سے بے قابو ہونے لگے۔ وہ باقاعدہ پینے والے تو نہیں تھے مگر کبھی کبھار چکھ لینے میں ہرج بھی نہیں سمجھتے تھے جب کہ بٹ صاحب اور میں "صوفی" تھے۔ ہم نے پھر معذرت کی "دیکھئے ہمیں کچھ ضروری کام کرنے ہیں۔"

خان صاحب پنجابی میں کہنے لگے "یار یہ کیا بدتمیزی ہے وہ اتنی محبت سے مدعو کر رہا ہے اور تمہارا دماغ ہی نہیں ملتا۔"

ہم نے کہا "یہ روم ہے اور ہم اس شخص کو جانتے تک نہیں ہیں۔ یہ کون ہے؟ کیا چاہتا ہے؟ اور ہمارے ساتھ اتنی محبت کا اظہار کیوں کر رہا ہے۔ ہمیں یہاں بہت ہوشیار اور محتاط رہنے کی ضرورت ہے ورنہ خواہ مخواہ کسی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔"

"کس مصیبت میں پھنس جائیں گے؟ ارے بھئی کافی یا شراب کا ایک جام پینے میں ہرج ہی کیا ہے اور پھر وہ کتنے پیار اور خلوص سے دعوت دے رہا ہے۔"

ہم نے کہا "اور یہی بات ہمیں شک میں ڈال رہی ہے۔"

لیو نارڈو ہمارے چہرے دیکھتا رہا پھر بولا "کیا آپ لوگ پاکستانی زبان بول رہے ہیں۔؟"

ہم نے سر ہلا کر اقرار کیا تو اپنی خوبصورت آواز میں بولا "کتنی میٹھی اور پیاری زبان ہے۔ پاکستان کی تو ہر چیز ہی پیاری ہوتی ہے۔"

پاکستان کا اتنا بڑا مداح ہم نے ملک سے باہر پہلی بار ہی دیکھا تھا اور وہ بھی اس قدر زیادہ مدح خواں

"دیکھئے، چاہے کچھ بھی ہو جائے میں آپ کو کافی کا ایک کپ پئے بغیر نہیں جانے

دوں گا۔ وہ سامنے ہی تو ریستوران نظر آ رہا ہے۔" اس نے خان صاحب کے بازو میں ہاتھ ڈال کر انہیں بے تکلفی سے اپنی جانب گھسیٹنا شروع کر دیا۔

بٹ صاحب نے سفارش کی "میرے خیال میں اس کی بات مان لینی چاہئے۔ اب انکار کرنا بداخلاقی ہو گی۔" مجبوراً ہم خاموش ہو گئے۔

ریستوران زیادہ فاصلے پر نہیں تھا اور خاصا مہنگا لگ رہا تھا عمارت، آرائش، ماحول اور سب سے بڑھ کر ویٹریس۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک خوبصورت خاتون نے ہمیں خوش آمدید کہا وہ ٹخنوں تک لمبی اسکرٹ پہنے ہوئے تھیں۔ سر پر ہیٹ رکھا تھا مگر ان کا بلاؤز یعنی اوپر کا لباس یوں لگتا تھا جیسے کسی جھگڑے میں تار تار ہو گیا ہے۔ پھٹا ہوا تو نہیں تھا مگر اس نفاست سے تیار کیا گیا تھا کہ پھٹا ہوا ہی لگتا تھا مگر لباس کی اس غربت نے ان کے حسن کی دولت کو اجاگر کر دیا تھا۔ انہوں نے ہمارے سامنے آنکھیں بچھا دیں اور ہمیں لے کر ایک گوشے میں گول شیشے کی میز کی جانب چلیں۔ ریستوران میں روشنی بہت کم تھی اور خاصا خواب ناک ماحول تھا۔ وہ ہمیں میز تک چھوڑ کر گئیں تو ایک صحت مند اور توانا ویٹریس نے ان کی جگہ لے لی۔ یہ خاتون کسی ہیلتھ کلب کا چلتا پھرتا اشتہار نظر آتی تھیں۔ صحت اور جوانی تھی کہ سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی۔ لباس ان کا بھی مختصر تھا مگر شکر ہے کہ پھٹا ہوا نہیں تھا۔ لیو نارڈو نے اطالوی زبان میں کافی کا آرڈر دیا اور پھر طلائی سگریٹ کیس نکال کر ہمیں سگریٹ پیش کی۔ خان صاحب نے فوراً ایک سگریٹ لے لی حالانکہ وہ سگریٹ نہیں پیتے مگر ان کا قول ہے کہ مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے اور پھر کسی کا دل توڑنا بھی انہیں گوارا نہیں ہے۔

ہم نے اردو میں ان سے کہا "دیکھیں خان صاحب! مجھے کچھ پریشانی سی ہو رہی ہے۔ آخر یہ شخص چاہتا کیا ہے؟"

بولے "فی الحال ہمیں کافی پلانا چاہتا ہے۔"

"مگر کیوں؟"

"یار، مہمان نواز ٹائپ کا آدمی ہے اور ہم لوگوں سے متاثر ہو گیا ہے۔"

لیونارڈو نے بڑے اسٹائل سے سگریٹ کا کش لیا اور بولا "مسٹر خان! آپ کون سی ریاست کے نواب ہیں؟"

اس اچانک سوال پر ہم سب گھبرا گئے۔

"خان تو بڑے لینڈ لارڈ ہوتے ہیں یا پھر ریاست کے راجہ ہوتے ہیں۔"

"راجہ نہیں نواب" ہم نے تصحیح کی "راجہ ہندو لوگ ہوتے ہیں مسلمانوں کو نواب کہا جاتا ہے۔"

"ایک ہی بات ہے۔" اس نے کہا۔ ہندو اور مسلمان کا فرق شاید اسے معلوم ہی نہیں تھا۔ "مجھے اصلی اور سچ مچ کا خان دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہو رہی ہے خدایا میں کیا کروں؟ کس طرح آپ کی خاطر مدارات کروں؟"

پلک جھپکنے میں صحت مند ویٹریس نے کافی کا سامان لا کر ہمارے سامنے میز پر رکھ دیا اور پھر جھک کر پوچھنے لگی "آپ اجازت دیں تو کافی بنا دوں؟"

اس کا یہ انداز اس قدر قیامت خیز تھا کہ ہر شخص کے منہ سے بیک وقت اور بے اختیار نکلا "ضرور' ضرور" اس نے اسی انداز میں جھک کر کافی بنائی اور پھر ہر ایک کی پیالی اس کے پاس جا کر پیش کر دی مگر کافی کی طرف کسی کی توجہ نہیں تھی۔ سب کا دھیان کافی پیش کرنے والی کی طرف لگا ہوا تھا۔ جب وہ کافی کی پیالیاں سب کے سامنے رکھ کر واپس چلی گئیں تو سب کی جان میں جان آئی۔

لیونارڈو نے ہمیں بتایا کہ وہ میکسیکو کے ایک بہت دولت مند صنعت کار کا اکلوتا بیٹا ہے۔ پیسے کی کمی نہیں ہے اس لئے دنیا بھر میں گھومتا پھرتا ہے۔ اور اسے نئے نئے دوست بنانے کا شوق ہے۔ ان دنوں روم میں مقیم ہے۔ جہاں ایک شاندار ولا اس کے باپ کی ملکیت ہے۔ ہم تینوں حیران تھے کہ ایک ایسے بے فکر دولت مند کو بھلا ہم لوگوں سے اتنی دلچسپی اور عقیدت کیسے پیدا ہو گئی۔

لیونارڈو نے ہم سے پوچھا "اور آپ لوگوں کا قیام کہاں ہے؟"

اس سے پہلے کہ ہم ٹوکتے خان صاحب نے فوراً ہوٹل کا نام بتا دیا۔ ہم نے غصے سے کہا "بلاوجہ ہوٹل کا نام کیوں بتا دیا۔ یہ وہاں بھی نازل ہو جائے گا۔"

"تو پھر کیا ہوا' اچھا آدمی ہے بے چارہ۔ ہمارا کیا بگاڑے گا۔"

لیونارڈو ہماری باتیں سن کر مسکرا رہا تھا حالانکہ ایک لفظ بھی اس کے پلے نہیں پڑ رہا ہو گا۔

کہنے لگا "دیکھئے آج رات ہم نائٹ کلب چلیں گے اور کھانا بھی وہیں کھائیں گے۔"

خان صاحب کی باچھیں ایک بار پھر کانوں تک پھیل گئیں۔ بٹ صاحب کا تاثر بھی مختلف نہیں تھا۔ ہمیں رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ اس شخص کی مہربانی بے سبب نہیں ہو سکتی۔ مگر اس کا ہم سے کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ یہ معما ہم سے حل نہیں ہو رہا تھا۔

ہم نے کہا "مسٹر لیونارڈو......"

وہ بات کاٹ کر بولا "مجھے صرف لیو کہیں' تکلف مجھے پسند نہیں؟"

"لیو! بات یہ ہے کہ ہم لوگ آج ہی لمبا سفر کر کے آئے ہیں اور بہت تھکے ہوئے ہیں۔ اس لئے آپ کی دعوت قبول نہ کر سکیں گے۔"

لیونارڈ ہنسنے لگا "ایسی جگہ لے جاؤں گا جہاں پہنچ کر ساری تھکن دور ہو جائے گی بلکہ وہاں عیش بھی کرا دوں گا۔" اس نے ایک آنکھ بند کر کے معنی خیز انداز میں ہمیں دیکھا۔

"پتا ہے' وہاں بہت خوبصورت لڑکیاں ہوتی ہیں۔ بالکل روم کے مجسموں کی طرح۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے ایک خیالی پیکر تراش کر ہمیں دکھا دیا۔

"ہر ملک کی لڑکیاں۔ یورپین' اٹالین' فرنچ' انڈین' پاکستانی' امریکن' وہ تو پرستان ہے پرستان۔"

ہم نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ خان صاحب اور بٹ صاحب دونوں کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔

"مگر......" ہم نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"بس بس' اب کوئی عذر نہیں چلے گا۔ رات کو نو بجے میں آپ کو لینے ہوٹل آ جاؤں گا اور پھر ہم ہوں گے اور روم کی رنگینیاں......" اس کے اشارے پر وہی صحت مند ویٹریس ایک طشتری میں بل لے کر آ چکی تھی۔ اس نے بل پر ایک نظر ڈالی اور سفید ریشمی کوٹ کی جیب سے نوٹ نکال کر بے پروائی سے طشتری میں ڈال دیے۔ "ریزگاری رکھ لیں" اس نے رئیسانہ ٹھاٹ سے کہا اور ویٹریس کو کولھے پر ایک چپت رسید کر دیا اور وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ "آئیں' اب چلتے ہیں۔ رات کو ہوٹل میں ملاقات ہو گی

ٹھیک نو بجے' اوکے؟" اس نے ہمارے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا اور ہمیں ریستوران کے دروازے پر چھوڑ کر رخصت ہو گیا۔

ہم حیران پریشان کھڑے رہ گئے۔ جب حیرت ذرا کم ہوئی تو ہم نے خان صاحب کو دانت پیس کر دیکھا۔ "اس کو ہوٹل کا پتا بتانے کے لئے کس نے کہا؟"

"اس میں کیا برائی ہے؟" وہ بولے۔

"خان صاحب' آپ کی بیوقوفی کا مجھے یقین تھا مگر آپ کو اتنا بڑا بیوقوف نہیں سمجھا تھا۔ بھائی جان' آپ نے یہ تو سوچا ہوتا کہ ایک انجان شخص پردیس میں ہم پر مہربان ہو گیا ہے اور ہماری خاطرمدارات میں مصروف ہے۔ آخر اس کا کوئی تو سبب ہو گا؟"

وہ ایک لمحے کے لئے سوچ میں پڑ گئے۔

"یہ روم ہے یہاں ایک سے بڑا ایک نوسرباز اور جرائم پیشہ شخص رہتا ہے۔ ممکن ہے وہ مافیا سے تعلق رکھتا ہو یا کوئی خطرناک مجرم ہو۔ دیکھتے نہیں کس بے دردی سے پیسہ لٹا رہا ہے۔ کیا پتا وہ نائٹ کلب کے بہانے ہمیں کہیں اور لے جائے یا وہاں لے جا کر ہمارے ساتھ خدا جانے کیا سلوک کرے؟"

خان صاحب کچھ کچھ شرمندہ سے ہو گئے۔ مری ہوئی آواز میں کہنے لگے "ہاں' ہو تو سکتا ہے مگر وہ کتنا شریف اور......."

"بس بس شرافت کسی کے چہرے پر نہیں لکھی ہوتی۔ آپ نے اسے ہوٹل کا پتا بتا کر اچھا نہیں کیا۔ اب واپس چلیں ہم پہلے ہی ایک مصیبت میں گرفتار ہیں۔ اب نہ جانے آگے کیا ہو گا؟"

ہم لوگ پلازہ سے پیدل ہی ہوٹل روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایک دو جگہ ہوٹل' تعارفی کارڈ دکھا کر پتا بھی دریافت کیا اور آخرکار ہوٹل پہنچ گئے۔

مسٹر گوویدو استقبالیہ پر موجود تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی ان کا چہرا روشن ہو گیا۔ "سینور' سینور' ویل کم' سیر کیسی رہی؟"

ہم نے مختصر الفاظ میں انہیں اپنے تاثرات سے آگاہ کیا۔

"دیکھا آپ نے روم کس قدر خوبصورت اور تاریخی شہر ہے زندگی سے بھرپور' یہاں تو چپے چپے پر تہذیب اور ثقافت بکھری پڑی ہے۔ اس جیسا شہر دنیا میں کوئی اور نہیں

ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

"بے شک' مگر ابھی ہم نے اس کا ایک معمولی حصہ بھی نہیں دیکھا ہے۔"

"وہ معمولی حصہ ہی دنیا کے بڑے بڑے شہروں پر بھاری ہے۔" انہوں نے فخریہ انداز میں کہا "آپ کہیں تو آپ کے لئے تفریحی سیر کا بندوبست کیا جائے' بہت اچھا گائیڈ ہے۔"

ہم سمجھ گئے کہ وہ اپنے کسی اور بیٹے یا رشتے دار کو ہمارے سر منڈھنا چاہتے تھے۔

"شکریہ' فی الحال تو ہم آس پاس گھوم پھر کر ہی سیر کریں گے ارد گرد بھی تو تاریخی مقامات کی کمی نہیں ہے۔"

"اس میں کیا شک ہے یہاں تو ایک ایک انچ زمین پر تاریخ کی مہر لگی ہوئی ہے۔ روم شہر لاجواب ہے۔ شہر بے مثال ہے۔"

وہ اور نہ جانے کتنی تعریف کرتے مگر ہم نے کمرے کی چابی لے کر ان کی زبان کو بریک لگا دیا۔ کمرے میں پہنچ کر جب بیڈ پر لیٹے تو سارے زمانے کی تھکن نے آ دبوچا۔ یہ تھکن جسمانی نہیں تھی' ذہنی تھی۔ پریشانیوں نے ہمیں اپنی گرفت میں جکڑ لیا تھا۔ روم جیسے غدار شہر میں ہم بالکل بے آسرا اور بے سہارا تھے پیسہ ہماری جیب میں نہیں تھا۔ جس سے پیسہ لینا تھا اس کا کوئی پتا نشان ہمارے پاس نہیں تھا۔ جس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے وہ کب تک ہمیں "ادھار" میں رکھے گا؟ پی آئی اے اور پاکستانی سفارت خانے سے کب رابطہ ہو گا اور اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ پریشانیاں پے در پے سمندر سے اٹھتی ہوئی موجوں کے مانند ہم پر چڑھائی کر رہی تھیں۔ اس پر ایک نئی پریشانی مسٹر لیونارڈو کی تھی۔ یہ شخص کون ہے؟ کیا چاہتا ہے؟ ہم پر اس قدر مہربان کیوں ہو رہا ہے؟ پریشانی اور تھکن کے مارے ہمیں نیند آ گئی۔

آنکھ کھلی تو خراٹوں کی آواز کانوں میں پڑی، خان صاحب اور بٹ صاحب دونوں آنکھیں بند کئے اور منہ کھولے گہری نیند میں ڈبے ہوئے تھے۔ گھڑی کی جانب دیکھا تو ساڑھے آٹھ بج رہے تھے مگر کمرے میں اور کھڑکیوں سے باہر روشنی پھیلی ہوئی تھی، سوچا شاید گھڑی بند ہو گئی ہے مگر دونوں سوئیاں حرکت میں تھیں اور ٹک ٹک کی آواز بھی آ رہی تھی۔ کھڑکی میں سے باہر جھانکا تو ہر طرف روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ ماجرا کیا ہے؟ یہ عقدہ ہم پر بعد میں کھلا کہ گرمیوں میں یہاں دس بجے تک رات نہیں ہوتی نہ اندھیرا ہوتا ہے۔ ادھر یہ فکر تھی کہ وہ بلائے ناگہانی لیونارڈو دس بجے نازل ہونے والا تھا۔ جیب خالی تھی تو کیا ہوا سوٹ کیس تو کپڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہم نے ان دونوں کو جگایا اور کمرے میں نصب واش بیسن میں ہاتھ منہ دھو کر تازہ دم ہو گئے۔ قمیص کو دیکھا تو بالکل اجلی تھی۔ کف اور کالر بھی شفاف نظر آئے حالانکہ سفید قمیص تھی۔ یورپ میں شاید گرد و غبار نہیں ہوتا اس لئے کپڑے بھی جلدی میلے نہیں ہوتے۔ جوتوں کا بھی یہی عالم ہے۔ ہفتوں تک پالش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ذرا سا کپڑا پھیر لیا، برش مارا تو جوتے چمکنے لگتے ہیں۔ بھئی واہ، یہ بھی بڑا آرام ہے۔ سوٹ اور ٹائی تبدیل کرنے کے بعد ذہنی حالت میں بھی تبدیلی محسوس ہونے لگی۔

اس اثنا میں خان صاحب بھی نیا بلیو سوٹ پہن چکے تھے اور بٹ صاحب نے بھی لباس تبدیل کر لیا تھا۔ دونوں حضرات چمک رہے تھے۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو ہمیں بہت حیرانی ہوئی۔ اس غریب الوطنی میں ایک اجنبی ملک میں ہمیں ٹیلی فون کرنے والی ہستی کون ہو سکتی ہے؟ ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف گوویدو بول رہے تھے۔ "ہیلو سینور! آپ کے مہمان آ گئے ہیں۔"

اوہ، گویا مسٹر لیونارڈو اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تشریف لے آئے تھے۔

نیچے اتر کر لاؤنج میں پہنچے تو لیونارڈو قیمتی مخملیں لباس میں نہایت شاندار نظر آ رہے تھے۔ وہ مسٹر گوویدو اور ان کی بیٹی سے اطالوی زبان میں باتیں کر رہے تھے اور اتنی تیزی سے بول رہے تھے کہ الفاظ تینوں کے منہ سے مشین کی گولیوں کی طرح باہر نکلتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ خوش ہو گئے۔

مسٹر گوویدو نے کہا "ان کا خیال رکھنا۔"

"فکر نہ کریں۔ سینور۔ یہ بہت محفوظ ہاتھوں میں ہیں۔ آئیے مسٹر خان دی گریٹ، کم آن فرینڈز۔"

وہ ہمیں گھیر کر ہوٹل سے باہر لے گیا جہاں فٹ پاتھ پر ایک نیلے رنگ کی قیمتی چمکدار کار جگمگا رہی تھی اور اس نے کیونکہ راستہ روک لیا تھا اس لئے دونوں طرف ٹریفک جام ہو گیا تھا اور ہارنوں کا شور برپا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ لیونارڈو شرمندہ ہو کر دوسروں سے معذرت کرے گا مگر وہ بے نیازی سے اپنی کار کی طرف بڑھا دروازہ کھول کر ہمیں بٹھایا پھر اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر خان صاحب کو اپنے برابر والی سیٹ پر بٹھایا اور پھر ہاتھ جھاڑتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ہارنوں کی وجہ سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔

مگر وہ بالکل مطمئن اور پرسکون تھا۔ اس نے اپنی کار اسٹارٹ کی اور ریورس گیئر لگا کر اتنی تیزی سے پیچھے دوڑائی کہ عقب میں کھڑی ہوئی ایک کار سے ٹکراتے ٹکراتے رہ گئی۔ پھر اس نے پہلا گیئر لگایا اور ہوائی جہاز جیسی آواز سے اس کی کار سامنے کی طرف دوڑی۔ چند لمحے بعد ہم روم کی سڑکوں سے آندھی اور طوفان کی طرح گزر رہے تھے۔

لیونارڈو نے چند ٹریفک سگنلز کو نظر انداز کیا۔ چند کاروں سے ٹکراتے ٹکراتے بچا اور چند خوش نصیب اس کی کار تلے آ کر کچلنے سے بال بال بچ گئے مگر اس پر کوئی اثر نہیں تھا۔ اس نے ایک ہاتھ کھڑکی میں رکھ لیا تھا اور بڑی بے فکری سے سیٹی بجاتے ہوئے کار اڑائے جا رہا تھا۔۔۔۔ ہمیں کبھی موت کے کنوئیں میں چلائی جانے والی موٹر سائیکل پر

بیٹھنے کا اتفاق نہیں ہوا مگر وہ سواری اس سے زیادہ خطرناک نہیں ہو گی۔ معلوم ہوتا تھا لیونارڈو صاحب گھر سے خود کشی کا ارادہ کر کے نکلے ہیں یا پھر ان کے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے۔ ہم نے تو کئی بار آنکھیں بند کر لیں۔ خان صاحب اور بٹ صاحب کا احوال ہمیں معلوم نہ ہو سکا۔ بعد میں انہوں نے بتایا کہ ہوائی سفر کے دوران میں انہوں نے آیات قرآنی نہیں پڑھیں تھی مگر کار کے اس سفر میں جتنی بھی آیتیں یاد تھیں دل ہی دل میں پڑھ گئے تھے۔ خدا جانے ہم روم کی کون کون سی سڑکوں سے گزرے اور راستے میں کون کون سے "پلازہ" ہماری نظروں سے گزرے۔ اگر نظارہ دلفریب بھی تھا تو ہمیں اس بارے میں کوئی خبر نہ ہو سکی۔ ہم تمام وقت اپنی جان کی خیر ہی مناتے رہے مگر اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ روم واقعی خوبصورت شہر ہے جو اس جان جوکھوں کے سفر میں بھی ہمیں اچھا لگا۔

روم بھی دنیا کے دوسرے پرانے شہروں کے مانند دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک قدیم شہر اور دوسرا نیا شہر۔ ظاہر ہے کہ قدیم شہر تنگ سڑکوں، گلیوں اور پرانی قسم کی عمارتوں پر مشتمل ہے جب کہ نئے شہر کی سڑکیں کشادہ ہیں دو رویہ فٹ پاتھ ہیں اور خوبصورت درخت بھی لگے ہوئے ہیں۔ بہت سے آثار قدیمہ بھی اب نئے شہر کے حصے میں آ گئے ہیں۔ اس کے علاوہ بالکل نئے علاقے بھی ہیں جہاں جدید عمارتوں کی کمی نہیں ہے۔ جدید سڑکیں تو تارکول سے بنی ہوتی ہیں لیکن روم کے اکثر علاقوں میں ہم نے پتھروں اور اینٹوں کی سڑکیں بھی دیکھیں۔ کچھ روم ہی پر منحصر نہیں ہے، اٹلی کے دوسرے شہروں میں بھی پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جوڑ کر بنائی ہوئی سڑکیں اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں اور بہت خوشنما لگتی ہیں۔ ہم نے زیادہ تر سفر کشادہ سڑکوں اور کھلے علاقوں میں کیا۔ اگرچہ ابھی رات کا اندھیرا نہیں پھیلا تھا پھر بھی سڑکوں پر نصب خوبصورت روشنیاں روشن ہو گئی تھیں اور یہ منظر بہت خوبصورت اور عجیب تھا۔ پس منظر میں آسمان گلابی ہو رہا تھا اور پیش منظر میں ابھی تک سورج نے ہار نہیں مانی تھی اور اس کی روشنی چاروں اطراف میں پھیلی ہوئی تھی اس کے باوجود سڑکوں کی روشنیاں اور نیون سائین روشن تھے اور یہ منظر نہایت دلفریب اور دلنواز تھا۔

ایک چوڑی سی سڑک سے ہم لوگ ایک پتلی سی سڑک پر مڑ گئے اور پھر ایک بڑا طرز کی حویلی کے بڑے سے گیٹ میں داخل ہوئے جس کا ڈرائیو وے کافی طویل تھا۔ چاروں طرف لان اور سبزہ زار تھے اور بلند و بالا درخت سنتریوں کے مانند ایستادہ تھے۔ اس ماحول میں یہ ولا یا حویلی بے حد خوبصورت اور شاندار لگ رہی تھی۔ لیونارڈو نے جیسے ہی قدیمی پورچ میں کار روکی ایک وردی پوش اسمارٹ ملازم نمودار ہوا اور اس نے کار کا دروازہ کھول دیا۔ شیشے اور ساگوان کے بنے ہوئے دروازے سے گزر کر ہم ایک راہداری میں اور پھر ایک شاندار ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے جو قدیم و جدید انداز کے فرنیچر سے آراستہ تھا۔ ہمارے صوفوں پر بیٹھتے ہی یونیفارم میں ملبوس دو خادمائیں نمودار ہوئیں۔ ان کی یونیفارم خود ان ہی کی طرح اسمارٹ اور خوبصورت تھی۔ لباس ان کا بھی نظر تھا۔ فلموں میں پرانے زمانے کی خادماؤں کو جیسا لباس پہنے ہوئے دکھایا جاتا ہے یہ بالکل اسی یونیفارم میں ملفوف تھیں۔

لیونارڈو بہت اچھا میزبان ثابت ہوا۔۔۔۔۔ پہلے تو اس نے انواع و اقسام کی شرابیں اور وائین ہمارے سامنے پیش کر دیں جن سے صرف خان صاحب ہی فیض یاب ہوئے۔ بٹ صاحب اور ہم جوس ہی پر گزارہ کرتے رہے۔ اس دوران میں خادمائیں بھی باربار جلوہ گر ہوتی رہیں۔ اس کے بعد کھانے کی باری آئی، چار پانچ قسم کی ڈشیں تھیں۔ اور سب کی سب اطالوی تھیں۔ ہمیں تو ابلے ہوئے چاول اور بھنے ہوئے مرغ والا پکوان پسند آیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم لائبریری میں پہنچ گئے۔ دیوار میں پیوست لکڑی کی الماریوں اور ریکس میں کتابیں اور پرانے نوادرات سجے ہوئے تھے ایک جانب قیمتی لکڑی کی میز تھی اور تین اطراف میں آرام دہ صوفے لگے ہوئے تھے۔ لیونارڈو نے ہمیں مختلف کتابوں کے بارے میں بتایا جو خاصی کمیاب بلکہ نایاب قسم کی تھیں پھر اس نے ایک حصہ دکھایا جس میں قابل اعتراض یا ممنوعہ کتابیں موجود تھیں۔ اس نے بتایا کہ یہ کتابیں مختلف ادوار میں ممنوعہ رہی ہیں مگر ان کے قیمتی نسخے لائبریری میں موجود تھے۔ ان میں سے بعض تو اوریجنل تھیں اور لیونارڈو کے بیان کے مطابق بعض کتابوں کی قیمت لاکھوں ڈالرز میں تھی۔ دیواروں پر پینٹنگز بھی آراستہ تھیں۔ یہ سب مشہور اور معروف مصوروں کے شاہکار تھے۔ ہم لوگوں کو مصوری کے شاہکاروں کے بارے میں زیادہ علم اور سوجھ بوجھ نہیں ہے۔ البتہ ان میں عریاں اور نیم عریاں خواتین کی تصاویر کی اکثریت

تھی۔ خان صاحب بار بار ہمارے کان میں کہتے رہے کہ سب بیہودہ تصویریں ہیں۔ مجھے تو شرم آ رہی ہے۔

تھوڑی دیر بعد خادمائیں کافی لے آئیں اور ہم لوگوں نے چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں نارڈو کی دیکھا دیکھی دودھ اور کریم کے بغیر کافی پی۔ اس نے تو چینی بھی استعمال نہیں کی تھی مگر ہم سے یہ بدذوقی سرزد نہ ہو سکی۔ دونوں خادمائیں خاصی صحت مند اور قبول صورت تھیں اور نہایت شائستگی کے ساتھ اپنے کاموں میں مصروف تھیں۔

لیونارڈو نے انہیں رخصت کرنے کے بعد ہماری طرف دیکھا اور کہا "دوستو! کل ہم روم کے سب سے مہنگے نائٹ کلب جائیں گے۔ ایسی خوبصورت لڑکیاں اور اتنا خوبصورت پروگرام آپ نے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہو گا۔" اس کا اندازہ بالکل درست تھا۔ ہم نے تو سرے سے نائٹ کلب ہی نہیں دیکھا تھا۔

خان صاحب میٹھی وائین کے دو گلاس نوش فرما چکے تھے اور لیونارڈو کے اصرار پر "جن" کا ایک گلاس بھی پی چکے تھے۔ لہٰذا اس وقت موج میں تھے۔

لیونارڈو نے خاصی بلانوشی کی تھی مگر وہ پوری طرح ہوش و حواس میں تھا اور اس کی زیادہ توجہ خان کی جانب مبذول تھی۔

"دی گریٹ خان!" اس نے خادماؤں کے رخصت ہونے کے بعد خان صاحب کو مخاطب کیا "اب آپ یہ بتائیں کہ آپ کے پاس مال کتنا ہے؟"

اس اچانک سوال سے ہم گھبرا گئے۔ ہمارے اندیشے کے مطابق وہ ہم سے رقم چھیننے کے بعد ہمیں قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ خان صاحب کا جو تھوڑا بہت نشہ تھا وہ ایک دم ہرن ہو گیا اور وہ اٹین شن ہو کر صوفے پر بیٹھ گئے۔

"مال؟" انہوں نے دہرایا۔

"اور کیا" لیونارڈو نے مسکرا کر کہا "آپ اتنے بڑے خان ہیں آپ کے پاس تو بہت مال ہو گا؟"

خان بولے "ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ جیسی چاہو قسم لے لو۔"

لیونارڈو ہنس پڑا اور اس کے سفید موتیوں جیسے دانت چمکنے لگے "میں پیسے کی بات نہیں کرتا۔ حشیش کی بات کر رہا ہوں۔"

"حشیش؟" ہم سب کی زبان سے بیک وقت نکلا۔

"ہاں، ماری جوانا۔ سمجھ گئے نا، آپ لوگ پاکستانی ہیں، اتنے بڑے خان ہیں۔ آپ کے پاس تو بہت کچھ انتظام ہو گا۔"

ہم تینوں خاموشی اور پریشانی سے ایک دوسرے کا چہرہ تکتے رہے۔ پھر خان صاحب نے گلا صاف کیا اور بولے "لیونارڈو صاحب! آپ کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہمارے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں ہم لوگ تو سگریٹ تک نہیں پیتے۔"

لیونارڈو ہنسنے لگا "کم آن مسٹر خان! مجھے بیوقوف بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سب سمجھتا ہوں میرا اندازہ غلط نہیں ہو سکتا۔ آپ لوگ "ڈیلر" کی تلاش میں وہاں پیازہ میں گھوم رہے تھے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

چشم زدن میں ایک بجلی سی کوندی اور میری سمجھ میں ساری بات آ گئی۔ اس وقت تک ہیروئن کا شور نہیں ہوا تھا۔ کوکین، چرس، حشیش اور ماری جوانا کا بہت زور تھا اور پاکستانیوں نے اس کاروبار میں نیا نیا نام پیدا کرنا شروع کیا تھا۔ مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی وہ تینوں میری طرف دیکھنے لگے۔

"کیوں، میرا اندازہ درست ہے نا" لیونارڈو نے اطمینان سے پوچھا۔

میں نے باقاعدہ قہقہے لگا کر ہنسنا شروع کر دیا۔ خان صاحب اور بٹ صاحب سمجھے کہ شاید میرے دماغ پر اثر ہو گیا۔ میں نے کہا "مسٹر لیونارڈو! افسوس کہ آپ نے بہت زبردست دھوکا کھایا ہے۔ ہم تو سیدھے سادے ٹورسٹ ہیں اور اپنی ہی مشکل میں گرفتار ہیں۔"

وہ بے یقینی سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ ہم نے اپنی جیب سے پاسپورٹ نکال کر اسے دکھایا۔ خان صاحب کا پاسپورٹ بھی پیش کر دیا۔ ان پاسپورٹوں میں ہم لوگوں کا پیشہ بھی درج تھا۔ وہ باری باری پاسپورٹ کو اور ہم لوگوں کو دیکھتا رہا۔

میں نے کہا "ہم نے آپ پر رعب جمانے کے لئے جھوٹ بول دیا تھا۔ مسٹر خان کوئی نواب یا راجہ نہیں ہیں۔ یہ تو ایک کمپنی میں ملازم ہیں۔"

لیونارڈو چند لمحے خاموشی سے ہم تینوں کو گھورتا رہا۔ خان صاحب سہمی ہوئی آواز میں بولے "یہ ہمیں قتل کر کے لان میں دفن کر دے گا۔"

بٹ صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ فیصلہ کن انداز میں بولے "یہ سمجھتا کیا ہے۔ ایمان سے دو چار کو مارے بغیر نہیں مریں گے۔ یہ بھی یاد رکھے گا کہ کبھی پاکستانیوں سے واسطہ پڑا تھا۔"

ہم نے کہا "ہم نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ معاملہ گڑ بڑ لگتا ہے۔ مگر تم لوگوں نے ہماری ایک نہ سنی۔"

لیونارڈو یکایک صوفے پر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں ہم لوگوں کے چہروں پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر وہ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر خان صاحب کی طرف بڑھا وہ فوراً اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ میں اور بٹ صاحب بھی بد ترین حالات کا سامنا کرنے کے لئے کھڑے ہو گئے تھے۔

"سینور" وہ اپنی خوبصورت اور پر اثر آواز میں کہنے لگا "واقعی غلطی مجھ سے ہوئی ہے۔ میں اپنے تمام الفاظ اور ہر پیشکش واپس لیتا ہوں۔ آپ لوگ جا سکتے ہیں" اس نے دیوار پر لگی ہوئی برقی گھنٹی دبائی اور ایک خادمہ اندر آ گئی۔ چند الفاظ میں اس نے خادمہ کو کچھ ہدایات دیں اور پھر ہماری طرف مخاطب ہو کر بولا "میرا شوفر آپ کو ہوٹل چھوڑ آئے گا۔ گڈ نائٹ اور گڈ بائی۔" اتنا کہا اور وہ تیزی سے کمرے سے باہر چلا گیا۔

ہم کچھ دیر تو خاموش سناٹے میں رہے۔ پھر خادمہ کی نرم آواز نے ہمیں چونکا دیا۔ "سینور" وہ ہمیں باہر چلنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ ہمارے پورچ تک پہنچنے سے پہلے وہی ملازم کار کے پاس پہنچ کر ہمارا منتظر تھا اس نے ہماری آمد پر کار کا دروازہ کھولا اور بڑے مودبانہ انداز میں ہمیں کار میں بٹھایا اور کار ہمیں لے کر چل پڑی۔ وہ نہایت مناسب رفتار سے کار چلاتا رہا مگر اس بار ہم پہلے سے زیادہ خوفزدہ تھے۔ ہزار قسم کے شکوک و شبہات اور وسوسے ہمارے دلوں میں پیدا ہو رہے تھے مگر جب ہمیں وہی راستے، سڑکیں، پلازہ اور نیون سائین نظر آنے لگے جو ہم نے آتے ہوئے دیکھے تھے تو ہماری جان میں جان آ گئی۔ اب سڑکوں پر اندھیرا پھیل چکا تھا اور بالکل رات کا سماں تھا۔

ہم ہوٹل پہنچے تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ استقبالیہ میز کے سامنے مسٹر گوویدو بیٹھے کچھ حساب کتاب کر رہے تھے۔ لیونارڈو کے شاندار ولا کے مقابلے میں یہ ہوٹل بے حد معمولی اور بے وقعت سا تھا۔ مگر ہمیں یوں لگا جیسے ہم بہت پر سکون اور عظیم الشان جگہ واپس آ گئے ہیں۔ بالکل اپنے گھر جیسا اطمینان محسوس ہو رہا تھا۔ باورچی خانے کی طرف سے زنانہ اور مردانہ آوازوں میں گانے اور گٹار بجانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شاید مسٹر گوویدو کے اہل خانہ دن بھر کی تھکن اتارنے کے لئے موسیقی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ دوسرے لمحے ایک مگ ہاتھ میں لئے سلوی نمودار ہوئی۔ ہم لوگوں کو دیکھا تو وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ شاید ہماری تھکن اور بیزاری ہمارے چہروں سے ظاہر ہو رہی تھی۔

"سینور" اس نے مسکراتے ہوئے ہمیں دیکھا۔ "کوفی؟"

ہم شکریہ ادا کر کے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ کسی نے آپس میں کوئی بات نہیں کی۔ لباس تبدیل کیا اور خاموشی سے بستروں میں لیٹ گئے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ہم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا یا پھر کوئی فلم دیکھ کر آئے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد آنکھ لگ گئی۔

آنکھ کھلی تو دن نکلا ہوا تھا اور عقبی کھڑکی سے ہارنوں کی فلک شگاف آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ رات کھڑکی کھلی رہ گئی تھی اس لئے شور و غل بھی زیادہ تھا۔ ہم نے کھڑکی سے باہر جھانک کر روم کی تازہ ہوا (بشرطیکہ وہ تازہ تھی) کو معدے میں کھینچا اور پھر جھک کر نیچے سڑک کی جانب نظر ڈالی۔ سڑک پر ٹریفک جام ہو رہی تھی۔ درمیان میں ایک ٹرک اور ایک کار آمنے سامنے کھڑی تھی اور ان کے پیچھے دونوں جانب کاروں کی ایک لمبی قطار حد نظر تک دکھائی دے رہی تھی یعنی روم کا ایک اور ٹریفک جام، معمول کے عین مطابق۔

ناشتے کے لئے ہم نے مسٹر گوویدو کو فون کیا۔ ادھر سے ایک انجانی سی زنانہ آواز سنائی دی۔ ہم نے ناشتے کے لئے کہا مگر ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ اپنی ہانکتی رہیں ہم اپنی بیان کرتے رہے۔ یہاں تک کہ تنگ آ کر فون بند کرنے کا ارادہ کیا۔ لڑکی نے پکار کر "بابا" کو آواز دی اور مسٹر گوویدو نے فون لے لیا۔ "ایلو؟" ہم نے انہیں اپنی مشکل بتائی وہ زور زور سے ہنسنے لگے پھر بولے "مائی چائلڈ' نو انگلش' اونلی اٹیلین' یعنی یہ میری لڑکی انگریزی بالکل نہیں جانتی صرف اطالوی جانتی ہے۔ بہرحال ہمیں تو ناشتے سے غرض تھی۔ اس عرصے میں سب تیار ہو چکے تھے۔ خان صاحب غسل کر آئے تھے اور غسل خانے کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ ہم نے صرف منہ ہاتھ دھونے پر گزارہ کیا تھا کیونکہ پہلے باتھ روم کا تصور ہمیں پسند نہیں آیا تھا' پھر ہم رات کے واقع پر رائے زنی کرتے

رہے۔

یہ ۱۹۶۹ء کی بات ہے۔ پاکستانیوں کو لوگ منشیات کے اسمگلر جانیں گے یہ بات ہمیں بہت افسردہ کر گئی تھی۔ غالباً" ہمارے اہل وطن نے اس زمانے میں منشیات کے دھندے میں نیا نیا قدم رکھا تھا۔ بعد میں تو انہوں نے اس شعبے میں جو نام پیدا کیا وہ سب کے علم میں ہے۔ دروازے پر دستک ہوئی اور خوشبو کا ایک جھونکا ناشتے کا سامان ٹرے میں سجائے اندر داخل ہوا۔ ہم سب کے لئے یہ چہرہ بالکل نیا تھا۔ برس پندرہ یا سولہ کا سن مگر اٹھان ایسی کہ اٹلی کی فلم ایکٹریسوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ سنہری بال' سنہری رنگت' چھوٹا سا قد اور شربتی آنکھیں۔ ہم تو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے مگر اس دوشیزہ پر کچھ اثر نہ ہوا۔ ناشتے کی ٹرے میز پر رکھنے کے بعد وہ مسکرائی اور کمرے سے رخصت ہو گئی۔ نیچے گئے تو استقبالیہ میز پر مسٹر گوویدو اکیلے بیٹھے تھے۔ ہمیں ٹیلی فون کال کرنی تھی۔ اس لئے مسٹر گوویدو کے پاس چلے گئے۔ انہوں نے فوراً ہمارے مطلوبہ فون نمبر ملانے شروع کر دیئے۔ میز پر ہم نے اٹلی کے مختلف مناظر کے ویو کارڈ دیکھے تو فوراً سویرا میں ایک خریدا اور سامنے والی میز پر جا کر گھر والوں کو خط لکھنے لگے۔ یکایک وہی خوشبو پھر مہکی اور ہمارے شانے کے اوپر سنہری ریشمی بالوں والا ایک سر نمودار ہو گیا۔ اس کے بعد ماہتابی پیشانی اور پھر دو شربتی مسکراتی ہوئی آنکھیں۔ ہم نے حیران ہو کر دیکھا اور پھر خط لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ لڑکی جس طرح اچانک نمودار ہوئی تھی اسی طرح غائب ہو گئی۔ جیسے کوئی روح تھی۔ چند لمحے بعد ہمارے شانے کے اوپر مسٹر گوویدو کا گنجا سر نمودار ہوا اور پھر مسکراتا ہوا گول مٹول چہرہ' وہ بھی ہمارے کاندھے کے اوپر سے ہمیں خط لکھتے دیکھتے رہے پھر پوچھنے لگے۔ "اگر اعتراض نہ ہو تو بتا سکتے ہیں کہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

ان کی یہ دخل در معقولات ہمیں بالکل پسند نہ آئیں۔ ان کے برابر میں وہی خوشبو دار لڑکی کھڑی ہمیں اپنی حیران شربتی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

ہم نے کہا "خط لکھ رہے ہیں۔"

"خط لکھ رہے ہیں؟ یہ کون سی زبان ہے جو دائیں سے بائیں لکھی جاتی ہے؟"

ہم نے بتایا کہ یہ اردو ہے جو پاکستان کی قومی زبان ہے۔ انہوں نے یہ معلومات فوراً اطالوی میں ترجمہ کر کے دوشیزہ کو بتا دیں۔ پھر اس کے دریافت کرنے پر ہم سے پوچھا "یہ حروف ہیں یا آپ تصویریں بنا رہے ہیں۔ جیسے چینی اور جاپانی بناتے ہیں؟"

ہم نے انہیں سمجھایا کہ یہ باقاعدہ حروف ہیں اور ہماری زبان بہت ترقی یافتہ زبان ہے۔ دنیا بھر میں بولی جاتی ہے اور اس کی اپنی قواعد ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہم نے باقاعدہ لیکچر دینا شروع کر دیا تو مسٹر گوویدو نے نرمی سے کہا "سینور۔ یہ میری بیٹی ہے اس کا نام میرینا ہے یہ آپ کو اس طرح چھوٹے چھوٹے گول گول دائرے بناتے دیکھ کر بہت حیران ہوئی ہے۔ اسے نئی نئی چیزیں دیکھنے اور حیران ہونے کا بہت شوق ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ کا خط ختم ہو گیا یا ابھی باقی ہے؟"

ہم نے کہا "ابھی باقی ہے اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو شاید کبھی ختم نہ ہو گا۔"

انہوں نے ہمارے طنز کو نظرانداز کر دیا یا شاید سمجھے ہی نہیں' بولے "آپ شوق سے اپنا خط لکھتے رہئے لیکن اگر برا نہ مانیں تو کیا میرینا آپ کے پاس کھڑی ہو کر آپ کو لکھتا ہوا دیکھ سکتی ہے؟"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں' ایسی خوشبو دار اور طرحدار لڑکی ہمارے نزدیک کھڑی رہے اور اس کے سنہری بال ہمارے شانوں پر لہراتے رہیں اور ہم خط لکھتے رہیں۔ بھلا اس سے بڑھ کر اور کیا مسرت ہو سکتی ہے۔ ہم نے خوش ہو کر کہا "ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ آپ ہمیں دو تین ویو کارڈ اور دے دیں۔ ہم اپنے دوستوں اور عزیزوں کو بھی لکھیں گے۔"

وہ بولے "ضرور ضرور تو کیا یہ خط آپ سینورنیا کو لکھ رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے اپنی مسز کو؟"

ہم نے فوراً صفائی پیش کی "ہم ابھی تک مسز سے محفوظ ہیں۔"

انہوں نے سرتاپا ہمارا جائزہ لیا اور پھر ہنستے ہوئے اپنا بھاری ہاتھ ہمارے کندھے پر اس طرح مارا کہ ہم ایک طرف کو جھک گئے۔ بولے "ویری لکی' ویری لکی۔"

اس کے بعد ظاہر ہے کہ ہم نے تینوں وی کارڈ لکھے اور میرینا ہمارے پاس کھڑی حیرت سے دیکھتی رہی۔ جب ہم لکھتے لکھتے رک جاتے تو وہ مسکرا کر ہماری جانب دیکھتی اور ہم دونوں میں بے معنی مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوتا۔ ہم پھر سوچ سوچ کر لکھنا شروع کر دیتے جس تیزی سے ہم بقول مسٹر گوویدو گول گول دائرے بنا رہے تھے میرینا اسے ہماری

مہارت سمجھ رہی تھی۔ وہ زندگی میں پہلا اور آخری موقع تھا جب ہمیں اردو زبان کی افادیت کا احساس ہوا۔ افسوس کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی زبان سے قطعی ناواقف تھے ورنہ خاصی اچھی اور نتیجہ خیز گفتگو رہتی۔

ہمارے خطوں کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ مسٹر گوویدو نے ہماری کال ملا دی۔ یہ پی آئی اے والے تھے۔ ہم نے خوشی خوشی فون سنبھالا اور انہیں صورت حال سے آگاہ کیا۔ خاصے نستعلیق آدمی تھے۔ ساری بات سن کر بولے "پردیس میں اس قدر لمبی بات کرنے کی ضرورت تو نہیں تھی مگر بہرحال آپ نے کر ہی لی تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ مختصراً" یہ عرض کر دوں کہ ایک صاحب آپ کے لئے ہمیں پیغام دے گئے تھے۔ ان کا پتا اور فون نمبر ہمارے پاس ہے۔ آپ چاہیں تو فون نمبر لکھا دوں یا پھر آپ خود یہاں تشریف لے آئیں۔"

ہم نے کہا "آپ نے بھی بلا ضرورت اس قدر لمبی بات کر دی ہے حالانکہ یہاں آپ بھی پردیسی ہی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ دو تین سال کے مہمان ہیں۔ بہرحال آپ ہمیں نام اور پتا فون پر ہی لکھوا دیں کیونکہ ٹیکسی کے لئے ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں یا پھر اگر آپ آنے جانے کا ٹیکسی کرایہ ادا کریں تو ہم فوراً آ سکتے ہیں۔"

وہ بولے "تو پھر آپ پتا ہی لکھ لیجئے۔"

ان کے بتائے ہوئے نمبر پر فون کیا تو لائین پر دوسری طرف ایک خاتون نے انتہائی خوبصورت لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے اطلاع دی کہ مسٹر گورڈن گروسری خریدنے گئے ہوئے ہیں۔ ہم نے اپنا نام اور نمبر بتایا اور ساتھ ہی جتا دیا کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں اور ان سے ہمارا رابطہ بے حد ضروری ہے۔ خان صاحب ایک طرف صوفے پر منہ پھلائے بیٹھے تھے۔ بٹ صاحب نے بتایا کہ وہ جیلس ہو گئے ہیں۔ ہم نے کہا "بھائی! آپ کو کس نے منع کیا ہے۔ آپ بھی ایک ویو کارڈ خرید کر لکھیں۔ میرینا آپ کے پاس بھی آ کر کھڑی ہو جائے گی۔"

کہنے لگے "ویو کارڈ کہاں سے خریدوں۔ میرے پاس تو آئس کریم کھانے کو بھی پیسہ نہیں ہے۔"

ہم نے نہایت فراخدلی سے سولیرا کا سکہ ان کے حوالے کیا تو وہ بے یقینی سے ہمیں تکنے لگے۔

ہم نے کہا "آئس کریم اور تربوز کھانے کے لئے لیرا چاہئیں تو وہ بھی لے لو۔

کہنے لگے "خیر تو ہے تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا رات کے واقع کی وجہ سے۔"

ہم نے کہا "جس شخص سے ہمیں ڈالرز لینے ہیں وہ مل گیا ہے بس تھوڑی دیر بعد ہم رئیس ہو جائیں گے۔"

یہ خبر ان دونوں کے لئے انتہائی خوش کن تھی۔ خان صاحب نے فوراً ایک ویو کارڈ خریدا اور وہیں کھڑے ہو کر لکھنے لگے جہاں ہم کھڑے ہوئے تھے۔ میرینا نے گردن موڑ کر ان کی طرف دیکھا اور پھر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ دراصل بات یہ تھی کہ خان صاحب نے انگریزی میں خط لکھنا شروع کر دیا تھا جس میں ظاہر ہے کہ میرینا کو دلچسپی نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد مسٹر گورڈن کا فون آیا ہم سب کا موڈ بہت اچھا تھا اور ہم نے مسٹر گوویدو کے مشورے سے روم میں گھومنے پھرنے کا طویل پروگرام مرتب کر لیا تھا۔ مسٹر گورڈن بہت شریف آدمی نکلے پہلے تو معذرت کرتے رہے پھر بولے "اچھا ہی ہوا کہ آپ کے پاس ڈالر نہیں تھے ورنہ یہ کم بخت روم کے لٹیرے آپ کی جیب کاٹ لیتے۔"

وہ گزشتہ نو سال سے روم میں مقیم تھے۔ قوم کے امریکی تھے روم میں رہنے کی وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ یہ شہر بہت اچھا لگتا ہے حالانکہ ایسی کوئی بات بھی نہیں ہے۔ مہنگائی بہت زیادہ ہے صفائی بھی ٹھیک نہیں ہے لوگوں میں تنظیم نہیں ہے' مگر یہاں کے کھنڈر بہت اچھے ہیں اور پھر لڑکیوں کی تو بات ہی کیا ہے۔ زبان کی تیز اور قدرے موٹی ہوتی ہیں۔ مگر خوب ہوتی ہیں۔ یہ سب کچھ انہوں نے ہمیں فون ہی پر بتا دیا۔ پھر کہنے لگے کہ آپ کے ڈالرز میرے پاس موجود ہیں مگر میں شام سے پہلے نہیں آ سکتا۔ آپ کہیں تو ٹیلی گرام کے ذریعے روانہ کر دوں۔

خاصے دلچسپ آدمی لگتے تھے۔ ہم نے کہا "شام کو آپ آیئے اور کھانا بھی ہمارے ساتھ ہی کھایئے۔" ہم انہیں پتا سمجھانے لگے تو بولے

"رہنے دیں نو برس میں روم کی گلیاں ہی تو ناپی ہیں۔ میں پہنچ جاؤں گا مگر ہم دو افراد ہوں گے اگر کھانا کم ہوا تو آدھے پیٹ ہی کھا لیں گے۔" ان کی یہ بے تکلفی بھی ہمیں بہت اچھی لگی۔

سب کاموں سے فارغ ہو کر ہم روم کی سیر پر نکل کھڑے ہوئے۔ جیب سے نکال کر گنے تو تقریباً پونے تین ہزار لیرا ہمارے پاس تھے۔ طے پایا کہ پیدل گھوم کر یا بسوں میں سوار ہو کر سیر کریں گے۔ ہم جس علاقے میں تھے اس کے آس پاس بے شمار تاریخی عمارتیں، کلب، ریستوران، پلازہ وغیرہ تھے۔

روم میں مقبروں کی بھی کمی نہیں ہے حالانکہ دیکھنے میں وہ مقبرے نہیں لگتے مگر گائیڈ اور مقامی لوگ یہی بتاتے ہیں کہ یہ فلاں صاحب کی قبر ہے یا فلاں مندر ہے۔ جہاں قدیم رومن شعلوں کی پوجا کیا کرتے تھے۔ اور یہاں خوبصورت کنواری پجارنیں اور دیوداسیاں خدمت کے لئے موجود ہوا کرتی تھیں۔ ہر ملک اور ہر شہر کی اپنی داستانیں ہوا کرتی ہیں۔ کچھ سچی اور کچھ جھوٹی مگر سچ تو یہ ہے کہ قدیم روم میں جو کھیل تماشے عیش و عشرت کے مزے اور عیاشی کے جو طریقے تھے انہیں ساری دنیا جانتی ہے اور ان کے بارے میں چاہے جتنے مبالغے سے کام لیا جائے وہ درست ہی نکلیں گے۔

روم کی سڑکوں پر زیادہ تر کاریں اٹلی کی ساختہ فیاٹ الفارومیو اور لانسیا تھیں۔ چھوٹے سائز کی یہ پھرتیلی کاریں شہر کی سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر عجیب و غریب کرتب دکھاتی رہتی تھیں۔ بریک تو شاید ان میں ہوتا ہی نہیں اور چلانے والوں کی نظر بھی بہت کمزور ہوتی ہے کیونکہ وہ نہ تو ٹریفک کی روشنیوں کو دیکھ سکتے ہیں نہ پیدل راہ گیروں کو دیکھتے ہیں اور نہ ہی سڑکوں اور فٹ پاتھوں میں کوئی امتیاز کرتے ہیں۔ جس طرح یونان کے شہروں میں ایک تہوار ہوتا ہے جس روز مست بیل سڑکوں پر چھوڑ دیے جاتے ہیں جو راہ گیروں کے پیچھے بھاگتے اور انہیں ٹکریں مارتے ہیں اور راہ گیران سے بچنے کے لئے پناہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں یہی عالم روم میں کاروں کا ہے جو سڑکوں پر چھوڑ دی جاتی ہے تو جانیں بھرے کھلونے کی طرح رکنے کا نام نہیں لیتیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ یونانی اس کھیل میں جان بوجھ کر شریک ہوتے ہیں اور اس سے لطف اٹھاتے ہیں۔ جب کہ روم میں راہ گیروں کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کھیل میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ روم کی سڑکوں پر جب گھوڑا گاڑی دیکھی تو کراچی یاد آگیا۔ اسے آپ فٹن یا بگھی بھی کہہ سکتے ہیں۔ سیاحوں کو یہ سواری بہت مرغوب ہے۔ جس طرف دیکھئے (بعض مخصوص علاقوں میں) سیاح مرد اور عورتیں بگھی میں سوار ہنستے کھیلتے سفر کرتے نظر آتے ہیں۔ دوپہر ہوتے ہی روم کے لوگ قیلولہ کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ بگھی کے گھوڑوں کو بھی سایہ دار درختوں کے نیچے توبڑے چڑھا کر چھوڑ دیا جاتا ہے اور کوچوان بگھی میں ہی سو جاتے ہیں۔ سنا ہے کہ قیلولہ ہندوستان کے رئیس اور نواب وغیرہ کیا کرتے تھے مگر روم کے لوگ بھی قیلولہ کے معاملے میں نوابوں سے کم نہیں ہیں۔ چھوٹا بڑا ہر فرد دوپہر کو اپنا کام چھوڑ کر بارہ بجے کے بعد کھانا کھا کر قیلولہ کرتا ہے اور اس دوران دفاتر، دکانیں یہاں تک کہ ریستوران بھی بند ہو جاتے ہیں۔ یہ وقت بے چارے سیاحوں پر بہت بھاری ہوتا ہے۔ خاص طور پر جسے رومنوں کی اس عادت کا علم نہ ہو وہ تو بے خبری میں مارا جاتا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی یہی معاملہ گزرا، دوپہر کو بھوک لگی تو دیکھا کہ دکانیں بند، سڑکیں ویران، جسے دیکھئے سو رہا ہے یا سونے کے لئے جا رہا ہے۔ اکثر ریستوران بھی بند ملے۔ یہاں تک کہ پولیس کے سپاہی بھی نظر نہیں آئے۔

چار بجے کے بعد اور عموماً" پانچ بجے سے زندگی کے معمولات دوبارہ شروع ہو جاتے ہیں اور جوں جوں رات جوان ہوتی ہے، روم کی رونقیں بھی بڑھتی جاتی ہیں اور آدھی رات کو اپنے عروج پر ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دکانیں اور ریستوران وغیرہ صبح دیر سے کھلتے ہیں۔ ہمارے سامنے والے فٹ پاتھ پر بہت ہجوم والا ریستوران تھا۔ صبح دس گیارہ بجے وہاں لوگ صفائی کرتے نظر آتے تھے اور تندرست خواتین آستینیں چڑھا کر کھانا پکانے کی تیاری میں مصروف ہوتی تھیں۔ گرمی ویسے کمروں میں تو محسوس نہیں ہوتی تھی لیکن دھوپ میں خاصی تمازت تھی۔ لوگوں کے چہرے تمتمائے ہوئے نظر آتے تھے شاید موسم ہی کا اثر ہے کہ روم (اور اٹلی) کے لوگ یورپ کے دوسرے ٹھنڈے ملکوں کے لوگوں کے مقابلے میں سست کاہل اور آرام طلب ہوتے ہیں۔ سائے تلے بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ریڑھے اور ٹھیلے والے، خاص طور پر آئس کریم اور تربوز

فروش خوب کاروبار کرتے ہیں۔

پہلے تو کچھ دیر ہم پیدل گھومتے رہے۔ کچھ بھی ہو یہ حقیقت ہے کہ روم کی پر رونق سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر پیدل گھومنا بھی ایک تفریح ہے۔

فٹ پاتھوں پر سیاحوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ دنیا بھر کی خواتین اٹلی کے نوادر، آثار قدیمہ اور وجیہ مردوں کو دیکھنے کے لئے جوق در جوق یہاں آتی ہیں اور اٹلی کے مرد بھی انہیں مایوس نہیں کرتے۔ راہ چلتی لڑکیوں اور حسیناؤں کو دیکھ کر سیٹی بجانا، پاس سے گزرتے ہوئے چٹکی بھرنا، یا ہاتھ مار دینا کوئی انہونی بات نہیں ہے اور خواتین بھی "بدمزہ" نہیں ہوتیں۔ شاید یہ آزادی یہ سیاح خواتین اٹلی کے سوا کسی اور ملک کے مردوں کو نہیں دیتیں ادھر عورتوں کو دیکھئے تو ان کے پیچھے مرد سیاح دیوانے ہوتے ہیں۔ دلکشی اور رعنائی کی ہم نے روم میں کمی نہیں دیکھی مگر سچ تو یہ ہے کہ جنسی کشش اور جسمانی رعنائی کے علاوہ نزاکت اور باریکی بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ بھرے بھرے جسم، بے باک انداز، بے حجاب لباس، اٹلی کی عورتیں ایک مختلف قسم کے حسن کی مالک ہیں۔ دبلی پتلی اور اسمارٹ تو کم عمر لڑکیاں ہی ہوتی ہیں۔ جوں جوں نوجوانی کی عمر سے آگے نکلتی ہیں جسم پر تہ چڑھنے لگتی ہے۔ پہلے تو یہ اچھا لگتا ہے مگر پھر موٹاپے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ کھاتی پیتی بہت ہیں اور روغن کھانے کھا کر قیلولہ بھی ضرور کرتی ہیں۔

ہم مختلف علاقوں اور سڑکوں سے گزرے۔ چند "پیازہ" بھی نظر آئے۔ عموماً یہ سب معمولی سے فرق کے ساتھ ایک جیسے ہی لگتے ہیں۔ چند یا ایک قدیم عمارت، سامنے کھلا میدان، ستونوں والی عمارتیں، محرابوں والے گرجا گھر، سیڑھیوں کا رواج یہاں کافی ہے۔ ہر قدیم عمارت میں جانے کے لئے تھوڑی بہت یا زیادہ سیڑھیاں ضرور طے کرنی پڑتی ہیں۔ ہمیں "ہسپانوی زینے" دیکھنے کا بھی بہت شوق تھا۔ ہالی ووڈ کی فلم "رومن ہالی ڈے" میں ان سیڑھیوں پر آڈرے ہیپ برن کو کون آئس کریم کھاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ یہیں گریگری پیک اور آڈرے ہیپ برن کے مابین رومانی باتیں بھی ہوئی تھیں۔ اس لئے ہم بھی (اسپینش اسٹیپ) دیکھنے کو ترس رہے تھے۔ سچ پوچھئے تو فلم "رومن ہالی ڈے" میں ہم نے جتنا بھی روم دیکھا تھا وہ ہمارے دل پر نقش تھا اور آنکھوں میں بسا ہوا

تھا۔ ہم نے وہ سب مقامات دیکھے مگر وہ فلم والا لطف نہیں آیا بلکہ بہت سی جگہوں پر تو ہمیں خاصی مایوسی بھی ہوئی۔ بہرحال پہلے "ہسپانوی زینوں" کا احوال سنئے:

بڑی مشکل سے ایک انگریزی بولنے والی سیاح خاتون تلاش کر کے ہم نے ان سے پوچھا کہ "ہسپانوی زینوں" تک جانے کے لئے کون سے نمبر کی بس پکڑیں۔ انہوں نے سامنے کھڑی بس کی طرف اشارہ کر دیا۔ ہم بے تحاشا دوڑ پڑے اور بس چلنے لگی تھی۔ جب اس پر چڑھے۔ کنڈیکٹر نے ہمیں گھور کر دیکھا اور اپنی زبان میں کچھ کہا۔ ظاہر ہے برا بھلا ہی کہا ہوگا۔ مگر دوسرے مسافر مسکرا کر رہ گئے۔ بس بھری ہوئی تھی۔ جون کا مہینہ تھا جو روم میں بھی گرمی کا مہینہ ہوتا ہے۔ سرما میں تو خدا جانے یہ لوگ کیسا لباس پہنتے ہوں گے مگر اس موسم میں اسے لباس کی تہمت کہہ لیجئے۔ کیا مرد اور کیا عورت، کیا مقامی اور کیا غیر ملکی سیاح، سبھی اس شہر میں ننگے نہیں تو نیم عریاں ضرور تھے۔ ہم جس ملک اور ماحول سے گئے تھے اس کے پیش نظر یہ نظارے ہمارے لئے بہت انوکھے تھے حالانکہ دوسرے لوگوں کے یہ معمول میں داخل تھا۔ ان برائے نام لباسوں میں تو کوئی بھی اچھا لگ سکتا ہے۔ پھر وہ تو روم کی دوشیزائیں تھیں۔ رش کا وقت تھا اور لوگ ایک دوسرے سے لگے کھڑے تھے۔ زیادہ تر مسافر اس صورت حال سے مسرور تھے۔ بس ذرا سا بھی جھٹکا کھاتی تو نرم و نازک جسموں کے ساتھ خلط ملط ہو جاتے۔ خان صاحب کا بس چلتا تو زندگی بھر اسی بس میں سوار رہتے۔ ہم نے پھر ایک انگریزی سمجھنے والی خاتون کو تلاش کیا اور ان سے "ہسپانوی زینوں" کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ خود بھی اسی بس اسٹاپ پر اتریں گی۔ ہم بھی ان کے ساتھ ہی اتر جائیں چنانچہ ہم ان پر نظریں جمائے کھڑے رہے۔ بس رکتی اور چلتی رہی، مسافر اترتے اور چڑھتے رہے۔ ہمارے شہروں جیسی دھکم پیل تو نہیں تھی مگر اپنی طرح قطار وطار کی روم والے بھی زیادہ پروا نہیں کرتے، نہ باری کا انتظار کرتے ہیں۔ بس پہلی فرصت میں سوار ہونے اور اترنے کی فکر کرتے ہیں۔ دوسرے جائیں بھاڑ میں۔ مشہور ڈراما نگار اشفاق احمد کافی عرصے سے روم میں رہ چکے ہیں انہیں اطالویوں کی یہ عادت بہت عجیب لگی کہ یورپ والوں کے برعکس کسی ڈسپلن اور تمیز کے قائل نہیں ہیں۔ انہوں نے جب اپنے ایک اطالوی دوست سے تذکرہ کیا تو وہ شانے اچکا کر بولے "تو پھر کیا ہوا؟ ہم اطالوی ہیں۔" لیجئے، ایک ہی فقرے

میں انہوں نے لاجواب کر دیا۔ اٹلی والوں کا یہ جملہ ساری دنیا میں مشہور ہے۔ جب ان کی کسی بات پر اعتراض کریں تو وہ شانے ہلا کر بے پروائی سے کہہ دیتے ہیں: "تو پھر کیا ہوا، ہم اٹالین ہیں" گویا اطالوی ہونے کی وجہ سے انہیں سات خون معاف ہیں۔ بھئی واہ کیسی عجیب اور دلچسپ منطق ہے، مگر روم میں یہ دھکم پیل مزہ دیتی ہے جب کہ اپنے ملک میں بری لگتی ہے۔ شاید ماحول اور مسافروں کے فرق کی وجہ سے۔

جیسے ہی وہ سیاح خاتون ایک اسٹاپ پر اتریں ہم بھی دروازے کی جانب لپکے اور لوگوں کو دھکیلتے ہوئے نیچے اتر گئے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ نہ کسی نے اس پر ہمیں ٹوکا نہ گھورا، نہ برا بھلا کہا۔ بس سے اتر کر ہم اپنا سانس درست کر رہے تھے کہ ان صاحب نے سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ رہے اسپینش اسٹیپ"

زینوں کو دیکھا تو سارا رومان ختم ہو گیا۔ معمولی سی چوڑی پتھریلی سیڑھیاں تھیں کافی عرصہ پہلے کی بنی ہوئی تھیں۔ اس لئے ماہ و سال اور موسموں نے خاصا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ فلم میں جو خوبصورتی دیکھی تھی وہ بالکل نظر نہیں آئی۔ خیر، پھر بھی ان سیڑھیوں پر چڑھ گئے۔ کافی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد اوپر گئے تو وہاں بھی ایک سڑک ہی نظر آئی۔ ہم سمجھے تھے کہ نہ جانے سیڑھیوں کے اوپر پہنچ کر کیا ہو گا؟ البتہ پتھریلی سیڑھیوں پر سیاحوں کی ٹولیاں بیٹھی بیئر اور دوسرے مشروبات اور آئس کریم وغیرہ سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ کبھی کبھار ایک آدھ کبوتر بھی پر پھڑپھڑاتا ہوا آ جاتا تھا۔ دنیا بھر میں مشہور یہ "سیڑھیاں" جنہیں فلموں نے اور زیادہ مشہور کر دیا ہے، اوپر نیچے کی سڑکوں کو ملاتی ہیں اور پیدل چلنے والوں کے لئے شارٹ کٹ ہیں۔ زینے در زینے، مختلف مقامات پر یہ زینے موجود ہیں۔ کسی زمانے میں اس علاقے میں ہسپانیہ کا سفارت خانہ ہوا کرتا تھا جس کی نسبت سے یہ ہسپانوی زینے کہلائے۔ ہمارا خیال تھا کہ شاید ہسپانیہ کے انجینئروں نے انہیں بنایا ہو گا۔ ان زینوں کو منچلے کو اسپاٹ کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں۔ حسیناؤں کی ٹولیاں اپنے شکار بھی یہیں تلاش کرتی ہیں اور منشیات بھی یہاں چھپ چھپا کر دستیاب ہو جاتی ہیں۔ ان زینوں کے گرد و نواح میں فٹ پاتھوں اور عمارتوں میں ریستوران اور شراب خانے ہیں جو سیاحوں اور سیر کرنے والوں سے پر رہتے ہیں۔ عورتیں اور مرد کرسیوں پر بیٹھے کھانے پینے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اور خوش گپیاں کرتے رہتے ہیں۔ خان صاحب اور بٹ صاحب کو بھی یہ زینے دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی۔ انہوں نے بھی فلم "رومن ہالی ڈے" دیکھ رکھی تھی۔ خان صاحب بولے "آپ لوگ تو ولی ہیں، بھائی فلم میں بھی ہم لوگوں کو یہ زینے ہیروئین کی وجہ سے پسند آئے تھے اور اب بھی حسینوں کی ریل پیل دیکھ کر اچھے لگ رہے ہیں۔ زینوں میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔" واقعی بات بھی ٹھیک تھی۔ ہمیں سردار جی کی بات یاد آ گئی کہ نشہ شراب میں نہیں پینے والے میں ہوتا ہے ورنہ بوتل بھی نشے میں کیوں نہیں ناچتی۔ ہمارے خان صاحب بھی کسی غلطی سے انجانے میں بہت پتے کی بات کر جاتے ہیں۔ خان صاحب جو ہوئے۔

رسم نبھانے کے لئے ہم نے بھی سامنے والے فٹ پاتھ پر ایک ریستوران میں کافی پی اور آس پاس گزرنے والے حسین چہروں اور دمکتے ہوئے جسموں کا تماشا دیکھتے رہے۔ وہیں ایک امریکن سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہمارے دیکھتے دیکھتے بلا مبالغہ درجنوں تصویریں اتار چکے تھے مگر ان کا دل نہیں بھرا تھا چنانچہ کیمرے میں ایک نئی فلم ڈال رہے تھے۔ وہ ہم سے باتیں کرنے لگے۔ ساتھ میں وائین بھی پیتے جاتے تھے۔

کہنے لگے "روم بھی لاجواب کھنڈر ہے، اگر اس کی اتنی شہرت نہ ہوتی تو شاید اسے گرا کر ملبہ فروخت کر دیا جاتا اور نیا شہر تعمیر ہو جاتا مگر روم والوں کو پرانی چیزوں سے بہت فائدہ ہے۔ یہ لوگ ان مقبروں اور کھنڈروں کی کمائی کھا رہے ہیں۔"

وہ روم سے خاصے ناراض نظر آ رہے تھے۔ دو دن پہلے کسی نے ان کی جیب سے بٹوہ غائب کر دیا تھا اور ایک فوارے کے پاس وہ اپنا بہت قیمتی کیمرا رکھ کر بھول گئے تھے جو پھر انہیں مل نہیں سکا۔

"جانتے ہو اس شہر کو روم کیوں کہتے ہیں؟" انہوں نے ہم سے پوچھا ہم تینوں نے فوراً سر ہلا کر انکار کر دیا۔

مسکرائے اور بولے "میں بتاتا ہوں یہ تاریخ ہے، کم از کم رومن ایسا ہی کہتے ہیں۔ درحقیقت یہ سب افسانے ہیں۔ سنا ہے کہ دریا میں ایک تختے پر دو بچے بہتے ہوئے یہاں پہنچے تو ایک مادہ بھیڑیے نے انہیں دودھ پلا کر پالا۔ وہ دونوں رومولس اور ریمس ایک دیوتا کے ناجائز بچے تھے۔ اس زمانے میں یہاں ناجائز کاموں کا بہت رواج تھا اور دیوتا

حضرات بھی اس قسم کی حرکتوں سے باز نہیں آتے تھے۔ دیوتا کے یہ ناجائز بچے ایک کنیز کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ جس نے ڈر کے مارے انہیں دریا میں چھوڑ دیا تھا۔ جب یہ بچے جوان ہوئے تو ان دونوں میں لڑائی ہو گئی اور رومولس نے اپنے بھائی ریمس کو قتل کر دیا اس کے بعد اس جگہ کا نام رومولس کے نام پر روم رکھ دیا گیا۔ واللہ اعلم' کتنا سچ ہے اور کتنا جھوٹ ہے۔" وہ اپنی وائین ختم کر کے اٹھ کھڑے ہوئے اور کیمرا سنبھالتے ہوئے بولے "اچھا چلتا ہوں' کچھ اور کھنڈروں اور مقبروں کی تصویریں بناؤں گا۔" عجیب و غریب قسم کے آدمی تھے۔

ہمیں مسٹر گوویدو نے رومنوں کے قیلولے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ سیاحوں کی آمدورفت والی جگھوں پر ریستوران اور دکانیں کھلی رہتی ہیں ورنہ سارا شہر نیند کی آغوش میں ڈوب جاتا ہے۔ دوپہر ہو چکی تھی اس لئے ہم نے کچھ دیر ریستوران میں وقت گزاری کی ٹھانی پھر سوچا کہ پیدل چل کر "فونٹین دی تریوی" جائیں گے۔ یہ فوارہ بھی ہم نے فلم میں دیکھا تھا جس میں آڈرے ہیپ برن نے سکے پھینکے تھے اور یہ تمام منظر ہمیں بہت اچھا لگا تھا۔

پروگرام کے مطابق روم کی گرمی میں پیدل چلتے ہوئے پر ہجوم گلیوں اور مختلف مقامات پر سیڑھیوں سے چڑھتے اترتے ہوئے بالا آخر ہم اس علاقے میں پہنچ گئے۔ یہ قدیم شہر کا علاقہ ہے پتھروں اور اینٹوں کے فرش اور اینٹوں اور گارے کی دیواریں۔ لاہور کے پرانے شہر میں بھی یہ منظر دیکھا جا سکتا ہے فرق صرف لوگوں اور ماحول کا ہے یا پھر فواروں اور مجسموں کا۔ روم میں مجسّمے اتنے زیادہ ہیں کہ گنتے گنتے تھک جاؤ مگر مجسّمے ختم نہیں ہوتے۔ قدیم دیوتاؤں' ہیروز اور قابل ذکر لوگوں کے یہ مجسّمے صرف روم ہی میں نہیں اٹلی کے سارے شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اسی طرح فوارے بھی بے حد و بے شمار ہیں۔ تریوی کے فوارے میں ایک دیوتا کا مجسمہ ہے جو گھوڑے پر سوار ہے۔

ایک آبشار کی شکل میں پانی حوض میں جاتا ہے اور یہ جگہ تریوی کا فوارہ کہلاتی ہے۔ اس جگہ سیاحوں کا ہجوم رہتا ہے۔ کہاوت ہے کہ جو کوئی اس فوارے میں تین سکے پھینکتا ہے اس کی تین خواہشیں ضرور پوری ہو جاتی ہیں اور پھر وہ کم از کم تین بار روم ضرور آتا ہے۔ دوسرے سیاحوں کی طرح ہم نے بھی تالاب میں سکے پھینکے اور خان صاحب اور بٹ صاحب کو بھی دیے۔ بعض شرابی یا شرارتی لڑکے تالاب میں سے سکے نکال بھی لیتے ہیں۔ اس فوارے اور تالاب کے آس پاس حسینوں کا میلا لگا ہوا تھا۔ جیسا پہلے عرض کیا کہ روم کا یہ علاقہ لاہور کے قدیم علاقے کی مانند ہے' فوارے اور آبشار کو نکال کر۔ صفائی بھی کچھ خاص نہیں ہے۔ یہاں کیونکہ گھوڑا گاڑیاں بھی گھومتی پھرتی ہیں اس لئے فضا میں بدبو بسی رہتی ہے مگر سیاحوں کی بلا سے وہ تو روم کی ہر ادا کے دیوانے ہیں۔

ہم نے تین سکے تالاب میں پھینکے اور جس خواہش کا اظہار کیا اب وہ ہمیں یاد نہیں ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ ہمیں تین بار روم جانے کا اتفاق ضرور ہوا۔ نہ جانے یہ تالاب میں سکے پھینکنے کا اثر تھا یا اتفاق' خان صاحب اور بٹ صاحب نے دوبارہ روم کا منہ نہیں دیکھا حالانکہ سکے انہوں نے بھی پھینکے تھے۔ سیاحوں کی بھن بھناہٹ کے علاوہ گھوڑوں کی ہن ہناہٹ بھی یہاں کافی تھی اسمارٹ اطالوی لڑکے خوبصورت سیاح عورتوں کی کمر میں ہاتھ ڈالے گھوم رہے تھے۔ خوب چہل پہل تھی۔ اس قدر پرانے اور بوڑھے شہر کے کھنڈروں میں اتنے جوان' ترو تازہ اور شگفتہ چہروں کی بہار ایک عجیب منظر پیش کر رہی تھی۔ شاید روم کا یہی انداز ہے جو اسے بوڑھا نہیں ہونے دیتا۔ روم کے رہنے والے خوبصورت اور جوان چہرے' شاداب جسم' زندگی کی حرارتوں سے لبریز مرد و زن کھانے پینے اور موج اڑانے کے اصول پر کارفرما شہر کے باسی' پھر باہر سے آنے والے ہزاروں لاکھوں زندہ دل سیاح جو روم کی رونقوں اور شباب کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ پرانا اور بوڑھا شہر ان چیزوں کے ہوتے ہوئے کبھی بوڑھا نہیں ہو سکتا۔ اپنے کھنڈرات' مقبروں یادگاروں اور شگفتہ تاریخی عمارتوں کے ملبے کے باوجود یہ ہمیشہ جوان ہی رہے گا کیونکہ اسے نوجوان دلوں اور نوجوان جسموں کی سنگت حاصل ہوتی رہتی ہے۔ آپ نے طب یونانی کا وہ اصول تو سنا ہو گا جس کے مطابق اگر ساٹھ سال کی عمر میں کوئی شخص سولہ سترہ سال کی دوشیزہ سے شادی کر لے تو اس کی زندگی اور صحت میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ پھر سے جوان ہو جاتا ہے۔ شاید یہی معاملہ روم کے ساتھ بھی ہے۔

بہت سن رکھا تھا کہ روم سات پہاڑیوں پر واقع ہے لیکن تلاش کے باوجود پہاڑیوں کا نام و نشان تک نظر نہ آیا۔ خان صاحب کو بھی بڑی مایوسی ہوئی۔ کچھ اونچے نیچے ٹیلے اور نشیب و فراز ضرور دیکھنے کو ملے مگر انہیں پہاڑی کہنا اس لفظ کی توہین ہے۔ روم ایسا شہر ہے جہاں مٹی بھی نظر آتی ہے اور کوڑا کرکٹ بھی گھوڑوں کی لید اور اس کی بدبو کے بارے میں ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں۔ شہر ہمیں تو بہت صاف ستھرا اور خوبصورت لگا تھا کیونکہ ہم پاکستان سے نکل کر سیدھے وہیں گئے تھے مگر جب یورپ اور امریکا کے دوسرے شہر دیکھے تو اندازہ ہوا کہ روم ان کے مقابلے میں میلا اور گندہ شہر ہے۔ اس میں جدید شہروں والی کوئی بات بھی نہیں ہے۔ جن مقامات کے بارے میں سن سن کر اور پڑھ پڑھ کر آپ تھک چکے ہیں اور جو فلموں میں آپ کو بے حد دلکش اور حسین نظر آتے ہیں جب انہیں خود جا کر دیکھو تو پتا چلتا ہے کہ وہ سب پبلسٹی کی برکت ہے۔

روم میں بسیں بھی چلتی ہیں اور ٹرامیں بھی۔ ٹیکسیاں تو خیر ہر جگہ ہوتی ہیں۔ یہاں اس زمانے میں ۱۹۶۹ء میں ہمیں ایک اور بات اچھی لگی کہ اسکوٹر پر خوبصورت اور خوش اندام لڑکیاں اڑی اڑی پھرتی ہیں۔ کچھ مرد ساتھیوں کے ہمراہ اور کچھ تنہا۔ اس وقت تک اسکوٹر اتنا عام نہیں ہوا تھا اور خوش لباس خوبصورت لڑکیوں کو تو ہم نے کبھی خواب میں بھی اسکوٹ چلاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ روم کی زندہ دل خواتین مردوں کو لفٹ دیتے ہوئے بھی نہیں گھبراتیں۔ جب کہ ہمارے ہاں تو مرد بھی عورتوں کو لفٹ دینے سے پہلے کئی بار سوچتے ہیں۔

روم کی ایک اور خوبی یا کمال یہ ہے کہ اس کے چپے چپے کے بارے میں کوئی نہ کوئی داستان مشہور ہے یا مشہور کر دی گئی ہے۔ یہ کہانیاں دیو مالائی داستانوں کی طرح سینہ بہ سینہ سفر کرتی ہیں اور سیاحوں کو مسحور کر دیتی ہیں۔ شاید ہر پرانے شہر اور یادگار سے اسی قسم کی داستانیں منسوب کر دی جاتی ہیں مگر روم کی داستانوں میں ڈرامائی عنصر اور افسانے کے ساتھ ساتھ رومانس اور سیکس کی ملاوٹ بھی خوب ہے۔ مثلاً فوارے اور سکوں کے بارے میں آپ کو بتا ہی چکے ہیں۔ سینٹ میری کے گرجا میں ایک چہرہ سا بنا ہوا ہے جس کا منہ کافی کھلا ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر اس میں کوئی بے وفا اپنا ہاتھ ڈالے تو اس کا ہاتھ زخمی ہو جاتا ہے۔

جب دوپہر ڈھلنے لگی تو ہم نے واپس ہوٹل جانے کا ارادہ کیا سچی بات یہ ہے کہ واپس جانے کو جی نہیں چاہتا تھا مگر مسٹر گورڈن سے ملاقات کی امید تھی اور پیسہ اس وقت ہماری سب سے بڑی ضرورت تھی۔ خان صاحب کا اصرار تھا کہ ہم گھوڑا گاڑی میں سواری کریں۔ ہم نے کہا ”اگر زیادہ کرایہ نہ ہوا تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ چنانچہ ایک گھوڑا گاڑی کو روک کر کوچوان کو ہوٹل کا کارڈ دکھایا۔ وہ مسکرایا اور آنکھ مار کر اشارہ کیا کہ بیٹھ جاؤ۔ ایک تو ملک ملک سے آنے والی غیر ملکی سیاح خواتین نے روم کے مردوں کی عادتیں بہت خراب کر دی ہیں۔ بقول خان صاحب کے انہیں ”آوارہ“ کر دیا ہے۔ ہم نے کرائے کے بارے میں پوچھا۔ کافی دیر تک تو اس کی سمجھ ہی میں نہیں آیا اور وہ نہایت تیزی سے اپنے ہاتھوں اور شانوں کو حرکت دیتے ہوئے نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ روم کے لوگ خصوصاً ٹیکسی ڈرائیور اور کوچوان جب بولنے پر آتے ہیں تو انہیں چپ کرانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لئے آپ بھی یاد رکھئے کہ اگر روم جانے کا اتفاق ہو تو ان لوگوں کو ہرگز ہرگز بولنے کا موقعہ نہ دیجئے ورنہ پھر آپ کے بولنے کی باری نہیں آئے گی۔ خان صاحب اس کی طولانی تقریر سے اکتا کر بولے ”یار بس بھی کر دے اب ہم سے کیا قصور ہو گیا ہے، کرایہ ہی تو پوچھا ہے“ خان صاحب اتنی زور سے بولے تھے کہ وہ سہم کر چپ ہو گیا۔ خان صاحب نے ہاتھ کی انگلیاں کھول کر اسے دکھائیں اور بولے ”ٹو ہنڈرڈ لیرا“

وہ احتجاج کرنے لگا ”نو نو ویری لٹل“

کافی دیر بھاؤ تاؤ ہوتا رہا اور پھر سات سو لیرا پر فیصلہ ہو گیا ایئرپورٹ والے پورٹر کے معاوضے کے مقابلے میں یہ بہت کم تھا جب گھوڑا گاڑی چل پڑی تو اس نے پھر

اطالوی زبان میں ایک تقریر جھاڑ دی۔ ہم نے تنگ آ کر سرہلایا اور "بس بس" کہنا شروع کر دیا۔ کچھ دور چل کر جب اس نے گاڑی روک کر فٹ پاتھ پر جاتی ہوئی دو خواتین کو پکارا تو ہمارا ماتھا ٹھنکا۔ ان میں ایک ادھیڑ عمر کی تھیں مگر پرانی شراب کی مانند دلکش اور نشے سے بھرپور تھیں۔ دوسری نوجوان لڑکی تھی۔ یہ دونوں ہی سیاح تھیں۔ گاڑی رکتے ہی وہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھیں اور گاڑی میں سوار ہو گئیں۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھنے لگے کہ یہ کس سے ملاقات کے لئے آئی ہیں۔ جب وہ راستے میں ایک چوراہے پر رکیں اور انہوں نے کوچوان کی مٹھی میں رقم رکھی تو اس وقت ہمیں احساس ہوا کہ کوچوان نے ہمارے ٹیکسی رکشہ ڈرائیوروں جیسی حرکت کی ہے اور سواریوں کے ہوتے ہوئے مزید سواریاں بٹھا کر ان سے اضافی کرایہ وصول کر لیا ہے مگر واویلا کرنا لاحاصل تھا۔ خان صاحب کو کوچوان سے شکایت ضرور تھی مگر شکایت یہ تھی کہ اس کمبخت نے پہلے کیوں نہیں بتایا تاکہ وہ خواتین کو روک لیتے اور تھوڑی سی اور ہوا خوری کر دیتے۔

ہوٹل پہنچے تو وہاں خاصی چہل پہل تھی۔ معلوم ہوا کچھ نئے مسافر بھی آ گئے ہیں۔ نووارد مہمانوں میں حسب معمول اکثریت خواتین کی تھی مگر زیادہ تر بڑی بوڑھی عورتیں تھیں۔ خواتین کا تذکرہ سن کر خان صاحب کے چہرے پر رونق آ گئی تھی۔ جب انہیں دیکھا تو مرجھا گئے۔ بولے "ان بڑی بوڑھیوں کو اس عمر میں مارے مارے پھرنے کی کیا ضرورت ہے۔ گھر بیٹھ کر اللہ اللہ کریں اور کم عمر لوگوں کو گھومنے پھرنے کا موقع دیں۔

مسٹر گوویدو بہت مصروف تھے اور ان کے ساتھ ہی ان کا تمام خاندان مہمانوں کی دیکھ بھال اور آؤ بھگت میں لگا ہوا تھا۔ ہم نے خاصی گرمی کھائی تھی اس لئے فوراً کمرے میں جا کر تازہ دم ہوئے اور دوبارہ لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئے۔ لوگوں کی آمدورفت جاری تھی۔ زیادہ تر مہمان ریستوران میں بیٹھے تھے اور بہت زور زور سے باتیں کر رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ اگر مسٹر گوویدو کی دونوں خوبصورت اور خوش مزاج لڑکیاں ان کی خاطرمدارات میں مصروف نہ ہوتیں تو شاید خان صاحب ایک لمحہ بھی لاؤنج میں نہ ٹھہرتے۔

مسٹر گورڈن وقت مقررہ پر تشریف لے آئے۔ ہمیں حیرت تھی کہ وہ روم کے بے ہنگم ٹریفک کے باوجود عین وقت پر کیسے پہنچ گئے۔ وہ ہنسے اور بولے "حضرات، مجھے یہاں رہتے ہوئے عرصہ بیت گیا ہے۔ میں ان لوگوں کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ میں نے اپنے گھر سے ہر جگہ کے فاصلے ناپ رکھے ہیں۔"

وہ درمیانی عمر کے تندرست مگر چھوٹے قد کے موٹے سے امریکن تھے۔ بیگم ان کی البتہ دراز قامت اور بہت خوبصورت تھیں۔ روم میں کئی دن کے بعد خالص انگریزی بولنے والوں سے ملاقات ہوئی تو ہماری جان میں جان آ گئی ورنہ روم والوں کی خالص اطالوی زبان اور مسٹر گوویدو کی شکستہ انگریزی سن سن کر ہماری سماعت خراب ہونے لگی تھی۔ مسٹر گورڈن نے ہم سے پوچھا کہ ہم ساری رقم نوٹوں کی شکل میں چاہتے ہیں یا ٹریولرز چیک بنوانا چاہتے ہیں۔ ہم نے نقد کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے بریف کیس کھول کر اس میں سے بالکل نئے اور کرارے ڈالرز نکالے اور گن کر ہمارے حوالے کر دیے۔ ہم نے انہیں کافی پلائی اور وہ خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوئے۔ خان صاحب ہمیں پراسرار انداز میں ایک طرف لے گئے اور بولے "یہ کیا حماقت کر دی آپ نے؟"

ہم نے پریشان ہو کر پوچھا "کیا؟"

کہنے لگے "سب کے سامنے اتنے بہت سے نوٹ وصول کر لئے۔ ان سب کو معلوم ہو گیا ہے کہ ہمارے پاس اتنے بہت سے ڈالرز ہیں۔"

"تو پھر کیا ہوا۔ بھائی صاحب! یہ روم ہے یہاں لوگ لاکھوں ڈالرز لئے پھرتے ہیں"

"اور لٹ بھی جاتے ہیں۔"

"تو پھر کیا کریں؟"

"سنو، ہم یہ نوٹ مسٹر گوویدو کے پاس جمع کرا دیتے ہیں۔ دیکھا نہیں، وہاں لکھا ہوا ہے کہ اپنا قیمتی سامان اور کیش ہوٹل میں جمع کرا دیں۔"

خان صاحب نے ہمیں اتنا ڈرا دیا تھا کہ ہم نے پہلی فرصت میں اخراجات کے لئے کچھ رقم رکھنے کے بعد باقی سارے ڈالرز مسٹر گوویدو کے پاس رکھوا دیے۔

روم میں رات بہت دیر میں ہوتی ہے۔ اور اتنی لمبی ہوتی ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آتی۔ شاید اپنی دلچسپیوں اور رنگینیوں کی وجہ سے۔ اس لئے ہم نے پھر باہر نکل کر گشت کرنے کی ٹھانی۔ مسٹر گوویدو نے ہماری دولت مندی کا راز پا لیا تھا۔ اس لئے انہوں

نے ہمیں مشورہ دیا کہ انجوائے دی نائٹ لائف۔

ہم نے کہا "ہم تو روم کے بارے میں کچھ جانتے نہیں۔"

کہنے لگے "میرا بیٹا آپ کو ٹیکسی میں وہاں لے جائے گا۔" ہمارے جواب کا انتظار کئے بغیر انہوں نے کچن کی طرف منہ کر کے آواز دی "رابرتو!"

یہ وہی لڑکا تھا جس نے ائرپورٹ پر ہمیں اس ہوٹل کا پتا بتایا تھا۔

انہوں نے اطالوی زبان میں ایک لیکچر جھاڑا اور پھر ہم سے کہنے لگے "میں نے اسے سمجھا دیا ہے۔ یہ آپ کا گائیڈ بھی ہو گا محافظ بھی ہو گا اور دوست بھی ہو گا۔"

خان صاحب نے کہا "پیسوں کی بات تو کرلو۔"

ہمارے دریافت کرنے پر مسٹر گوویدو نے فراخدلی سے کہا "دو ہزار لیرا دے دینا اور اپنے ساتھ اسے بھی سیر کرا دینا۔ نوجوان لڑکا ہے ذرا اس کا دل بھی رکھ لینا۔"

آٹھ بجے ہم روم کی سڑکوں سے گزرے تو بہت اچھا لگا اندھیرا نہیں ہوا تھا مگر روشنیاں جل گئی تھیں۔ اس پس منظر میں ماحول بہت روشن اور حسین ہو جاتا ہے۔

جون جولائی میں آسمان اس قدر سفید اور صاف شفاف نظر آتا ہے کہ بس جی خوش ہو جاتا ہے دیکھ کر۔ رات تو خیر دس ساڑھے دس بجے ہوتی ہے مگر اس سے پہلے ایک آدھ گھنٹے تک آسمان پر جو سرخی اور شفق جیسی رنگت رہتی ہے وہ عجیب منظر پیش کرتی ہے۔

روم کا ففتھ ایونیو ایک نہایت زندہ دل علاقہ ہے جسے ویاو ینیتیو کہتے ہیں۔ یوں تو سنا ہے کہ یہاں سارے دن ہی میلہ لگا رہتا ہے مگر شام ڈھلے تو یہاں حسینوں کے قافلے ڈیرہ ڈال لیتے ہیں۔ سیاح تو خیر ٹوٹے ہی پڑتے ہیں مگر سیر بینی میں روم کے لوگ' کیا عورتیں' کیا مرد' سبھی کچھ کم نہیں ہیں۔ ریستورانوں کی کثرت ہے اور قسم قسم کے ریستوران ہیں جن میں کھانے بھی قسم قسم کے ملتے ہیں اگر کوئی چیز ان سب میں مشترک ہے تو وہ ہیں خوبصورت' بھرپور جسموں والی خوش ادا ویٹریس خواتین' ویٹریس سے آپ یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ یہ سب ملازمین ہوتی ہیں۔ ان میں ملازمین بھی ہوتی ہیں اور مالکن بھی۔ یہاں یہ رواج دیکھا کہ مالک کا سارا خاندان کام میں مصروف رہتا ہے۔ اس لئے جن کے بڑے خاندان ہوتے ہیں۔ انہیں تو باہر سے کسی کو ملازم رکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی

آتی۔ ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ سیاح خواتین' مقامی خواتین اور پیشہ ور خواتین کے درمیان تمیز کرنی مشکل ہے۔ سبھی یکساں فیشن زدہ' یکساں عریاں' یکساں حسین اور یکساں بے باک ہوتی ہیں۔ یہ علاقے روشنیوں اور جلوؤں سے بھرپور ہوتے ہیں۔ نائٹ کلب' سینما' کافی ہاؤس' قہوہ خانے' موسیقی ہر طرح کی دلچسپی یہاں موجود اور میسر ہے۔ ہر طرح کی رفاقت بھی دستیاب ہو جاتی ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ پیسوں کے عوض ہی ملے۔ خواہش مندوں کو ان کی پسند کے لوگ مل جاتے ہیں۔

خان صاحب اور بٹ صاحب دونوں آنکھیں اور منہ پھاڑے یہ مناظر دیکھ رہے تھے۔ خان صاحب بے چارے کو تو لاحول پڑھنے کی مہلت بھی نہیں ملی۔ ہم لوگ تو خیر نووارد تھے مگر ہم سے زیادہ جوش و خروش رابرتو صاحب دکھا رہے تھے۔ وہ خواتین سے ہنسی مذاق کرنے میں پیش پیش تھے۔ خوش شکل اور دلکش نوجوان تھے اس لئے پل بھر میں حلقہ خواتین میں مقبول ہو جاتے تھے۔ جب ایک دو بار وہ لڑکیوں سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گئے تو خان صاحب نے ہم سے کہا "اسے روکئے' منع کیجئے۔"

ہم نے پوچھا "وہ کیوں؟"

بولے "اس کے باپ کو ہم کیا منہ دکھائیں گے؟ اس نے اپنے جوان بیٹے کو ہمارے سپرد کیا ہے۔ اس پر نظر رکھنا ہماری ذمے داری ہے۔"

بٹ صاحب بولے "خان صاحب وہ اسی شہر میں اور انہیں سڑکوں پر پل کر جوان ہوا ہے اور ان سب چیزوں کے متعلق اس کا باپ ہم سے زیادہ جانتا ہے۔"

اتنی دیر میں رابرتو صاحب مسکراتے' گنگناتے ہوئے آئے راستے میں دو تین جسموں سے ٹکرائے ایک لڑکی کے بازو پر تھپکی دی' دوسری خاتون کی کمر پر مکا لگایا اور کسی نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا بلکہ خوشی کا اظہار کیا۔ انہوں نے ہمارے پاس آکر اطالوی زبان کی بارش کر دی جو ہمیں بھگوئے بغیر گزر گئی۔ تنگ آکر وہ سامنے دکان میں کھڑی ایک دوشیزہ کو لے کر آئے جو انگریزی بھی جانتی تھی۔ خاصی خوش شکل لڑکی تھی۔ اس نے ترجمانی کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے ہمیں بتایا کہ رابرتو کہتا ہے کہ نائٹ کلب میں بہت اچھا پروگرام ہے۔ رابرتو نے دونوں ہاتھوں کے اشاروں سے ڈانسروں کے جسموں کے مجسمے تراشتے ہوئے اس کی تصدیق کی پھر مترجم نے بتایا کہ ایک نائٹ کلب

میں شراب بھی بہت سستی مل جائے گی۔ وہاں کی بار گرل رابرتو کی دوست ہے وہ پیگ میں زیادہ پانی بھی نہیں ملائے گی اور ہجوم سے فائدہ اٹھا کر ایک دو پیگ مفت بھی پلا دے گی۔ غضب خدا کا کس قدر خوفناک اور گناہگار ارادے تھے اس نوجوان کے۔

میں نے کہا "اسے بتا دو کہ ہمیں ہوٹل واپس پہنچنا ہے کیونکہ ہماری ایک فون کال آنے والی ہے اور ہم شراب بالکل نہیں پیتے کیونکہ ہم مسلمان ہیں۔"

لڑکی نے حیران ہو کر ہمیں دیکھا اور رابرتو کو ہمارا پیغام سنا دیا وہ لڑکی سے بھی زیادہ حیران ہوا۔ لڑکی نے کہا "یہ کہتا ہے کہ تم ایسی رونق اور رنگینی چھوڑ کر فون سننے واپس جا رہے ہو! فون کی لائن تو پھر مل جائے گی مگر یہ لطف دوبارہ نہیں ملے گا۔ وہاں بہت خوبصورت لڑکیاں ہوتی ہیں۔"

ہمارے مسلسل انکار پر رابرتو نے مایوسی سے آسمان کی طرف دیکھا۔ دونوں ہاتھ اٹھائے' شانے اچکائے اور لڑکی سے مخاطب ہو کر کچھ کہا۔ لڑکی مسکرائی اور دکان کی طرف چلی گئی۔ رابرتو نے ہم سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا "کم سون" آئی کم سون' سینو را ویٹنگ"

مطلب یہ کہ اب دیر نہ کریں' جلدی چلیں کیونکہ مجھے جلدی واپس بھی آنا ہے۔ وہ دوشیزہ میرے انتظار میں ہے۔

ہمیں ہوٹل کے دروازے پر پہنچا کر رابرتو نہایت تیز رفتاری سے ٹیکسی دوڑاتا ہوا ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ خان صاحب چند لمحے خاموش کھڑے دیکھتے رہے۔ پھر بولے "کس قدر آوارہ شخص ہے۔ اس کی تربیت بہت خراب ہوئی ہے۔"

ہم نے کہا "اس کی یہی تربیت ہوئی ہے۔ آپ اس کی فکر نہ کریں۔"

ہوٹل کے اندر گئے تو کچن سے پھر گانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ گوویدو صاحب نے ہمیں چابی دیتے ہوئے پوچھا "رابرتو کدھر ہے؟"

ہم نے کہا "ہمیں یہاں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔"

وہ ہنس کر بولے "بہت سور ہے صبح سے پہلے نہیں لوٹے گا خیر' موج کرنے دو' عمر بار بار تو نہیں آتی۔"

ہم نے خان صاحب کی طرف دیکھا' وہ زیر لب کہنے لگے "یہ باپ ہے یا قصائی

اس ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔"

ہم نے کہا "اسی لئے تو ہر طرح ترقی کر رہا ہے۔"

وہ چپ چاپ کمرے کی طرف چل پڑے' ہم لوگوں نے منہ ہاتھ دھویا' خان صاحب ایک بار پھر غسل کر آئے۔ لباس تبدیل کر کے بستروں پر لیٹے تو خان صاحب کسی سوچ میں کھوئے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد بولے "وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا ہمیں اتنی جلدی واپس نہیں آنا چاہئے تھا۔ روم آنے کا موقع روز روز تو نہیں ملتا ہے۔"

اگلی صبح ہم نے بس ٹرام اور گھوڑا گاڑی کے ذریعے روم دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ روم کے بارے میں ہمارے پاس سب سے بڑا حوالہ فلم "رومن ہالی ڈے" تھی۔ اس فلم نے صرف ہم کو ہی نہیں ساری دنیا کو روم کا دیوانہ بنا دیا تھا۔ فلم تو ولیم وائلر نے بنائی ہی خوبصورت تھی مگر اس پس منظر کے لئے روم کا انتخاب سونے پر سہاگا تھا۔ روم ایک پراسرار اور افسانوی شہر ہے۔ مثلاً ہم ہی نے ہوش سنبھالنے کے بعد دنیا کے جن شہروں کا نام ضرب المثل کے طور پر سنا تھا۔ ان میں روم بھی شامل تھا۔ کون ایسا سیاح یا سیر و سیاحت کا ایسا شوقین ہو گا جو روم جانے کی خواہش نہ رکھتا ہو پھر فنون لطیفہ کی دنیا میں روم کو جو حیثیت حاصل ہے وہ ایک مقدس مقام کی ہے۔ مصوری' پینٹنگ' مجسمہ سازی ان فنون کی تربیت اور تعلیم کے لئے روم ایک معتبر مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ روم (اور اٹلی) میں جا کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شہرت بلاوجہ نہیں ہے۔ روم قدیم عمارتوں کا شہر ہے اور اس کا اپنا حسن ہے جو دوسرے شہروں سے منفرد ہے۔ یہ یورپ کے دوسرے جدید اور ترقی یافتہ شہروں کی طرح ماڈرن اور چمک دمک والا نہیں ہے مگر اس کے پرانے پن میں بھی ایک دلکشی ہے۔ جگہ جگہ مجسمے اور فوارے اس شہر کی خصوصیات میں شامل ہیں۔ روم ہی کو دیکھ لیجئے' پرانے فوارے یہاں اتنی تعداد میں ہیں کہ گن نہیں سکتے۔ اس شہر میں مختلف اقسام' سائز اور صورت شکل کے سینکڑوں فوارے ہیں۔ رومن بادشاہوں کو شاید فوارے بنانے کا خبط تھا۔ پھر لطف یہ کہ مختلف شکلوں کے فوارے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ قدیم اور تاریخی عمارتوں میں فوارے ہیں' سڑکوں پر' گلیوں میں' بازاروں میں ہر طرف فواروں کا میلہ لگا ہوا ہے۔ فوارے اور "پیازہ" روم کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ فوارے بھی اس ٹائپ کے ہیں کہ ایک فوارے کے اندر مختلف فوارے ہیں یا پھر متعدد فواروں کو یکجا

کر کے ایک فوارے کی شکل دے دی گئی ہے۔ ایک اور قدیم باغ اور حویلی نما عمارت جو
ٹی والی کے نام سے مشہور ہے، اس میں سبزے کی روشوں کے ساتھ ساتھ فواروں کی
قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ ایک فوارے کا پانی بہت اونچائی تک جاتا ہے۔ اور پانی کے قطروں
سے قوس قزح یا دھنک سی کبھی کبھی نظر آتی ہے مشہور ہے کہ یہ دھنک جیسے ہی نظر
آئے ویسے ہی آپ جو مانگیں وہ مل جاتا ہے۔ تمام فوارے آسمان کی طرف پانی نہیں
اچھالتے۔ بعض فواروں سے نلکوں کی طرح پانی نکلتا ہے۔ کچھ فوارے پانی کی ہلکی سی
دھاریں نکالتے نظر آتے ہیں۔ کہیں دوشیزہ کے جسم سے پانی کا فوارہ نکل رہا ہے تو کہیں
کسی شخص کے منہ سے فوارے کا پانی خارج ہو رہا ہے اور تو اور ایسے فوارے بھی ہیں
جن میں بچے پیشاب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خان صاحب نے ننگے اور نیم عریاں
مردوں اور عورتوں کے مجسمے بھی بہت دیکھے تھے اور کئی مجسموں کو تو وہ بہت دیر تک غور
سے دیکھتے رہے تھے مگر جب انہوں نے بچے کے مجسمے کو پیشاب کی دھار نکالتے دیکھا تو
ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ کہنے لگے "لاحول ولا قوت۔ کس قدر بے ہودہ لوگ ہیں۔
اس قوم اور حکومت کو تو برباد ہونا ہی تھا۔"

"رومن فورم" دراصل پرانے شہر ویراں کی تصویر ہے۔ یوں سمجھئے کہ یہ ہمارے
موئن جودڑو کی قدرے مرمت شدہ شکل ہے۔ موئن جودڑو میں تو فرش کے سوا در و دیوار
سایوں کی طرح نظر آتے ہیں مگر "رومن فورم" میں کھنڈرات، ستون اور سیڑھیاں وغیرہ
کچھ زیادہ نظر آتے ہیں۔ سنگ مرمر کا اس شہر کی عمارتوں میں خاص استعمال نظر آتا ہے
خان صاحب نے سنگ مرمر کو بغور دیکھا اور اس کی کوالٹی کی تعریف کی۔ بٹ صاحب نے
حقارت آمیز لہجے میں کہا "ارے انہیں سنگ مرمر کا کیا پتا، ہمارے پاکستان سے لائے ہوں
گے۔"

کہتے ہیں یہ شہر کسی زمانے میں اپنی دلکشی، رونق، چہل پہل اور شکوہ کے لئے
مشہور تھا۔ اب زمانے کے نشیب و فراز اور وقت کے قدموں تلے کچلا ہوا کھنڈر بن کر
گیا ہے۔ شکستگی، ملبے کے ڈھیر اور گھاس پھوس، روم میں ایک بات کا خاص طور
احساس ہوتا ہے وہ یہ کہ ان لوگوں نے اپنی قدیم یادگاروں کو زیادہ اچھی حالت میں نہیں
رکھا ہے حالانکہ ان کے طفیل خوب کماتے ہیں۔ کسی زمانے میں یہ سب آبادیاں، محلّے

اور عمارتیں انسانوں کی آوازوں اور قہقہوں سے گونجا کرتے تھے اگر آپ کسی رومن یا
گائیڈ کے ہتھے چڑھ جائیں تو وہ روم کی ہر اینٹ کے بارے میں آپ کو ایک کہانی سنا دے
گا اور یہ سب کی سب کہانیاں بہت دلچسپ اور مرعوب کن ہوتی ہیں۔ ان میں شان و
شوکت کے شانہ بشانہ عینی داستانوں کا لطف بھی ہوتا ہے۔

کلوزیم ایک ایسی عمارت ہے جس کے بارے میں ہر شخص جانتا ہے۔ اس کی
تصویریں دیکھی ہیں یا فلموں میں اس کا دیدار کیا ہے۔ کلوزیم بھی ایک نیم کھنڈر ہے
حالانکہ یہ غالباً" روم کی سب سے مشہور عمارت ہے بلکہ دوسرے ملکوں کے لوگوں کے
لئے تو کلوزیم ہی روم کی پہچان ہے۔ اس کی حالت بھی بس یونہی ہے۔ یعنی

اگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب

کہتے ہیں یہ آج کل کے اسٹیڈیم کا باوا آدم ہے۔ جس طرح آج کل اسٹیڈیم کھیل
تماشوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں اسی طرح کلوزیم بھی اسٹیڈیم کی مانند تھے اور یہاں
کھیل تماشے ہوا کرتے تھے مگر فرق یہ تھا کہ یہاں کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال کے میچوں کے
بجائے انسانوں کی خوں ریز جنگیں ہوتی تھیں۔ غلاموں کو ایک دوسرے کے مقابل لڑنے
کے لئے چھوڑ دیا جاتا تھا اور کسی اک کی موت کی صورت میں ہی یہ کھیل اختتام کو پہنچا
کرتا تھا بعض اوقات فاتح بھی وہیں ڈھیر ہو جاتا تھا اور کبھی غلام اور شیر کی جنگ ہوتی تھی
جس میں ظاہر ہے کہ فتح شیر کی ہی ہوتی تھی دوسرا فرق کلوزیم اور آج کے اسٹیڈیم میں یہ
ہے کہ آج اسٹیڈیم میں کوئی بھی شخص ٹکٹ خرید کر کھیل دیکھ سکتا ہے مگر پہلے کلوزیم
شاہی خاندان، امراء ان کے خاندانوں اور بادشاہوں اور رئیسوں کی منظورِ نظر حسیناؤں
کے لئے وقف تھا۔ یہاں وہ جان لیوا کھیل بھی دیکھتے جاتے اور شراب و شباب کی
سرمستیوں میں بھی گم ہو کر رہ جاتے۔ فلموں میں تو کلوزیم کے بڑے رنگین، دلفریب اور
دلچسپ نظارے دیکھے ہیں مگر اصلی کلوزیم کو دیکھ کر مایوسی ہوتی ہے۔ دراصل تصویروں
اور فلموں کی وجہ سے دیکھنے والوں کی توقعات بہت بڑھ جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ خان
صاحب بھی بار بار کہہ رہے تھے کہ اگر فلمیں دیکھے بغیر یہاں آتے تو زیادہ مزہ آتا۔

روم اور اس کے گرد و نواح میں گرجوں اور قدیم عمارتوں کی کمی نہیں ہے۔ اور
ان گرجوں کے اندر مصوری اور مجسمہ سازی کے ایسے نادر نمونے موجود ہیں کہ انسانی

آنکھ نے ایسے نظارے کم ہی دیکھے ہوں گے۔ وہ تصویریں اور مجسّمے جو نادر اور ضرب
المثل بن چکے ہیں، آپ کو گرجوں اور عمارتوں کے در و دیوار پر نظر آ جائیں گے پھر روم
آرٹ میوزیم بھی ایک خاصے کی چیز ہے۔ اتنی بہت سی، مشہور اور دلکش تصاویر نظر آتی
ہیں کہ آنکھ حیران رہ جاتی ہے۔ میوزیم اتنا بڑا ہے کہ اگر ہر گیلری اور ہر تصویر کو ایک
منٹ بھی دیکھا جائے تو سارا میوزیم دیکھنے کے لئے کم سے کم ایک ہفتہ درکار ہو گا۔ ہم
نے چلتے چلتے میوزیم دیکھا۔ بعض گیلریوں میں تو صرف باہر سے جھانک کر آگے بڑھ گئے
لیکن ہم قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے روم کا سارا آرٹ میوزیم دیکھا ہے۔

ویٹی کن سٹی کو آپ عیسائیوں کا کعبہ سمجھ لیجئے۔ یہ پوپ اعظم کا مسکن ہے۔ وہ یہیں رہتے ہیں اور ساری کیتھولک عیسائی دنیا پر حکومت کرتے ہیں ویٹی کن بذات خود ایک آزاد اور خود مختار مملکت ہے۔ اس کی آبادی چند ہزار بھی نہ ہو گی لیکن دولت سے مالا مال ہے۔ پوپ کی رہائش گاہ، چرچ، اونچے اونچے پتھریلے ستون، پتھر والے فرش کا وسیع و عریض میدان جہاں پوپ کے درشن کرنے والے اکٹھے ہوتے ہیں اور سنا ہے کہ اس میدان میں ایک لاکھ افراد سما سکتے ہیں۔ یہ ایک شاندار اور مرعوب کن عمارت ہے۔ ایک آرٹ میوزیم تو روم میں دیکھا تھا مگر معلوم ہوا کہ ویٹی کن سٹی میں بھی ایک آرٹ میوزیم ہے اور واقعی بہت طویل و عریض ہے۔ اندازہ ہے کہ یہاں جو پینٹنگز وغیرہ موجود ہیں ان کی مالیت کھربوں میں ہو گی۔ اس کا اپنا سلسلہ اور اپنی حکومت ہے جہاں پوپ کا اپنا قانون چلتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب عیسائی دنیا میں پوپ کی اجازت کے بغیر پتہ بھی نہیں ہلتا تھا۔ یورپ کے بادشاہ بھی پوپ کی خوشنودی حاصل کئے بغیر برسراقتدار نہیں رہ سکتے تھے اور ویٹی کن کیونکہ پوپ کی رہائش گاہ تھی اس لئے عیسائی دنیا نے وہاں ہر چیز کی فراوانی کر دی۔ دولت کی ریل پیل تو تھی ہی، یہ آرٹ، مجسمہ سازی اور فنون لطیفہ کا بھی مرکز بن گیا۔ ساری دنیا کے نامور مصور، مجسمہ ساز، اور دوسرے اہل فن یہاں آتے اور اپنے فن کے نمونے چھوڑ کر چلے جاتے گرجا گھروں میں پتھروں اور دیواروں پر ایسے ایسے شاہکار تراشتے کہ دیکھنے والا حیران رہ جاتا۔ یہ حیرت آج بھی برقرار ہے۔ ویٹی کن اور اس کے گرد و نواح میں بھی سیاحوں کی وابستگی اور دلچسپی کا ہر سامان ہے۔ ریستوران ہیں۔ نوادرات کی دکانیں ہیں، ٹیکسیاں ہیں، گھوڑا گاڑیاں ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انتہائی جاذب نظر عورتیں۔ عیسائی تو ایک ٹکٹ میں دو مزے لیتے ہیں یعنی سیر و تفریح اور

نظربازی کے ساتھ ساتھ پوپ کی زیارت بھی کر لیتے ہیں۔ گرمی یہاں زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ شاید اس لئے کہ درودیوار' عمارتیں' فرش سبھی کچھ پتھروں کا بنا ہوا ہے اور گرمی کی تیز دھوپ میں یہ سب چیزیں تپنے لگتی ہیں۔ ہاں اگر سائے میں بیٹھ جائیں یا کسی عمارت کے اندر چلے جائیں تو سورج کی تمازت سے بھی محفوظ رہتے ہیں اور گرمی بھی نہیں لگتی بلکہ کمبل وغیرہ (خاص طور پر رات کے وقت) اوڑھنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔

ویٹی کن کے اونچے اونچے ستون دیکھ کر بہت رعب پڑتا ہے خاں صاحب نے بٹ صاحب کو بتایا کہ یہاں عیسائیوں کا بڑا پادری رہتا ہے۔ سامنے کے میدان کو دیکھ کر بٹ صاحب نے بڑے خلوص اور سادگی سے پوچھا "کیا یہاں فٹ بال اور کرکٹ کے میچ ہوتے ہیں؟" ان کی غلط فہمی بے جا بھی نہیں تھی۔ عمارتوں کے درمیان گھرے ہوئے اس وسیع و عریض میدان کو دیکھ کر اس عمارت سے ناواقف لوگوں کے دلوں میں یہی خیال پیدا ہوتا ہے۔ انہیں بتایا گیا کہ یہاں لوگ اپنے گناہوں کی توبہ کرنے اور گناہ بخشوانے آتے ہیں اور بڑے پادری سے دعا بھی کرا لیتے ہیں۔

میدان میں تقریباً ایک لاکھ آدمی سما سکتے ہیں اور جب پوپ کے درشن دینے کا وقت ہوتا ہے تو یہ لوگوں سے کھچا کھچ بھر جاتا ہے۔ فی الحال تو اس میدان میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پوپ کے محافظ جو قدیم زمانے کے لباس پہنے ہوئے اور قدیم ہتھیاروں (تلواروں بھالوں) سے مسلح تھے' اپنے رنگا رنگ لباس میں بے حد شاندار لگتے ہیں۔

اس میدان کو سینٹ پیٹرک چوک کہا جاتا ہے۔ اکا دکا پادریوں اور ننوں کے سوا ہم نے تو کسی اور کو دیکھا نہیں۔ پوپ سے ملنا تو کجا ان کی ایک جھلک دیکھنا بھی عام حالات میں ناممکن ہے۔

خان صاحب پوچھنے لگے "اتنی بڑی عمارت میں پوپ صاحب کیا کرتے رہتے ہیں؟"

ہم نے جواب دیا "ملکی معاملات سلجھاتے ہیں' یا پھر عبادت کرتے رہتے ہیں۔"

کہنے لگے "انہیں عبادت کرنے میں بہت آسانی ہوتی ہوگی آس پاس کتنے بہت سے گرجے ہیں۔"

انہیں یہ علم ہی نہیں تھا کہ جس طرح عدالت عالیہ کا جج جس جگہ بھی بیٹھ جائے وہ عدالت لگا سکتا ہے اور فیصلے سنا سکتا ہے اسی طرح پوپ کو بھی عبادت کے لئے کسی گرجا گھر میں جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پوپ کی رہائش گاہ تو بذات خود ایک مقدس و متبرک عمارت ہے۔ اور پوپ اپنے دفتر کی میز کرسی پر بیٹھے بیٹھے بھی عبادت کر سکتا ہے۔ پوپ کی رہائش گاہ کی چھت پر کنارے کنارے آج تک جتنے پوپ گزرے ان کے مجسمے نصب ہیں اور سن بھی تحریر ہے۔

ویٹی کن سٹی میں پوپ کے محافظ قد آور' تنومند' خوش شکل اور اسمارٹ ہوتے ہیں۔ قدیم روایت کے مطابق پوپ کا ذاتی محافظ دستہ سوئٹزرلینڈ کے محافظوں پر مشتمل ہوتا ہے اور پوپ کی حفاظت کرنے کے فرائض اس قوم کے محافظوں کے نام پر لکھ دئے گئے ہیں۔

ویٹی کن سٹی میں زیادہ تر پتھروں کی عمارتیں ہیں۔ سڑکیں بھی پتھروں کی ہیں۔ عمارتوں کے ستون اتنے موٹے موٹے اور اونچے اونچے ہیں کہ انسان ان کے سامنے نہایت حقیر اور بے حیثیت چیز نظر آتا ہے۔ پتا نہیں یہ جان بوجھ کر کیا گیا ہے یا محض اتفاق ہے' ویسے پرانے زمانے کے روم میں عام طور پر عمارتیں اسی انداز کی بنائی جاتی ہیں جن سے شاہانہ جاہ و جلال کا اظہار ہوتا ہے۔۔۔۔۔ ویٹی کن میں تقدس سے زیادہ رعب اور شان و شوکت نظر آتی ہے۔ ممکن ہے لوگوں کا مقصد ہی دیکھنے والوں کو مرعوب کرنا ہے۔ شاندار عالیشان عمارتیں' راہداریاں' اونچے اونچے دروازے' فلک بوس ستون' دروازوں پر شاندار لباسوں میں ملبوس محافظ' عجیب و غریب سماں ہوتا ہے۔ پادری اور عورتیں بھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے کبھی کبھی نظر آ جاتے ہیں۔ دو تین تیس ہمیں بھی نظر آئیں۔ ان میں سے ایک تو بڑی عمر کی تھی مگر دو نوجوان اور بے حد خوبصورت تھیں۔ خان صاحب دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور بولے "دیکھیں' کیسا نور برس رہا ہے چہروں پر اور ایک ہمارے مولوی صاحب ہوتے ہیں۔"

ہم نے کہا "آپ شاید بھول گئے ہیں کہ مولوی مرد ہوتے ہیں اور ان کی داڑھی بھی ہوتی ہے جب کہ یہ نوجوان اور خوبصورت خواتین ہیں اور ان کے داڑھی بھی نہیں ہے۔"

فرمایا "پھر بھی ہیں تو خوبصورت اور پاکیزہ۔"

بٹ صاحب سے نہ رہا گیا۔ کہنے لگے "ان کی خوبصورتی تو خیر صاف نظر آ رہی ہے، مگر پاکیزگی کا آپ کو کیسے علم ہوا؟"

اس سے پہلے کہ بحث میں اضافہ ہوتا' سیاحوں کا ایک گروہ نمودار ہوا۔ گائیڈ حسب معمول معلومات کے دریا بہا رہے تھے۔ خدا جانے اس میں کتنا سچ تھا اور کتنا جھوٹ تھا۔ گائیڈ کی کامیابی کا راز ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ فوراً موقع پر ہر سوال کا جواب گھڑ کر سنا دے اور اس برجستگی سے کہ کسی کو محسوس بھی نہ ہو کہ یہ سب من گھڑت ہے۔

ویٹی کن کا نظارہ ہم پہلے بھی ایک بار کر چکے تھے' مگر یہ ایک فلم میں تھا۔ یہ فلم اس قدر خوبصورت اور پر اثر تھی کہ آج بھی ہمیں یاد ہے۔ اٹلی کے ایک قصبے میں رہنے والے ایک غریب کسان کا معصوم نو دس سالہ بچہ اپنے گدھے سے بہت مانوس ہے گدھا اچانک بیمار ہو جاتا ہے' یہاں تک کہ جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ گاؤں کے رواج کے مطابق اس کا دیسی علاج ہوتا ہے اور پھر بچہ اسے لے کر گرجا میں جاتا ہے جہاں پادری صاحب اس پر پڑھ کر پھونکتے ہیں۔ گدھا پھر بھی تندرست نہیں ہوتا بلکہ اس کی حالت اور خراب ہو جاتی ہے تو پادری صاحب بچے سے کہتے ہیں کہ بیٹا اب تو اس کے لئے پوپ ہی دعا کریں گے تو یہ تندرست ہو گا۔"

بچہ یہ سن کر اپنے گدھے کے لئے پوپ سے دعا کرانے کی غرض سے گاؤں سے پیدل نکل کھڑا ہوتا ہے اور بہت سی مشکلیں اور آفات سہنے کے بعد بالا آخر ویٹی کن سٹی پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے' مگر سامنے پتھروں کی دیواریں ہیں یا محافظوں کی قطاریں۔ دونوں ہی اسے پوپ سے ملنے کے لئے اندر نہیں جانے دیتے لیکن بچہ قد آور محافظوں کی آنکھ بچا کر ان کی ٹانگوں کے درمیان سے نکل کر اندر داخل ہو جاتا ہے اور پوپ کے کمرے تک پہنچ کر اس سے درخواست کرتا ہے کہ بیمار گدھے کے لئے دعا کرے۔ پوپ دعا کرتا ہے اور جب بچہ واپس گاؤں پہنچتا ہے تو دیکھتا ہے کہ گدھا رو بہ صحت ہے۔ اٹلی اور ویٹی کن کے پس منظر میں یہ ایک پر اثر اور جذباتی کہانی تھی۔ فلم کا نام تھا "اپنے سوال کے جواب میں انکار مت سنو" یعنی یہ کہ کئے جاؤ کوشش مرے دوستو۔ اس کا نتیجہ یقیناً اچھا بر آمد ہو گا۔ اس فلم میں ہم نے پہلی بار ویٹی کن کی جھلک دیکھی تھی اور اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا شوق تھا جو اس طرح پورا ہو گیا۔

ویٹی کن بلکہ سارے اٹلی میں مذہب پرستی اور قدامت پسندی کا دور دورہ ہے۔ عموماً" مذہبی ہیں اور مذہب کے نام پر بہت سی پابندیوں کو بھی قبول کر لیتے ہیں۔ اب ماڈرن طبقہ اس کی مخالفت کر رہا ہے۔ مثلاً اٹلی میں اسقاط کرانا آج بھی خلاف ہے۔ طلاق کو بھی گالی سمجھا جاتا ہے۔ بیوی کی بیوفائی پر اسے قتل کرنا معیوب نہیں جاتا۔ عورتوں کے حقوق مردوں کے مقابلے میں بہت کم ہیں وغیرہ وغیرہ کیونکہ یہ یورپین اور عیسائی ملک ہے اس لئے اس کی قدامت پسندی' مذہب پرستی اور تنگ کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا جاتا۔ یہاں اکثر (بلکہ شاید تمام) گرجا گھروں میں خواتین معمول مطابق نیم عریاں لباس یا منی اسکرٹ پہن کر داخل نہیں ہو سکتیں۔

خاندانی ماحول کے اعتبار سے بھی یہ مشرقی انداز کا ملک ہے۔ مزاج بھی ان کا اسی ہے۔

اٹلی میں جسم فروشی ایک جرم ہے۔ جب طوائفوں پر پابندی لگائی گئی تو وہ اپنے وص علاقوں سے نکل کر شہروں کے دوسرے علاقوں میں پھیل گئیں اور اب عصمت ٹی اور جسم فروشی کال گرل کے انداز میں ہوتی ہے۔ یعنی وہ گندگی جو کسی ایک علاقے محدود تھی اب سارے شہر بلکہ سارے ملک میں پھیل چکی ہے۔ سرشام بعض علاقوں سڑکوں پر ایسی خواتین شکار کی تلاش میں گھومتی نظر آ جاتی ہیں۔ اس قدر پرانے پن روایت پرست ہونے کے باوجود روم میں بے حیائی اور عریانی کے نظارے عام ہیں۔ رتوں کے لباس برائے نام' ان کی حرکات بے باک' ان کے لباس ہیجان انگیز ہوتے ہیں بلک مقامات پر خواتین اپنے حسن و جمال کی رعنائیاں بڑی آزادی اور فراخ دلی سے رتی پھرتی ہیں۔ صحت مند' خوبصورت لڑکیاں گاہکوں سے بے تکلف ہونے میں کوئی ہٹ نہیں محسوس کرتیں۔ منچلے' بے باک حضرات کی پیش قدمیوں کی پذیرائی بھی کرتی جس میں جتنی ہمت اور توفیق ہوتی ہے وہ اتنی ہی زیادہ کامیابی حاصل کرتا ہے۔

روم کی سڑکوں پر قدیم و جدید کی آمیزش اور آویزش صاف نظر آتی ہے۔

ہم لوگ گھوم پھر کر واپس ہوٹل پہنچے تو گوویدو صاحب اپنے سارے خاندان کے لاؤنج میں ٹی وی کے سامنے بیٹھے تھے۔ پتا چلا کہ فٹ بال کے مقابلے ہو رہے ہیں۔ قوم فٹ بال کے مقابلوں کے دوران بوکھلا جاتی ہے اور ہوش میں نہیں رہتی۔

چنانچہ اس وقت بھی یہی ہو رہا تھا۔ ہوٹل کے مالکوں سے لے کر ملازموں تک کسی نے بھی گھاس نہیں ڈالی' ان کی نظریں فٹ بال کے میچ پر اور ٹی وی پر جمی ہوئی تھیں۔ ایسے میں کوئی انہیں کیا تکلیف دیتا لیکن دوسرے دن جب ہم نے اپنی سیٹ پیرس کے لئے کنفرم کرائی تو ایک دم روم ہمیں اچھا لگنے لگا اور یہ احساس ستانے لگا کہ اس شہر سے رخصت ہو کر ہم بہت اداس ہو جائیں گے۔

گوویدو صاحب تقاضا کر رہے تھے کہ دوبارہ پھر آنا۔ پھر پوچھا "حوض میں سکے پھینکے تھے یا نہیں؟" ہمارے ہاں کہنے پر بولے "سینور آپ کا دوبارہ آنا لازمی ہو چکا ہے۔" ان کے اتنا کہنے سے ہمارے دل کو بھی بہت تقویت ہوئی۔ یہ حقیقت ہمیں بٹ صاحب نے بعد میں بتائی کہ حوض میں پھینکنے کے لئے سکے خان صاحب' گوویدو صاحب سے لے کر آ گئے تھے۔ انہیں شاید یہ فائدہ تھا کہ ان کا جو بھی مہمان دوبارہ روم آئے گا وہ گوویدو صاحب کے ہوٹل میں ہی قیام کرے گا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے گوویدو صاحب بھی کچھ کم نہیں تھے۔ ان کا سارا خاندان جن میں دو بیٹیاں' تین بیٹے اور ایک بھانجا شامل تھا' ائرپورٹ پر اترنے والے مسافروں کو فوراً گھیر لیتے تھے لیکن بظاہر ایک دوسرے سے انجان بنے رہتے تھے۔

اٹلی میں ایک اور بات دیکھ کر ہمارا دل باغ باغ ہو گیا۔ ایک تو یہ کہ لوگ ہم پاکستانیوں سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ نہ صرف صورت شکل اور مزاج میں بلکہ عادات و اطوار میں بھی ہماری آپ کی طرح وقت کی پابندی ان کے لئے بھی ایک غیر ضروری اور فضول رسم ہے۔ وقت یوں ضائع کرتے ہیں جیسے مفت میں ہاتھ لگ گیا ہے اور اس سے پیچھا چھڑانے کے خواہش مند ہیں۔ دھوکا فریب کے بھی قائل ہیں۔ تھوڑا بہت جھوٹ بولنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔ سست اور آرام طلب بھی ہیں اور کھانے پینے کے بے حد شوقین بھی۔ ہلا گلا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اچھا کھاتے ہیں' اچھا پہنتے ہیں اور اچھا وقت گزارتے ہیں۔ کہیے! ہماری طرح ہیں کہ نہیں؟ ڈسپلن وغیرہ کے معاملے میں کہاں یورپ اور کہاں اٹلی۔ انہیں آپ اس معاملے میں یورپ کا گندہ انڈا کہہ سکتے ہیں۔ قطار اول تو بناتے ہی نہیں اور اگر "تکلفاً" قطار بنا بھی لیتے ہیں تو کچھ دیر بعد ہی ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے اور دھکے بازی شروع ہو جاتی ہے۔ ہمارے ملک کے

مقابلے میں ایک فرق یہ ہے کہ بعض مقامات پر لوگ قطار نہیں بناتے تو کاؤنٹر پر موجود لڑکی یا مرد انہیں قطار بنانے کی ہدایت کرتا ہے۔ ضرورت کے وقت تو لوگ گدھے کو بھی باپ بنا لیتے ہیں۔ تو پھر ذرا سی قطار بنا لینے میں کیا حرج ہے؟ مگر پہلی فرصت میں اس قطار کو توڑ کر ہی انہیں سکون ملتا ہے۔ ہمیں تو یوں لگا جیسے ہم یورپ میں اپنے بچھڑے ہوئے بھائیوں سے مل رہے ہیں۔

ہمارے روم سے رخصت ہونے کا منظر بھی خاصا دل گداز تھا۔ خان صاحب حسب معمول یہاں بھی جذباتی ہو رہے تھے اور بار بار ہر ایک سے مل رہے تھے۔ گوویدو اور ان کے بیٹوں سے تو وہ کئی بار گلے ملے اور ان کی صاحب زادیوں سے گلے ملتے ملتے رہ گئے۔ صاحب زادیوں کو تو شاید معانقہ کرنے میں کوئی اعتراض نہ ہوتا مگر ہماری اور بٹ صاحب کی گھورتی ہوئی نظروں نے انہیں روک دیا اور وہ ان سے محض مصافحہ کر کے رہ گئے۔ جب بھی وہ کسی سے ملتے' ایک آہ سرد بھرتے اور کہتے "نہ جانے دوبارہ روم دیکھنا نصیب ہو یا نہ ہو۔"

گوویدو صاحب نے تسلی دی "فکر کی کوئی بات نہیں ہے سینور' آپ نے حوض میں سکے ڈالے تھے۔؟"

"بالکل بالکل۔"

"تو پھر کیوں نہ آئیں گے دوبارہ' ایسا تو ممکن ہی نہیں ہے۔ حوض کے سکوں میں بہت طاقت ہوتی ہے سینور' انسانوں سے زیادہ طاقت ہوتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ روم میں آثار قدیمہ ہیں' تاریخی یادگاریں ہیں' خوبصورت عورتیں ہیں' باوقار مرد ہیں' اسی وجہ سے سیاح بار بار یہاں آتے ہیں مگر میں آپ کو سچ سچ بتا دوں سینور ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ عورتیں تو اور ملکوں میں بھی ہوتی ہیں۔ تاریخی کھنڈرات سے دنیا بھری پڑی ہے مگر یہ صرف فونٹین دی تریوی کے سکوں کی برکت ہے کہ جو بھی وہاں پیسے ڈالتا ہے واپس لوٹ کر ضرور آتا ہے۔"

ہم نے دل میں سوچا کہ یہ بھی اچھا ٹوٹکا ہے جو اٹلی والوں نے گھڑا ہے۔ بہرحال خان صاحب کے دل کو بھی تھوڑا سا سکون حاصل ہو گیا تھا۔ بٹ صاحب اتنے زیادہ جذباتی تو نہیں ہوئے۔ پھر بھی چپ چپ سے ہو گئے۔ ہمارے پوچھنے پر بولے "یہ حقیقت

ہے کہ یہاں کی اداکارائیں ہی نہیں، عورتیں بھی بہت خوبصورت ہوتی ہیں۔ دنیا میں اتنی زیادہ خوبصورتی کہیں بھی نہیں ہے۔"

ہم نے کہا "بھائی جان آپ نے ابھی دنیا دیکھی ہی کہاں ہے جو فیصلہ سنا دیا اور اس سے زیادہ خوبصورتی تو خود ہمارے ملک میں بھی ہے۔"

"مگر وہاں پردے وغیرہ کی پرابلم ہے۔" انہوں نے کہا "اور پھر لباس بھی پیر تک ہوتا ہے۔ یہاں پر وہ تو بالکل نہیں ہے اور لباس کے بارے میں یہ ہے کہ نہ ہونے کے برابر ہی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہاں کی عورتیں شرماتی نہیں ہیں اور نہ ہی نخرے دکھاتی ہیں۔ ہمارے ملک میں تو معمولی شکل والیاں بھی ایسے نخرے کرتی ہیں جیسے کلوپیٹرا......"

بہرحال، قصہ مختصر کرنے کے لئے ہم نے ان سے یہ بھی نہیں کہا کہ بھائی تم نے کلوپیٹرا کہاں دیکھ لی؟ فلمی کلوپیٹرا نہیں بلکہ اصلی والی۔

خان صاحب کچن میں جا کر کچھ دیر درو دیوار کو دیکھتے رہے پھر بولے۔ کیوں نہ ہم ایک پھیرا ہسپانوی سیڑھیوں اور حوض کا لگالیں۔"

ہم نے کہا "کافی دور ہے، تم ہوٹل کی سیڑھیوں پر دو چار پھیرے لگالو۔"

مگر وہ بہ ضد تھے۔ چنانچہ ایک بار پھر ہم نے ٹیکسی لی اور ہسپانوی سیڑھیوں پر پہنچ گئے۔ سیڑھیوں پر اترتے چڑھتے رہے اور وہاں بیٹھ کر آئس کریم کھاتے رہے۔ خان صاحب کو آئس کریم بہت زیادہ پسند نہیں ہے مگر چار پانچ کونز کھا گئے۔ شاید اس لئے کہ فروخت کرنے والی خواتین خاصی دلکش اور تروتازہ تھیں پھر وہاں سے گھوڑا گاڑی میں سوار ہو کر "فونٹین دی تریوی" پہنچے اور فوارے کو دیکھتے رہے پھر حوض میں مزید سکے پھینکے، کہنے لگے "کتنی تازہ اور مہک دار ہوا ہے۔"

بٹ صاحب نے ناک بھوں چڑھائی۔ بولے "یار، گھوڑوں کی لید کی بدبو سے دماغ پھٹا جا رہا ہے۔ ہمارے ہاں تانگوں کے اڈوں پر ایسی بدبو ہوتی ہے۔"

"بکومت، آس پاس کا ماحول دیکھو۔ اصل چیز تانگہ یا گھوڑا نہیں، ماحول ہوتا ہے۔ اتنی بہت سی اچھی شکلیں اور جسم تم نے وہاں سارے سال میں بھی نہیں دیکھے ہوں گے۔"

سامنے کچھ امریکی لڑکیاں تصویریں اتار رہی تھیں۔ خان صاحب بولے "کیوں نہ ہم بھی ان سے تصویر اتروالیں، یادگار رہے گی۔"

ہم نے کہا "مگر کیمرا تو ان کے پاس ہے، تصویر تمہارے پاس کیسے آئے گی۔"

اتنی دیر میں عقب سے آواز آئی "فوٹوگراف سینور" روم میں اور پھر دوسرے تاریخی شہروں میں بھی ہم نے تفریحی مقامات پر ہر جگہ فوٹوگرافر مرد اور خواتین دیکھے جو سیاحوں کی تصویر اتار کر ان کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ یہ پولو رائیڈ کیمرے کی برکت تھی۔ فوٹوگرافر ایک طرحدار لڑکی تھی۔ بال لڑکوں کے مانند کٹے ہوئے، جسم پر ایکٹریسوں کی طرح برائے نام لباس، چہرے پر بے باک مسکراہٹ، آنکھوں میں مستی۔ اس کیمرا بدست خاتون کے سامنے کون چوں چرا کر سکتا تھا۔ فوراً ہم سب نے ان سے کئی تصاویر بنوالیں۔ کافی پیسے خرچ ہوئے۔ وہ تصویریں ہمارے حوالے کر کے ہاتھ ہلا کر مسکرائیں اور جانے لگیں تو بٹ صاحب نے یاد دلایا "اس کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔"

"چھوڑو یار، نام پتے کا کیا کرنا ہے، کیا اسے خط لکھو گے؟"

اس کے بعد ہم لوگ پھر روم کی مختلف سڑکوں پر گھومتے رہے۔ کہیں سے تربوز کھائے، کہیں مختلف چٹ پٹی بھسیاں فواروں کی پھوار میں اپنے ہاتھ بھگوتے رہے۔ مختلف بازاروں اور "پیازوں" میں دکانوں کی کھڑکیوں سے اندر جھانک کر دیکھتے رہے۔ اس کے بعد پھر وہی ہوٹل اور وہی گوویدو صاحب ان کی صاحب زادیاں اور صاحب زادے...... روم سے رخصت ہو کر ہم نے رخت سفر باندھا اور اس قدیم تاریخی شہر کے درودیوار اور سڑکوں، فواروں، پیازوں اور کھنڈروں کو خدا حافظ کہتے ہوئے اگلی منزل کی جانب چل پڑے۔

گوویدو صاحب کی بات ہمیں اس وقت پھر بہت یاد آئی جب ہم نے دوبارہ اٹلی کے سفر کا پروگرام بنایا۔ اس بار ہم لندن سے یورپ کا سفر کرتے ہوئے بذریعہ ٹرین روم پہنچے تھے۔ یورپ میں ٹرین کے سفر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جہاں جہاں خشکی نہ ہو وہاں سمندر میں فیری کے ذریعے سفر کیا جائے۔ انگلستان ایک جزیرہ نما بلکہ جزیرہ ہی ہے' اس لئے جب انگلستان سے نکل کر ٹرین یا سڑک کے راستے یورپ جانا ہو تو پھر رودبار انگلستان کو عبور کرنے کے لئے فیری کا سفر کرنا لازمی ہے۔

یہ ۱۹۷۴ء کا ذکر ہے جب ہم اپنے دوستوں شباب کیرانوی اور رشید جاوید کے ہمراہ یورپ گئے ہوئے تھے۔ ہماری بیگم لبنیٰ بھی ہمارے ساتھ تھیں اور یہ ان کا پہلا سفر یورپ تھا۔ لندن سے ہم نے ٹرین کا ٹکٹ خریدا۔ یہ لندن سے روم اور پھر وہاں سے واپس لندن تک کا ٹکٹ تھا اور اس زمانے میں غالباً ایک ٹکٹ کی قیمت پچاس پونڈ تھی۔ پروگرام یہ تھا کہ ہم لوگ جوڑوں میں سفر کریں گے۔ یعنی ہم اور ہماری بیگم ایک جوڑا اور شباب کیرانوی اور رشید جاوید دوسرا جوڑا۔ جن لوگوں نے سیر و سیاحت کی ہے انہیں اندازہ ہوگا کہ جوڑوں میں سفر کرنا آرام دہ تو ہوتا ہی ہے' سستا بھی ہوتا ہے خاص طور پر ہوٹلوں میں کمرا حاصل کرنے کے سلسلے میں کیونکہ سنگل کمرے اور ڈبل کمرے کے کرائے میں بہت معمولی سا فرق ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ اب شباب کیرانوی اور رشید جاوید دونوں ہی مرحوم ہو چکے ہیں۔ یہ دونوں ہمارے زمانہ جوانی کے بے تکلف اور مخلص دوست تھے ہم لوگوں نے زمانے کے نشیب و فراز بہت دیکھے' کافی جدوجہد کی' مشکل حالات بھی گزارے اور اچھے دن بھی دیکھے۔ مگر ہماری دوستی میں کبھی فرق نہیں آیا۔ ہم نے تو یورپ پہلے بھی دیکھ رکھا تھا مگر ہماری بیگم کی طرح شباب کیرانوی اور رشید جاوید کا بھی یہ پہلا غیر ملکی سفر تھا۔ اس کی تفصیل بہت دلچسپ ہے جو مناسب وقت پر پیش کی جائے گی۔ فی الحال روم کے سفر کی داستان سنئے۔

یورپ میں ریل سے واپسی سفر کا طریقہ یہ تھا کہ آپ لندن سے چلئے اور روم پہنچ جائیے۔ راستے میں چند بڑے بڑے شہروں میں اگر چاہیں تو قیام کیجئے۔ آس پاس کے شہروں کا نظارہ کرنا ہو تو اپنے پلے سے ٹکٹ خرید کر چلے جائیے اور واپس پھر اپنے اسٹیشن پر آکر سیٹ بک کرا کر ٹرین میں بیٹھ جائیے۔ ہم نے زندگی میں بہت سفر کئے۔ ہیں اکثر بہت دلچسپ اور خیال افروز تھے۔ مگر لندن سے روم واپسی کا یہ سفر ان میں سب سے زیادہ دلچسپ اور یادگار سفر تھا۔ اس میں رشید جاوید کی ہمراہی کا بھی دخل تھا کچھ یہ کہ موسم ہر جگہ اچھا تھا۔ مہنگائی بہت زیادہ نہیں ہوئی تھی اور پیسے کو آگ نہیں لگی تھی۔ بے شمار لوگوں نے سفر کرنے کا یہ طریقہ اختیار نہیں کیا تھا اس لئے سفر پر ہجوم اور ہنگامہ خیز نہیں ہوا تھا۔ سفر میں ایک لطف تھا' ایک دلچسپی تھی' ایک رنگینی تھی۔

رشید جاوید بہت دلچسپ' باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ بے حد مزاحیہ اور زندہ دل۔ ہر وقت ہنسنا ہنسانا اور حسب حال لطیفے سنانا ان کی عادت میں داخل تھا۔ دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے جانی دشمن۔ یہ حقیقت ہے کہ انسانوں کی یہ نسل اب رفتہ رفتہ معدوم ہوتی جا رہی ہے۔

ہمیں لندن سے سفر کا آغاز کرنا تھا۔ چار ٹکٹ خرید کر سیٹوں کی بکنگ بھی کر لی گئی تھی۔ صرف مختلف ملکوں کے ویزے حاصل کرنے کا مسئلہ باقی تھا اور یہ اس زمانے میں کوئی مشکل کام نہ تھا۔ عین وقت پر شباب کیرانوی صاحب نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا اور اپنا ٹکٹ بھی واپس کر دیا۔ پوچھا کہ اس اچانک تبدیلی کا سبب کیا ہے تو سنجیدگی سے کہنے لگے "یار آفاقی میرے ایک دوست نے جو بیس سال سے لندن میں رہتے ہیں مجھے بتایا کہ یورپ کے سارے شہر ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ایک شہر دیکھ لیا تو سمجھو سارے شہر دیکھ لئے اس لئے میں نے سوچا کہ لندن' برمنگھم اور مانچسٹر تو دیکھ ہی لیا ہے' اب باقی یورپ کے شہر دیکھنے کا کیا فائدہ؟"

غصہ تو بہت آیا' مگر صبر کے سوا چارہ نہ تھا۔ البتہ رشید جاوید بہت برہم تھے اور شباب کیرانوی کی شان میں قصیدے عرض کر رہے تھے۔ شباب صاحب کے اچانک فیصلے کی وجہ سے رشید جاوید کے سفری اخراجات میں تقریباً دوگنا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ

وہ بھی اخراجات کے پیش نظر ارادہ بدلتے ہم نے انہیں سمجھا بجھا کر اور مختلف ملکوں کے سبز باغ دکھا کر آمادہ سفر کر لیا۔ ان کی مزید حوصلہ افزائی کے لئے انہیں دوران سفر وزیر خزانہ مقرر کر دیا۔ یہ طے پایا کہ جو بھی اخراجات ہوں گے انہیں تین حصوں میں تقسیم کر لیا جائے گا۔ جاوید صاحب حساب کتاب میں ہم تینوں میں لائق ترین تھے' مثلاً وہ ایک منٹ میں حساب لگا کر بتا سکتے تھے کہ ریسٹورنٹ میں چائے کا جو بل دو ہزار لیرا کا آیا ہے اس میں کتنے ڈالر' کتنے پونڈ' اور کتنے پاکستانی روپے بنتے ہیں ظاہر ہے کہ ایسے باصلاحیت شخص کو ہی وزیر مالیات بنایا جا سکتا تھا۔ وہ اپنی زندہ دل طبیعت کے باعث بہت زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

لوزان (سوئٹزرلینڈ) کے اسٹیشن پر اتر کر ہم لوگ بذریعہ سوئس ٹرین جنیوا چلے گئے اور ادھر ادھر کی سیر کر کے چند روز بعد پھر لوزان سے ٹرین میں بیٹھ کر روم کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ یورپ میں ریل گاڑیاں بے حد آرام دہ' پر آسائش' تیز رفتار اور صاف ستھری ہوتی ہیں۔ وقت کی پابند ہیں اور ہم سفر بھی خوبصورت اور شائستہ ہوتے ہیں۔ پھر اس پر مستزاد کھڑکی سے باہر کے نظارے۔ ہم فرانس کے راستے سوئٹزرلینڈ میں داخل ہوئے تھے اور اب سوئٹزرلینڈ سے گزر کر اٹلی جا رہے تھے۔ باہر مناظر اس قدر دلفریب تھے ہم سب چھوٹے بچوں کی طرح کھڑکی سے ہٹنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ یہ تمام علاقہ خوبصورت اور سرسبز و شاداب ہے اور قدرتی حسن چپے چپے پر بکھرا ہوا ہے۔ انسانوں نے اسے سنوارنے میں جس سلیقے سے کام لیا ہے۔ اس نے مناظر کے حسن میں چار چاند لگا دئے ہیں۔ سوئٹزرلینڈ کی سرحد ختم ہوئی اور ہم اٹلی کی سرحد میں داخل ہو گئے۔ باہر کے مناظر میں کافی دور دور تک مطلق تبدیلی محسوس نہیں ہوئی۔ ویسا ہی سرد موسم' ویسے ہی سرسبز پہاڑ' ویسا ہی سبزہ' ہریالی' ویسے ہی کھیت کھلیان' درخت' باغات اور ان کے درمیان میں خوبصورت کھلونوں جیسے صاف ستھرے مکانات' پھر رفتہ رفتہ موسم بدلنے لگا۔ سرد موسم نے ساتھ چھوڑا اور نسبتاً" گرمی محسوس ہونے لگی۔ جیسے جیسے ہم گرم علاقے میں پہنچے' موسم کے ساتھ ساتھ منظر بھی بدلتا چلا گیا۔ کھیتوں کھلیانوں اور مناظر کی خوبصورتی اور آرائش میں کمی واقع ہونے لگی۔ یہاں تک کہ منظر بالکل ہی بدل گیا۔ سرد اور پہاڑی علاقہ ختم ہوا اور ہم دھوپ کی تمازت محسوس کرنے لگے گرم کپڑے ناگوار

گزرنے لگے۔ کھڑکی سے باہر خوش نما نظاروں اور صاف شفاف مکانوں کی جگہ بے ہنگم اور بے ترتیب مناظر نے لے لی۔ یہاں تک کہ منظر بالکل ہی تبدیل ہو گیا۔ اب سرد اور دیہاتی علاقہ بالکل ختم ہو چکا تھا۔ کسانوں کی کٹیائیں بے رنگ اور ماحول بے رونق ہو گیا تھا۔ سبزے کی جگہ کہیں کہیں کچی سڑکیں اور ان پر کھیلتے ہوئے گندے بچے بھی نظر آنے لگے تھے۔ جو یورپ میں ہماری نگاہوں سے اوجھل رہے تھے۔ روم کے گرد و نواح میں پہنچے تو یوں لگا جیسے ہم یورپ میں ہی ہیں۔

باہر تو یہ تبدیلی رونما ہو رہی تھی' مگر ٹرین کے اندر بھی حالات تبدیل ہو چکے تھے۔ یورپ کے طویل سفر میں ہم نے مسافروں کو بڑے سلیقے اور شائستگی سے ٹرین میں سوار ہوتے اور اترتے دیکھا تھا۔ سامان برائے نام' انداز شائستہ اور ڈسپلن کا احترام' مگر اٹلی میں یہ سب بدلا ہوا تھا۔ ہماری ٹرین جب ایک پلیٹ فارم پر رکی اور کافی دیر تک رکی رہی تو ہم حیران ہوئے۔ گرمی بھی ستا رہی تھی کیونکہ ٹرین میں پنکھوں وغیرہ کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ اس پر غضب یہ کہ اچانک مسافروں کا ایک ریلا اندر آیا اور ٹرین کی خاموشی اور سکون میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ آنے والوں میں کچھ دیہاتی مرد اور عورتیں بھی تھیں۔ مردوں کا لباس تو پتلون قمیص ہی تھا مگر خواتین مغربی لباس کے برعکس لبادے ٹائپ کے لباس میں ملبوس تھیں۔ انہوں نے ڈھیر سارا سامان اٹھا رکھا تھا جسے انہوں نے ٹرین میں سوار ہوتے ہی جہاں جگہ ملی پھیلا دیا اور خود بھی سیٹ کی عدم دستیابی کے سبب فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئیں۔ سب خواتین آپس میں باتیں کر رہی تھیں اور اس قدر بول رہی تھیں کہ سارا ماحول پر شور ہو گیا تھا۔ مرد حضرات بھی کچھ کم نہیں تھے۔ وہ سگریٹ نوشی میں مصروف تھے اور گاہے گاہے موقع پا کر عورتوں کی گفتگو میں شامل ہو جاتے تھے۔ ٹرین چلنے سے پہلے مسافروں کا ایک اور غول اندر آ گیا۔ کہاں کی قطار اور کیسی قطار۔ ایک ہجوم تھا کہ اندر داخل ہونے کے لئے بے تاب تھا۔ یورپ کے پر سکون اور منظم سفر کے بعد یہ ہنگامہ خیزی ہمارے لئے تعجب خیز تھی۔ خدا جانے ان لوگوں کے پاس ٹکٹ بھی تھے یا نہیں۔ انہوں نے گزرگاہ پر تو قبضہ جما لیا تھا مگر غنیمت ہوا کہ کمپارٹمنٹ میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہم نے اپنے ساتھی مسافروں کی جانب دیکھا جو بہت دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ہمارے سامنے والی سیٹ پر ایک

جرمن جوڑا تھا۔ ساتھ والی پر دو انگریز خواتین تھیں۔ جرمنوں نے تو خاموشی سے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو دیکھنے پر اکتفا کیا مگر انگریز خواتین چپ نہ رہ سکیں اور بولیں "اب سوائے صبر کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ اٹلی ہے اور اٹلی والوں سے کچھ بعید نہیں ہے۔"

یہ اٹلی سے رشید جاوید اور ہماری بیگم لبنیٰ کا پہلا تعارف تھا

ہم نے کچھ دیر تو خواتین کی باتیں سننے کی کوشش کی۔ وہ اس قدر تیزی سے بول رہی تھیں کہ الفاظ مشین گن کی گولیوں کی طرح ان کے منہ سے خارج ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ مزے دار بات یہ ہے کہ سننے پر کوئی آمادہ نہیں تھا۔ اس لئے کہ ہر شخص بیک وقت بولنے پر تلا ہوا تھا۔ ایک تو غیر مانوس زبان اور اس پر ان کی تیز کلامی۔ نتیجہ یہ کہ ایک لفظ بھی ہماری سمجھ میں نہیں آ سکا۔ البتہ ان کے ہاتھوں' شانوں اور سروں کی حرکتوں کو دیکھ کر ہمیں فلموں کے اطالوی کردار ضرور یاد آ گئے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک زمانے میں انسان اشاروں کی زبان میں آپس میں باتیں کیا کرتے تھے۔ ان خواتین کے اشارے تو ہماری سمجھ میں نہیں آئے تھے مگر یہ ایک قابل دید اور دلچسپ منظر ضرور تھا۔ اطالوی لوگوں کو باتیں کرتے ہوئے دیکھنا بذات خود ایک تجربہ ہے۔

کچھ دیر یہ اودھم جاری رہا اور پھر اچانک خواتین نے فرش پر بکھرا ہوا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ اس سے ہم نے یہ اندازہ لگایا کہ اب ہم روم کے اسٹیشن پر پہنچنے والے ہیں۔ ہمارا یہ خیال غلط نہ تھا۔ ہم روم کے گرد و نواح میں تھے۔ ٹرین کی کھڑکی سے باہر وہ تمام آثار نظر آ رہے تھے۔ جو بڑے شہروں کے نزدیک آنے پر ٹرینوں سے نظر آتے ہیں۔ مصروف اور کشادہ سڑکیں' عمارتیں' پر ہجوم بازار' اور ٹریفک' کارخانوں کی عمارتیں اور چمنیاں' باغ اور اسی قسم کی دوسری چیزیں۔ کسی زمانے میں ہم گرد و نواح کے مناظر سے شہر کے متعلق اندازہ لگا لیا کرتے تھے۔ مگر اب یہ مشکل کام ہو گیا ہے لیکن جاوید صاحب اور لبنیٰ کو روم کا یہ ابتدائی منظر بہت بھلا معلوم ہوا۔ شاید اس میں نفسیاتی رد عمل کا بھی دخل تھا۔ ہم لوگ ہوش سنبھالتے ہی روم کے بارے میں اتنا کچھ سن لیتے ہیں کہ یہ شہر ہمیں اپنے خوابوں اور خیالوں کا شہر معلوم ہونے لگتا ہے۔ اب یہ خواب شرمندہ تعبیر ہونے والا تھا۔

ٹرین روم کے پلیٹ فارم میں داخل ہوئی اور فرش پر بیٹھے ہوئے خواتین و حضرات نے پہلی فرصت میں ٹرین سے باہر نکلنے کی کوشش شروع کر دی' ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں دھکے بازی بھی ہوئی۔ اٹلی کی دیہاتی خواتین خاصی تومند اور جسیم ہوتی ہیں۔ دبلے پتلے آدمی کے پاس سے گزرتے ہوئے اپنے موٹے موٹے بازو یا کولھے ہلاتی ہوئی اس طرح گزرتی ہیں کہ آس پاس کا مجمع کائی کی طرح پھٹ جاتا ہے۔ ہم تو اٹلی اور روم پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ اس لئے یہ منظر ہمارے لئے حیرت انگیز نہیں تھا مگر رشید جاوید اور ہماری بیگم کے لئے یہ سب خلاف توقع تھا۔ خصوصاً" ایسی حالت میں کہ وہ بالکل تازہ تازہ یورپ سے ہو کر آئے تھے ان کی غلطی یہ تھی کہ وہ اٹلی کو بھی یورپ سمجھ رہے تھے۔ ہم نے ان کے حیران چہرے دیکھے تو دل ہی دل میں خوب ہنسے اور کہا "ابھی کیا ہے' ابھی تو آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟"

روم کا ریلوے اسٹیشن خاصا شاندار اور پرشکوہ ہے۔ اگرچہ صفائی کا وہ معیار نہیں ہے جو یورپ کے دوسرے شہروں میں دیکھنے میں آتا ہے پھر بھی آخر یورپ کا حصہ ہے اور یوں بھی ہمارا تجربہ اور مشاہدہ بتاتا ہے کہ جہاں تک صفائی اور گندگی کا تعلق ہے برصغیر کے ملکوں سے زیادہ غلیظ اور گندے شہر بہت کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔

ٹرین سے باہر نکل کر ہم نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ پلیٹ فارم پر سامان اٹھانے کے لئے پورٹر بھی موجود تھے۔ جو یورپی ملکوں کے مقابلے میں ایک انوکھی بات ہے۔ ہمیں پورٹرز کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ہم نے لندن سے روانہ ہوتے وقت اپنے سوٹ کیس وغیرہ رکھنے کے لئے چھوٹی ٹرالیاں خرید لی تھیں۔

لبنیٰ کے بیگ میں پہیئے لگے ہوئے تھے اور وہ ریڑھی کی طرح لڑھکتا ہوا چلتا تھا۔ ہماری یہ ترکیب سارے سفر یورپ کے دوران میں بہت مفید اور کار آمد ثابت ہوئی تھی اور مختلف شہروں کی سڑکوں پر اور پرہجوم بازاروں میں ہم ان ٹرالیوں کی مدد سے اپنا سامان لئے پھرتے تھے۔ یورپ میں یہ کوئی انوکھی اور معیوب بات نہیں سمجھی جاتی بلکہ اس کا رواج عام ہے۔ پاکستان میں ہوتے تو شاید دیکھنے والوں کے لئے تماشا بن جاتے۔ اس طریقے سے ہم نے ٹیکسی وغیرہ کے کرائے کی مد میں سینکڑوں پونڈ بچا لئے تھے۔ اپنی اپنی ٹرالیاں سنبھال کر ہماری قیادت میں تین افراد پر مشتمل یہ مختصر قافلہ پلیٹ فارم سے نکل

کر باہر لاؤنج کی طرف بڑھا۔

روم آخر روم ہے۔ پلیٹ فارم کی خوبصورتی اور شان و شوکت میں کوئی کلام نہیں تھا۔ لابی میں نکل کر ہم نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں کیونکہ کسی ملک میں پہنچ کر مقامی کرنسی حاصل کرنا سب سے اولین اور ضروری کام ہوتا ہے۔ ایک جانب کھڑکیوں کی لمبی سی قطار تھی جن پر مختلف زبان میں "کرنسی تبدیل کرا لو" قسم کی عبارت لکھی ہوئی تھی۔ ہم بھی ایک کھڑکی کے سامنے والی قطار میں جا کر کھڑے ہوئے یہاں باقاعدہ قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ شاید اس لئے کہ قطار میں کھڑے ہوئے غیر ملکی مہمان اور سیاح تھے۔

روم اور اٹلی میں ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہاں دکانوں' ریستورانوں' بنکوں اور دوسرے پبلک مقامات پر کام کرنے والوں میں عورتوں کے ساتھ ساتھ مرد بھی نظر آتے تھے جو یورپ کے دوسرے ملکوں میں نہیں ہوتے۔ وہاں مردوں نے یہ محکمے خالصتاً عورتوں کے لئے وقف کر دئے ہیں۔ اب جو دیکھا تو ہماری کھڑکی میں ایک ادھیڑ عمر کے اطالوی بزرگ بیٹھے نظر آئے۔ خاصے صحت مند اور چاق و چوبند تھے اور اٹلی کے عام مردوں کی طرح خوش شکل بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کرنسی تبدیل کروانے والی خواتین کے ساتھ بہت رومانٹک انداز میں گفتگو کر رہے تھے اور وہ عورتیں بھی ان کی اس حرکت پر خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھیں۔ دراصل اٹلی میں سیاحت کے لئے آنے والی بیشتر مغربی خواتین' خواہ کسی بھی عمر سے تعلق رکھتی ہوں' یہ توقع لے کر اٹلی آتی ہیں کہ اٹلی کے خوبرو مرد انہیں چھیڑیں گے اور اظہار پسندیدگی بھی کریں گے۔ چنانچہ جب مرد انہیں دیکھ کر سیٹیاں بجاتے ہیں اور آوازیں لگاتے ہیں اور بعض اوقات چٹکی بھی کاٹ لیتے ہیں' تو وہ بہت شاداں و فرحاں ہوتی ہیں۔ اس قسم کی "رومانٹک" حرکتیں اٹلی والے عموماً" مغربی خواتین کے ساتھ کرتے ہیں۔ مشرقی عورتوں کے ساتھ وہ ادب و آداب اور شائستگی ملحوظ رکھتے ہیں۔ دوسری طرف یہاں آنے والے مرد حضرات اٹلی کی فلموں میں نظر آنے والی پرکشش اور بے باک ہیروئنوں کی ٹوہ میں آتے ہیں اور سامنے نظر آ جانے والی پہلی اطالوی بولنے والی خاتون کو میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ حوصلہ افزائی یہاں دونوں اصناف کی ہوتی ہے۔ ریستورانوں کی ویٹریس' قہوہ خانوں اور دکانوں کی سیلز گرلز کے علاوہ کال گرلز بھی ان کی حوصلہ افزائی کے لئے موجود ہوتی ہیں اور انہیں یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ جن "سینوریتا" کی محبت میں گرفتار ہو رہے ہیں دراصل وہ ایک پیشہ ور خاتون ہیں۔ دراصل مغرب میں فیشن' میک اپ' لباس اور طور طریقے سب عورتوں کے ایک جیسے ہوتے ہیں اس لئے پیشہ ور خاتون' کال گرل اور ایک شریف عورت کے درمیان فرق کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

ہم کرنسی تبدیل کروانے کھڑکی پر گئے جہاں اطالوی کیشیئر خاتون کو دیکھ کر ہزار جان سے فدا ہونے کا تاثر دے رہے تھے۔ ہماری باری آئی تو حسب معمول ان کی باچھیں کانوں تک پہنچ گئیں اور انہوں نے سر اٹھا کر دیکھتے ہوئے کہا "یس سینوریتا؟ مگر سامنے ایک سینور کو دیکھ کر ان کی مسکراہٹ فی الفور غائب ہو گئی ہم ان سے سوائے ہمدردی کے کیا کر سکتے تھے۔ بہرحال ہماری کرنسی انہوں نے بہت بے دلی سے تبدیل کی اور اس تمام عرصے میں ان کی گہری براؤن رنگ کی آنکھیں ہمارے عقب میں کھڑی سلور بالوں والی حسینہ کے چہرے کا طواف کرتی رہیں بلکہ ہمیں تو ان کا اس طرف انہماک دیکھ کر یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ ممکن ہے وہ ہمیں غلطی سے زیادہ لیرا دے دیں مگر افسوس کہ اس معاملے میں وہ گانٹھ کے پورے نکلے۔

ہم کھڑکی سے ہٹ کر آئے تو ایک دیوار سے ٹیک لگائے رشید جاوید صاحب کھڑے تھے۔ لبنیٰ کچھ فاصلے پر ایک بورڈ پڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس عرصے میں درجنوں حضرات ان دونوں کے ارد گرد منڈلاتے ہوئے انہیں زیادہ ریٹ پر پونڈ اور ڈالر کی عوض لیرا دینے کی پیشکش کر چکے تھے۔ ہمیں دیکھا تو جاوید صاحب لپک کر آئے اور بولے "کیا بھاؤ لیا؟" ہم نے بتایا تو وہ بے زار ہو کر بولے "خواہ مخواہ لائن میں کھڑے ہو کر ایک گھنٹا بھی ضائع کیا اور ریٹ بھی اتنا کم لیا" پھر انہوں نے ہمیں حساب لگا کر بتایا کہ ہم کتنے ہزار لیرا زیادہ حاصل کر سکتے تھے۔

ہم نے کہا "اور جب پتا چلتا کہ نوٹ جعلی ہیں تو کیا کرتے؟ اور پھر یہاں کی پولیس بھی کسی سے رعایت نہیں کرتی" پھر ہم نے انہیں سمجھایا کہ اٹلی اور روم میں غیر سرکاری طور پر غیر نمائندہ لوگوں سے ہرگز لین دین نہ کرنا' ورنہ پچھتاؤ گے۔

"یار تم تو خواہ مخواہ اٹلی والوں کے خلاف ہو گئے ہو۔ دیکھو تو شکل سے کتنے شریف اور ایماندار لگ رہے ہیں" وہ بولے۔

"شکلوں سے دھوکا نہ کھانا دوست' ابھی تمہیں اور بھی بہت کچھ دیکھنا ہے۔"

اتنی دیر میں ایک خاتون ہمارے پاس سے سرگوشی میں کچھ کہتی ہوئی گزر گئی۔ لبنیٰ اور جاوید صاحب کے کان کھڑے ہو گئے "کیا کہ رہی تھی؟" لبنیٰ نے پوچھا۔

ہم نے کہا "ڈالر کا اور بھی اچھا ریٹ بتا رہی تھی" حالانکہ بات کچھ اور تھی۔

روم کا ریلوے پلیٹ فارم خاصا کشادہ' لمبا چوڑا اور خوبصورت ہے۔ ہوٹل والے' ٹیکسی والے' بس والے اور دیگر اداروں کے نمائندے یہاں بھی موجود تھے۔ ایک جانب کاؤنٹر بھی تھے جن پر روشن اور مسکراتے ہوئے چہرے نظر آ رہے تھے۔ جاوید صاحب بے ساختہ ادھر بڑھنے لگے تو ہم نے انہیں روک دیا اور سامنے ایک بورڈ کی جانب اشارہ کیا۔ اس بورڈ پر چھوٹے چھوٹے چوخانوں میں بٹن لگے ہوئے تھے اور ہر چوخانے پر ایک ہوٹل کا نام لکھا ہوا تھا۔ اٹلی والوں کی یہ ادا ہمیں بہت پسند آئی ایسا سسٹم ہم نے اس وقت تک کسی اور ملک یا شہر میں نہیں دیکھا تھا۔ ہوٹل کے نام کے نیچے لگے ہوئے بٹن کو دبا کر آپ سامنے رکھا ہوا ٹیلی فون اٹھائیں تو براہ راست اس ہوٹل سے فون مل جائے گا اور آپ ساری معلومات حاصل کر لیں گے۔ مثلاً یہ کہ کمرا خالی ہے یا نہیں' کرایہ کیا ہے؟ فاصلہ کتنا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ہم نے سب سے پہلے تو مسٹر گوویدو کے ہوٹل والا بٹن دبایا اور ٹیلی فون اٹھا لیا۔ دوسری طرف سے ایک صاحب نے ہمیں اطالوی زبان میں ڈانٹنا شروع کر دیا۔ ہم نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ ڈانٹ ڈپٹ ہی کرتے رہے۔ ہم سمجھ گئے کہ گزشتہ چار سال میں گوویدو صاحب نے ہوٹل کسی اور کے ہاتھ بیچ دیا ہو گا پھر ہم نے ایک اور ہوٹل کا نمبر دبا کر فون پر بات کی۔ ادھر سے ایک صاحب اطالوی لہجے میں انگریزی بول رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ہمیں ایک سنگل اور ایک ڈبل روم مل جائے گا۔ کرایہ سولہ ڈالر روزانہ۔ سنگل کے لئے بارہ ڈالر۔ پھر انہوں نے ہمیں پتا بھی سمجھا دیا اور کہا کہ ٹیکسی والے کو ہوٹل کا نام بتا کر مطمئن ہو جاؤ۔ ہمارا جی تو گوویدو کے ہوٹل میں جانے کو مچل رہا تھا مگر جاوید صاحب نے مشورہ دیا کہ کسی نئے ہوٹل میں ٹھہرو۔ انسان کو نئے تجربے کرتے رہنا چاہئے۔ یہ کیا کہ جذباتی ہو کر پردیس میں

بھی کسی ایک جگہ سے وابستہ ہو کر رہا جائے۔ کرایہ بھی ان کے خیال میں مناسب تھا۔ لہٰذا ہم نے اپنی سامان کی ٹرالیاں پکڑیں اور پلیٹ فارم سے باہر نکل گئے ٹیکسی والے نے ہماری بات غور سے سنی اور "سی سینور" کہہ کر دروازہ کھول دیا۔ ہم بے دھڑک بیٹھ گئے۔ بھاؤ تاؤ کا سوال ہی نہیں تھا۔ اب ہماری ٹیکسی کا سفر شروع ہوا۔ شہر کے بارونق اور گنجان حصوں کو پیچھے چھوڑ کر ٹیکسی کشادہ اور ماڈرن سڑکوں پر چل نکلی

راستے میں سبزہ زار، چوک، فٹ پاتھ پر قائم ریستوران وغیرہ دیکھتے ہوئے ہم لوگ ایک دور دراز اور خاموش علاقے میں پہنچ گئے۔ ٹیکسی نے ایک موڑ کاٹا اور پھر ٹیکسی ایک سنسان سڑک پر مڑ کر لوہے کے ایک اونچے سے گیٹ میں داخل ہو گئی۔ ایک لمبی درختوں سے گھری ہوئی ڈرائیو وے کے آخر میں ایک شاندار ولا نما عمارت نظر آ رہی تھی۔ جس کے چاروں طرف باغ اور لان تھے یہ جگہ ہم سب کو پسند آئی۔ سامان اتار کر ہم نے میٹر کی جانب دیکھا تو وہ کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ یعنی خراب تھا۔ ہم نے پوچھا۔ "ہاؤ مچ؟"

جواب میں ٹیکسی والے نے انتہائی گاڑھی اطالوی زبان بولنی شروع کر دی۔ دونوں طرف سے الفاظ کی بارش ہوتی رہی پھر اشاروں کی زبان استعمال کی گئی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی ساری انگلیاں گن دیں اور پھر آخر میں کہا "ڈالرز" اتنا زیادہ کرایہ؟ اب کیا کریں۔ اسے سمجھا رہے ہیں تو کمبخت کچھ سمجھ ہی نہیں رہا۔ بس اپنی ہانکے جا رہا ہے" جاوید صاحب اور لبنیٰ تو پریشان ہو گئے۔ بولے "یار فارغ کرو اس کو، کیا مصیبت لگا لی ہے۔"

ہم نے کہا "بہت زیادہ کرایہ مانگ رہا ہے"

بولے "اس کی زبان بند کرنے کے عوض زیادہ نہیں ہے۔"

بہرحال ہم نے اسے پہلے بہت تھوڑے نوٹ دئے پھر کچھ اور بڑھائے۔ دس منٹ تک یہ مذاکرات چلتے رہے۔ جس کے بعد وہ ہم سے تین ہزار لیرا لے کر چلتا بنا جو بہت زیادہ کرایہ تھا۔

"توبہ بھئی، یہ روم کے ٹیکسی والے تو بہت خراب ہیں" یہ ہماری بیگم کا تبصرہ تھا۔

"سارا موڈ خراب کر دیا" جاوید صاحب اپنی ٹرالی سنبھال کر بولے۔ سامنے والی عمارت اتنی خوبصورت اور شاندار نظر آ رہی تھی کہ ہم ٹیکسی والے کی کوفت بھول گئے۔ اندر برآمدے میں داخل ہوئے۔ واہ، کیا عمارت تھی۔ سنگ مرمر کا چمکتا ہوا فرش اور خوبصورت ساگوان کی لکڑی کے منقش دروازے، فانوس، جھاڑ، قالین ہر چیز بے حد اسٹائلش اور شاندار۔ سب کو یہ ہوٹل پسند آ گیا۔

"اتنے کرائے میں تو مفت ہے مفت" جاوید صاحب نے تبصرہ کیا۔

ہم ایک بڑے سے ہال میں پہنچے جہاں استقبالیہ میز پر ایک نک سک سے درست حسین خاتون بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہم تینوں کو دیکھ کر مسکرائیں۔ ہم نے کہا "ابھی فون پر ہم نے دو کمرے بک کرائے تھے۔"

وہ حیران ہو کر بولیں "کون سا فون؟ کون سے کمرے؟" پھر انہوں نے بتایا کہ کوئی کمرا خالی نہیں ہے۔ ہم بہت گھبرائے۔ ہماری پریشانی پر ترس کھا کر انہوں نے بتایا کہ بہت جلد کمرے خالی ہو جائیں گے اور آپ کو مل بھی جائیں گے۔

ہم نے کہا "کیا ہم کمرے دیکھ سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں" وہ بولیں اور ہمارے ساتھ چل پڑیں۔

بڑی خوش نما اور شاندار راہداریاں تھیں۔ سچ پوچھئے تو اس ہوٹل کی ہر چیز ہائی کلاس تھی اور وہ بھی اتنے معقول کرائے میں۔ کمرے دیکھے تو اور بھی مرعوب ہوئے۔ فوراً پسندیدگی کا اعلان کر دیا۔ مسٹر گوویدو کا ہوٹل تو اس کے مقابلے میں سرائے لگتا تھا۔

ہم نے کہا "مگر فاصلہ بہت ہے شہر سے۔ ٹیکسی بس وغیرہ پر جانا ہوگا۔"

جاوید صاحب بولے "تو کیا ہوا۔ ہم سیر کرنے آئے ہیں۔ تفریح کرنے آئے ہیں۔ دیکھا نہیں کتنا اسٹائلش ہوٹل ہے۔ بس یہیں رہیں گے۔"

ہماری بیگم نے بھی ان کی تائید کی "جاوید صاحب، ٹھیک کہتے ہیں۔ تفریح کرنی ہے تو شان سے کرنی چاہئے۔"

وہ خاتون اس اثنا میں ہم تینوں کے چہرے دیکھ رہی تھیں اور مسکرا رہی تھیں۔ وہ خاصی کشیدہ قامت اور خوبصورت تھیں اور انہوں نے بہت مدہوش کن خوشبو لگائی ہوئی تھی۔ ہم نے ان سے کہا "اوکے"

وہ ہمارے آگے آگے چلتی ہوئی دوبارہ ہال میں واپس پہنچ گئیں۔ چل کیا رہی

تھیں، رقص کر رہی تھیں۔ ان کے جسم کا ایک ایک حصہ حرکت میں تھا۔ ہم مجبوراً ان کی یہ حرکت دیکھتے رہے مگر ہماری یہ حرکت ہماری بیگم کو پسند نہیں آئی۔ خیر، پردیس میں سب کچھ چلتا ہے اور پھر ہم تو سیر و تفریح کے لئے ہی آئے تھے۔

انہوں نے میز پر بیٹھ کر اپنے بلاؤز کو ایک شانے پر سے کھینچ کر کچھ اور نیچا کر لیا۔ خاصی فضول حرکت تھی لیکن اچھی شکل کی عورت ایسی حرکت کرے تو زیادہ بری نہیں لگتی۔ انہوں نے کاغذ قلم سنبھالا اور پھر فرمایا "ڈبل روم ۲۸ ڈالرز، سنگل روم ۲۴ ڈالرز"

ہم نے کہا "مگر انہوں نے تو ہمیں کچھ اور کرایہ بتایا تھا۔"

"کس نے؟"

"وہ صاحب، جو فون پر ملے تھے۔ ہم نے اسٹیشن سے فون کر کے معلومات حاصل کی تھیں اور انہوں نے ہمیں کرایہ بھی بتایا تھا۔"

وہ ہنس پڑیں، پھر کہنے لگیں "سینور! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں تو صبح سے یہاں اکیلی بیٹھی ہوں۔ سارے ہوٹل میں ایک بھی مرد موجود نہیں ہے۔ شاید آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

جاوید صاحب بولے "واقعی، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو گی۔"

ہم نے احتجاج کیا۔ بہرحال بحث سے کچھ حاصل نہ تھا۔ کرایہ کم کرنے کی درخواست کی تو انہوں نے ایک ڈالر کم کرنے پر آمادگی ظاہر کی، کافی دیر مول تول ہوتا رہا۔ ہمیں ان کی یہ دھوکے بازی پسند نہیں آئی تھی۔ اس کے علاوہ کرایہ بھی وہ زیادہ مانگ رہی تھیں۔

"چلو بھئی۔ ہم یہاں نہیں ٹھہریں گے" ہم نے اعلان کر دیا اور ٹرالی سنبھال کر چل پڑے۔

ہمارے دونوں ساتھی تھکے ہوئے تھے۔ نیند بھی آ رہی تھی اس لئے وہیں قیام کے حق میں تھے۔ مگر جب ہم واپس چلے تو وہ بھی ہمارے پیچھے چل پڑے۔ خاتون نے پکار کر کہا "سینور! دو ڈالر اور کم کر دوں گی۔"

ہم ان سنی کر کے چلے آئے "دیکھا تم نے، کس قدر فریبی لوگ ہیں۔"

جاوید صاحب بولے "معلوم ہوتا ہے تمہیں واقعی غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ عورت دیکھنے میں تو ایسی نہیں لگتی"

ہمارا تجربہ ہے کہ خوبصورتی بہت سے عیبوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔

ہوٹل کی لمبی ڈرائیوے سے ہم ٹرالیاں لے کر باہر نکلے اور سڑک پر چلنے لگے۔ دوپہر کا وقت تھا اور دھوپ میں کافی تمازت تھی۔ جب بڑی سڑک پر پہنچے تو گرمی سے پسینہ آ رہا تھا۔ سامنے درختوں کے جھنڈ کے درمیان سبزہ زار میں ایک چھوٹا سا خوب صورت قہوہ خانہ تھا۔ ہم وہاں جا کر درختوں کے سائے میں بچھی ہوئی میزوں پر بیٹھ گئے۔ سائے میں جاتے ہی ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ ہلکی اور خشک ہوا نے پسینہ بھی خشک کر دیا۔ ایک بہت البیلی سی ویٹریس ہماری طرف بڑھی۔ اونچا سفید اسکرٹ اور نیلا مختصر سا بلاؤز پہنے ہوئے، جس کی آستینیں ادھڑی ہوئی تھیں۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ دراصل فیشن تھا۔ ہم نے کافی اور کیک کا آرڈر دیا۔ وہ مسکراتی ہوئی رخصت ہو گئی تو جاوید صاحب ہمدردی سے بولے "کافی غریب لوگ ہیں یہاں پر۔ بے چاری پھٹے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے ہے۔"

لئی نے کہا "بے چاری کی کیا بات ہے۔ اس میں اتنا سلیقہ نہیں کہ سوئی لے کر سی لے۔"

چند لمحے بعد وہ "بے چاری" بل کھاتی ہوئی تشریف لائیں۔ انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ ہمارے ساتھ ہماری بیگم ہیں۔ جاوید صاحب کو اکیلا پا کر ان کی زیادہ توجہ ان پر تھی۔

ہم کچھ دیر کافی پیتے رہے اور سامنے سے گزرتے ہوئے ٹریفک کو دیکھتے رہے۔ گرمی کے موسم میں دوپہر کے وقت روم میں رونق بہت کم ہو جاتی ہے اور لوگ کھانے اور سونے کے لئے چلے جاتے ہیں۔ ویٹریس بھی نیند کے عالم میں نظر آ رہی تھی جیسے عالم خواب میں چل پھر رہی ہو۔ ہم نے اس سے پوچھا کہ ریلوے اسٹیشن کی طرف کون سی بس جاتی ہے۔ یہ خاتون تھوڑی بہت انگریزی بھی سمجھ لیتی تھیں۔ اس وقت سامنے ایک بس آ کر ٹھہری اور انہوں نے اشارہ کر کے کہا "وہ رہی۔"

جاوید صاحب تو فوراً اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور بس کی طرف لپکے۔ ہم نے بل ادا کیا۔ اتنی دیر میں جاوید صاحب بس میں سوار ہو گئے تھے اور بس ڈرائیور کو بتا رہے تھے کہ وہ سامنے ہمارے ساتھی آ رہے ہیں، کچھ دیر رک جاؤ۔ ڈرائیور نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا اور بس روک کر کھڑا ہو گیا۔ یہ تجربہ بھلا یورپ کے کسی اور شہر میں کہاں ہو سکتا

ہے۔ روم کے سوا؟ ہمارے سوار ہوتے ہی بس چل پڑی۔ سب لوگ خصوصاً عورتیں للی کے شلوار قمیص کو حیرت اور دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔

ایک خاتون نے پوچھا "افریقی؟"

ہم نے کہا "نہیں، پاکستانی" اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

جاوید نے للی سے کہا "بھابی! یہ آپ کو حبشی سمجھ رہی ہے"

للی نے کہا "کیا یہ کلر بلائنڈ ہیں؟"

وہ خاتون سمجھیں تو کچھ نہیں مگر للی سے مخاطب ہو کر بولیں "بیوٹی فل ڈریس" للی کی ساری شکایت دور ہو گئی۔ یہ لباس انہوں نے خود ہی تیار کیا تھا۔ اس تعریف پر تو وہ سات خون بھی معاف کر سکتی تھیں۔

ہم نے ایک موٹے اور گنجے اطالوی سے کہا "جب ریلوے اسٹیشن آئے تو ہمیں بتا دینا۔ یہ مشکل انگریزی ان کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ ہم نے اشاروں سے بتایا اور منہ سے چھک چھک کی آوازیں نکال کر سمجھایا سارے مسافروں کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا لیکن ہم اپنا مطلب سمجھانے میں کامیاب ہو گئے۔

اسٹیشن کے گرد و نواح میں پہنچے تو ایک اسٹاپ پر ہم اتر گئے ہمیں یقین ہے کہ اگر ہم اسٹاپ کے علاوہ بھی روکنے کو کہتے تو بس رک جاتی۔ بس کے مسافروں سے بڑے خلوص اور گرم جوشی سے رخصت ہو کر ہم باہر نکلے اور سوچنے لگے کہ اب کدھر جائیں ہمیں کچھ کچھ اندازہ تھا اور سفر اول کے زمانے کے مقامات بھی یاد آ رہے تھے۔ اپنے سامان کی ٹرالیاں سنبھالے ہوئے ہم ٹہلتے ہوئے ایک سڑک پر مڑ گئے۔ دوپہر کا وقت تھا اس لئے سڑک اور فٹ پاتھوں پر ٹریفک بہت کم تھی اور ہم بے خوف و خطر روم کی فٹ پاتھوں پر چل سکتے تھے۔ سامنے ایک ہوٹل کا بورڈ دیکھ کر ہم اس طرف مڑ گئے۔

"ہوٹل رافیلو روما" اس کے آگے لکھا ہوا تھا "بار ریستورانتے"

ہم دھوپ میں چل چل کر یوں بھی تھک گئے تھے۔ سوچا پہلے اسی ہوٹل کو آزما لیا جائے۔

جاوید صاحب بولے "بھئی اس سڑک کا نام کیا ہے؟ یہ تو پتا کر لو۔ ایسا نہ ہو گم ہو جائیں اور سڑک کا نام بھی یاد نہ رہے" بات انہوں نے عقل کی کی تھی۔ مگر روم کی سڑکوں کے نام تلاش کرنا اور پھر اسے یاد رکھنا کسی معمے سے کم نہیں ہے، پھر بھی ہم نے ہوٹل کے بورڈ کے نیچے لکھی ہوئی ایک عبارت دیکھ لی۔ یہ ہوٹل کا ایڈریس تھا "ویا اربانا" گویا یہی اس سڑک کا نام تھا۔ بعد میں ہوٹل والوں نے ہمیں ایک کارڈ بھی دے دیا تھا جس کے ایک جانب ہوٹل کا نام اور پتا تھا اور دوسری جانب ایک مختصر سا نقشہ تھا۔ جس پر تصویروں اور خاکوں کی مدد سے بتایا گیا تھا کہ یہ ہوٹل کن کن سڑکوں کے درمیان اور کن کن عمارتوں کے نزدیک واقع ہے۔ ہوٹل کا تذکرہ سننے سے پہلے بہتر ہے کہ اس کے محل وقوع کے بارے میں کچھ جان لیا جائے اگر اس کی عمارت کی جانب منہ کر کے کھڑے ہو جائیں تو بائیں ہاتھ پر کچھ دور چل کر سینٹ ماریا کا کلب ہے۔ ظاہر ہے بہت پرانا اور تاریخی ہے کیونکہ روم میں ہر چیز پرانی ہے اور اس کی ایک تاریخ ہے، اگر آپ ویا اربانا پر گرجا کی جانب چلے جائیں اور کسی طرف مڑے بغیر چھوٹی موٹی سڑکوں کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتے جائیں تو آپ وینٹو...... پر پہنچ جائیں گے۔ یہ ریلوے اسٹیشن ہے۔ ہمارے خیال میں فی الحال اسی قدر بتا دینا کافی ہے۔ مختصر یہ کہ اس ہوٹل کے آس پاس بہت سے قابل ذکر مقامات تھے۔ ریبلکا چوک بھی زیادہ دور نہیں تھا۔ بہت سے "پیازہ" وغیرہ بھی تھے۔ روم میں سڑک کو "ویا" کہا جاتا ہے ہر سڑک کے نام سے پہلے "ویا" لگا دیا جاتا ہے۔ مثلاً ویا دی فوری امپیریل، ویا کیوورو وغیرہ وغیرہ۔

جاوید صاحب نے وہیں اپنی ٹرالی روک دی۔ اور بولے "اس سے زیادہ اچھی لوکیشن پورے روم میں نہیں ملے گی" للی نے بھی ان سے اتفاق کا اظہار کیا حالانکہ ان دونوں نے پورا روم تو کیا روم کا ایک گوشہ بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اکثریت کی بات لامحالہ ماننی پڑتی ہے۔ خصوصاً ایسے حالات میں کہ اس میں آپ کی بیوی بھی شامل ہو چنانچہ ہم نے بھی اپنی سوٹ کیس ٹرالی کا رخ ہوٹل رافیلو کی جانب موڑ دیا۔

سامنے سے یہ عمارت مختصر سی نظر آ رہی تھی مگر اندر قدم رکھا تو جی خوش ہو گیا۔ صاف شفاف سنگ مرمر اور سنگ سیاہ کا فرش، پرانے ساگوان کی لکڑی کے ستون اور منقش دروازے اور سازو سامان۔ گویا فرنیچر بھی آثار قدیمہ ہی تھا۔ سامنے ایک منقش لکڑی کی قدیم زمانے کی میز پر ایک جدید ترین خاتون تشریف فرما تھیں۔ روم اور اٹلی والوں کی یہ عادت ہے کہ جس چیز کے بارے میں پوچھو وہ اسے زمانہ قدیم کی بلکہ صدی

عیسوی سے بھی پہلے کی بتاتے ہیں۔ ویسے یہ حقیقت بھی ہے کہ ان لوگوں نے قدیم عمارتوں کو بہت احتیاط سے رکھا ہے باہر سے انہیں اسی انداز کا رکھتے ہیں۔ اندر سے ضرورت کے مطابق اس میں ترمیم و تبدیلی کر لیتے ہیں۔ یہ ہوٹل بھی اس قسم کا تھا۔ جاوید صاحب نے جاتے ہی پوچھا "مادام! یہ ہوٹل کتنا پرانا ہے؟" پہلے تو وہ سمجھیں نہیں پھر بولیں "بالکل نیا ہے۔ برانڈنیو۔ ابھی تو اس کا ایک حصہ نامکمل ہے۔ چار سو سال پہلے یہ عمارت بنی تھی۔ ہماری استدعا پر انہوں نے بتایا کہ کمرے کا کرایہ ڈبل کا سولہ ڈالر اور سنگل کا بارہ ڈالر ہوگا۔ کافی بھاؤ تاؤ کے بعد وہ بالترتیب بارہ ڈالر اور دس ڈالر پر رضامند ہوگئیں۔ جاوید صاحب کے لئے تو یہ زیادتی تھی مگر وہ بولے کوئی بات نہیں۔ آخر ہم یہاں سیر کے لئے آئے ہیں۔ پیسے تو ہاتھ کا میل ہیں۔

کمرے خاصے آرام دہ تھے اور پرانے فرنیچر اور الماریوں وغیرہ سے آراستہ تھے۔ باہر گرمی تھی مگر کمروں میں خنکی تھی۔ یہ روم کی خاص ادا ہے۔ دھوپ میں تمازت اور تپش ہوتی ہے مگر سائے میں خنکی اور خوشگوار موسم ہوتا ہے۔ تھکن کی وجہ سے نیند آ رہی تھی۔ ویسے بھی سارے روم میں قیلولے کا وقت تھا محاورہ ہے کہ اگر روم میں رہو تو وہی کرو جو رومن کرتے ہیں۔ گویا اگر ہم قیلولہ نہ کرتے تو بداخلاقی ہوتی۔ لہٰذا ہم بھی دراز ہو گئے۔ کمبل اوڑھ کر جو سوئے تو پھر دروازے پر دستک سے بیدار ہوئے وہاں ایک دھان پان سی بڑی بی بڑی پر شفقت مسکراہٹ کے ساتھ ٹرے میں چائے لئے کھڑی تھیں۔ ہمارے پوچھنے پر انہوں نے اپنی زبان میں ایک طویل داستان سنا دی جو ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔

لبنیٰ نے کہا "آم کھائیے' آپ کو پیڑ گننے سے کیا مطلب ہے لہٰذا ہم نے چائے پی لی۔ کچھ دیر بعد جاوید صاحب بھی فریش ہو کر آ گئے اور بتایا کہ دراصل وہ چائے ہمارے لئے انہوں نے بھیجی تھی۔ کہنے لگے استقبالیہ والی لڑکی انگریزی بالکل نہیں جانتی بس "یس' نو" کہتی ہے۔ ہم نے کہا "غنیمت ہے' یہاں انگریزی جاننے والے کو ایکسپرٹ کہتے ہیں۔ بعد میں انہیں اس بات کی تصدیق ہو گئی۔ انہوں نے اطالوی زبان کے کچھ الفاظ بھی سیکھ لئے تھے۔ مثلاً 'کیا حال ہے' 'مزاج کیسا ہے' 'معافی چاہتا ہوں" یہ سب انہوں نے ہمیں بھی رٹا دیئے تھے مگر اٹلی سے رخصت ہوتے ہی ہم بھول گئے۔

سب سے پہلے ہم نے انہیں پیدل سیر کرنے کا مشورہ دیا۔ سڑک اور فٹ پاتھ پر چلنا ان کے لئے بھی آسان نہ تھا۔ ہم نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ چلنا پھرنا خود اپنے رسک پر ہوتا ہے۔ انہیں اعتراض یہ تھا کہ جان بچانے کی کوشش میں وہ آس پاس کے مناظر سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے تھے۔ ایک جگہ حسب معمول ٹریفک رکا ہوا تھا۔ ہارن بج رہے تھے' شور مچ رہا تھا۔ وہ تو گھبرا گئے تھے مگر ہم نے بتایا کہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ دو ڈرائیور سامنے آ گئے ہیں۔ ایک دو گھنٹے بعد سب معاملہ ٹھیک ہو جائے گا ٹہلتے ہوئے ہم گرجا کی طرف چلے گئے سیڑھیوں پر سیاحوں کا ایک گروپ گائیڈ کی لن ترانی سن رہا تھا۔ ہم بھی پاس کھڑے ہو کر سنتے رہے۔ گائیڈ نے رک کر ہمیں گھورا کہ مفت میں معلومات سن رہے ہو؟ مگر ہم لوگ انجان بن گئے۔ سیاح خواتین اور مردوں نے بھی بہت بری بری شکلیں بنائیں مگر ہم پر اثر نہ ہوا تو گائیڈ نے پھر اپنی تقریر شروع کر دی' وہ لوگ گرجا کے اندر گئے تو ہم بھی چلے گئے۔ بہت خوبصورت اور پرشکوہ گرجا تھا۔ دیواروں اور چھت پر مصوری کے شاہکار بنے ہوئے تھے۔ کہتے ہیں دنیا بھر کے مصوروں اور مجسمہ سازوں نے بالکل فری میں یہ بے مثال کارنامے سرانجام دیئے تھے۔ دراصل مذہبی جذبات انسان سے بہت کچھ کرا لیتے ہیں رنگین شیشوں میں سے دھوپ چھن چھن کر آ رہی تھی۔ عجیب پرسکون اور پرتقدس ماحول تھا' اگر گائیڈ کی آواز نہ ہوتی تو وہاں بالکل سناٹا ہوتا یا پھر سانس لینے کی آواز اور قدموں کی آہٹ ہوتی۔

ہم سیاحوں کے گروپ سے پہلے گرجا سے باہر نکل آئے۔ ہر طرف رونق نظر آنے لگی تھی۔ اس علاقے میں ٹریفک کا زور کم تھا اس لئے بے فکری سے فٹ پاتھ پر گھومتے رہے۔

یہاں ایک بات یہ دیکھی کہ فٹ پاتھوں پر کھمبے سے لگے ہوئے تھے بظاہر یہ ٹیلی فون کے کھمبے نظر آتے تھے۔ دراصل ایمرجنسی کی صورت میں پولیس کو اطلاع دینے کا سسٹم تھا۔ شیشہ توڑ کر جیسے ہی اندر والا بٹن دبائیں گے تو پولیس اسٹیشن میں بھی گھنٹی بج جائے گی اور آس پاس کے پولیس والوں کو بھی خبر ہو جائے گی اور وہ دوڑے آئیں گے۔ روم اور اٹلی کے بارے میں بہت سن رکھا تھا کہ اسمگلروں اور مافیا والوں کی جنت ہے جو تخت جرائم پیشہ ہیں اور معمولی سی بات پر کشت و خون کر ڈالتے ہیں' مگر عام طور پر امن و

امان ہی نظر آیا۔ ان دنوں وہاں چوری وغیرہ کی وارداتیں بھی زیادہ نہیں ہوا کرتی تھیں۔

کچھ فاصلے پر پیازہ نیپولی تھا۔ بہت دلچسپ اور دلکش جگہ تھی۔ چاروں طرف دکانیں جن کے آگے چوڑے چوڑے برآمدے تھے اور درمیان میں باغ اور سبزہ۔ باغ میں وہی رونق اور چہل پہل' منچلوں کا ہجوم' آئس کریم اور پھلیاں کھاتے ہوئے لوگ' ہنستے کھیلتے' رومانس کرتے ہوئے جوڑے' بھاگتے دوڑتے بچے' تماشا دکھاتے ہوئے بازیگر' بے وقوف بناتے ہوئے دوا فروش' کچھ دور ٹھیلے تربوز بک رہا تھا۔ ترشی ہوئی سرخ قاشیں برف کے ٹکڑوں پر لگی ہوئی۔ اس قدر شیریں اور لذیذ کہ طبیعت خوش ہو گئی۔

رات کا کھانا بھی ایک مسئلہ تھا۔ ہم ایک دو ریستورانوں میں گئے۔ مینو دیکھا تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ویٹرلیس سے دریافت کیا تو نہ وہ ہماری بات سمجھی نہ ہم اس کی بات سمجھ سکے۔ کھانوں کے نام اطالوی میں لکھے ہوئے تھے۔ یہ جاننا مشکل تھا کہ کون سی ڈش کس چیز سے بنی ہوئی ہے۔ دو تین ریستورانوں میں گھومنے کے بعد ایک جگہ پہنچے جہاں ویٹرلیس کچھ کچھ انگریزی جانتی تھی حالانکہ بات اس کی بھی سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔ مگر جاوید صاحب اور لیلیٰ نے اس کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ ہم نے چند کھانوں کے بارے میں دریافت کیا اور ویٹرلیس نے ایک طولانی داستان سنا دی۔ مجبور ہو کر ہم نے ایک سطر پر انگلی رکھ دی۔ وہ مسکرائی اور جاوید صاحب کی طرف متوجہ ہوئی۔ انہوں نے کہا: اٹالین فوڈ؟" پھر بتایا کہ میرے لئے اٹالین کھانے لے کر آؤ۔ وہ خوش خوش واپس چلی گئی۔ ہم لوگ دعا میں مصروف ہو گئے کہ مطلب کا کھانا آ جائے۔ تھوڑی دیر بعد آئی تو اس نے ہم لوگوں کے آگے سادہ چاول رکھ دئے اور ایک سالن جیسی چیز جو مچھلی تھی۔ ادھر جاوید صاحب کے آگے ایک موٹی سی نان نما چیز رکھ دی گئی جن کے اندر کچھ بھر کے پکایا گیا تھا۔ ہم نے خوش ہو کر چاول اور سالن کھایا۔ مزہ بھی ٹھیک تھا۔ جاوید صاحب نے اس روٹی نما چیز کو چھری کانٹے سے کھانے کی کوشش کی۔ ایک نوالہ لیا اور خوب تعریف کی۔

"آپ لوگ تو جاہل ہیں۔ ارے یہ چاول' دال' سالن تو ہم اپنے ملک میں بھی کھاتے رہتے ہیں۔ ارے بھئی روم میں یہاں کے کھانے کھا کر دیکھو ورنہ روم آنے کا کیا فائدہ"

"اس کا مزہ کیسا ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"بہترین' اب کل تم لوگ یہ ضرور کھا کر دیکھنا۔ اس کا نام یاد کر لو۔"

مگر کچھ دیر بعد جب ہماری پلیٹ صاف ہو چکی تھی۔ جاوید صاحب کا کھانا بدستور رکھا ہوا تھا۔ آخر انہوں نے تسلیم کر لیا کہ کھانا اس قدر بدمزہ ہے کہ حلق سے نہیں اترتا۔ کہنے لگے "اس کا نام یاد رکھ لو۔ جب تک اٹلی میں رہو گے اس نام کی کوئی چیز نہ کھانا۔"

ہم نے پوچھا "مگر اس کا مزہ ہے کیسا؟"

کہنے لگے "اگر تم نے کبھی صابن اور پٹ سن ملا کر کھایا ہے تو سمجھو کہ بس ویسا ہی مزہ ہے اس کا۔"

کچھ دیر بعد ہمارے اشارے پر وہی باتونی ویٹرلیس پھر مسکراتی ہوئی آ گئی اور آتے ہی الفاظ کا دریا بہا دیا۔ وہ بار بار کھانے کی پلیٹوں کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ جاوید صاحب نے کہا "تمہارے ریستوران کا کھانا بہت اچھا ہے۔ ان دونوں نے اپنی پلیٹ صاف کر دی ہے۔ میں نے اپنے کھانے میں سے یہ حصہ تمہارے لئے بچا لیا ہے۔ یہ میری طرف سے تم کھا لینا۔"

سمجھی تو وہ کچھ بھی نہیں مگر مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ ہم نے اسے دو سولیرا ٹپ دی تو وہ خوشی سے بے حال ہو گئی۔ سوچتی ہو گی رئیس لوگ کہیں سے آ گئے ہیں۔

روم میں رات کی رونق اور رات کا منظر کچھ اور ہی ہوتا ہے ہم کافی دیر تک ونڈو شاپنگ کرتے رہے۔ کون آئس کریم کھائی اور بھی کچھ چھوٹی موٹی چیزیں خرید کر کھائیں اور پھر ہوٹل واپس لوٹ گئے۔ ہمارے ہوٹل کے پیچھے والی سڑک پر پھر ٹریفک جام ہو گیا تھا۔ کاروں کے ہارن گونج رہے تھے ایک شور مچا ہوا تھا۔ مختلف ڈرائیور ایک دوسرے کو برا بھلا کہہ رہے تھے اور مکے دکھا رہے تھے۔ ہم مختلف کاروں کے درمیان سے گزر کر ہوٹل پہنچ گئے۔ جاوید صاحب بولے "خدا کا شکر ہے کہ ہم اس وقت پیدل ہیں ورنہ وہیں سڑک پر کھڑے ہوتے۔"

ہوٹل میں استقبالیہ پر اب ایک موٹی تازی، گول مٹول بڑی بی تشریف فرما تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی انہوں نے چابی کے کھلونے کی طرح بولنا شروع کر دیا۔ ان کا ایک لفظ بھی ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا مگر وہ مسلسل اور بے تکان بولے چلی جا رہی تھیں۔ ہم نے انہیں یہ بتانے کی بہت کوشش کی کہ خاتون ہم نئے گاہک نہیں ہیں بلکہ آپ ہی کے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ مگر ان کے پاس نہ سننے کی فرصت تھی نہ سمجھنے کا وقت۔ آخر ہم نے جیب سے انہی کے ہوٹل کا شناختی کارڈ نکال کر ان کے سامنے رکھا تو ان کی آواز بند ہوئی۔ انہوں نے چابیاں نکال کر ہمارے حوالے کیں۔ اتنی دیر میں ایک ان سے بھی زیادہ موٹے اور سرخ و سفید صاحب ٹہلتے ہوئے آ گئے۔ بڑی بی نے ان سے کچھ کہا تو وہ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور بولے "یو اسپیک۔ آئی نو انگلش ویری گد" (مطلب یہ کہ مجھ سے بات کرو میں بہت اچھی انگریزی جانتا ہوں)

ہم نے کہا "تھینک یو۔ نو تھینک ٹو اسپیک۔"

بولے "نو پرابلم۔ یور پرابلم اسپیک می، آئی کم، نو پرابلم ترجمہ: اس کا یہ تھا کہ کوئی پرابلم بھی ہو تو مجھے بتا دینا۔ میں آ کر ٹھیک کر دوں گا۔

اس روم نے پہلے بھی زبان کے مسئلے میں ایک بار ہمیں دکھی کر دیا تھا اور اس بار بھی ہم اس کے ہاتھوں تنگ آئے ہوئے تھے۔ انگریزی تو جیسے ان لوگوں نے نہ جاننے یا نہ بولنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ہر سال ہزاروں لاکھوں سیاح انگریزی بولتے ہوئے یہاں آتے ہیں اور ان کی وجہ سے یہ لاکھوں کروڑوں کماتے ہیں، مگر کیا مجال جو انگریزی جاننے بولنے یا سمجھنے کی کوشش کریں۔ سیاح اپنی ہانکتے رہتے ہیں اور یہ اپنی۔ فائدہ انہی کا ہے کیوں کہ ان جانے میں یہ اپنی بات منوا لیتے ہیں۔

دوسرے دن صبح ہم نے ناشتا کرنے کے بعد ایک گھوڑا گاڑی تلاش کی اور اس میں سوار ہو کر یادگار مقامات کی سیر کو روانہ ہوئے۔ سب سے پہلے تو فواروں کی باری تھی۔ روم کے ایک ہزار سے زائد فوارے حسب معمول پانی برسا رہے تھے اور ان کے اردگرد سیاحوں کا ہجوم اکٹھا تھا۔ لوگ سامنے کے ریستورانوں اور ریڑھی والوں سے چیزیں خرید کر کھا رہے تھے اور حوضوں میں سکے ڈال رہے تھے۔ خدا جانے اتنے بہت سے سکوں کا ہوتا کیا ہے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ موقع پا کر یہ سکے کم عمر لڑکے یا نشے کے عادی لوگ نکال کر لے جاتے ہیں۔ فواروں کی اس شہر میں بہت سی اقسام ہیں۔ پرانے باغات اور حویلیوں میں مختلف قسم کے فوارے ہیں، پانی کی نالیاں ہیں، چھوٹی چھوٹی نہریں اور آبشار ہیں۔ پانی کی یہ بہتات دیکھ کر مغل شہنشاہوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ انہوں نے بھی ہر عمارت میں آب رواں فواروں اور آبشاروں کا اہتمام کیا تھا۔ لاہور اور دہلی کے قلعے اور دوسری تاریخی عمارات میں حمام بھی بنے ہوئے ہیں۔ جن میں عورتوں اور مردوں کے نہانے کے علیحدہ حصے بنے ہوئے ہیں۔ ان میں ٹھنڈے اور گرم پانی سے نہانے کا بندوبست تھا اور دھوپ ایسے زاویے سے اور ایسے انداز سے آیا کرتی تھی کہ سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں سرد پانی فراہم کیا جاتا تھا۔ روم میں سبھی پرانی عمارتوں میں اس قسم کے حمام دیکھنے کو ملے۔ روم کے تاریخی مقامات کو دیکھ کر مغلوں کی ذہانت نزاکت خیال کی قدر کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ایک حویلی کے باغ میں بے شمار فوارے اور پانی کی نالیاں تھیں۔ یہ وہی جگہ ہے جسے فلم "رومن ہالی ڈے" میں بھی دکھایا گیا تھا۔ اس فلم کے نتیجے میں بے شمار سیاح عورتیں اور مرد یہاں کی زیارت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ سیاحوں کا ایک ہجوم تھا کہ لگا ہوا تھا۔ غیر ملکی سیاح خواتین زیادہ تر اطالوی گائیڈز یا

نوجوان لڑکوں کی معیت میں تھیں اور ان کے تمام اخراجات بھی خوشی خوشی برداشت کر رہی تھیں۔ دھوپ میں خاصی تمازت تھی مگر درختوں کے نیچے خاصا خوشگوار موسم تھا جاوید صاحب کو تو یہ سب کچھ بہت پسند آیا مگر یہ پرانی بوسیدہ اور کائی زدہ عمارتیں لبنیٰ کو پسند نہیں آئیں۔ وہ بار بار کہہ رہی تھیں کہ اصل عمارتوں اور مکانات کے مقابلے میں تصویریں اور فلمیں دیکھ لینا زیادہ بہتر ہے۔ یہ شہران کو زیادہ پسند نہیں آیا تھا۔ جاوید صاحب بار بار کہہ رہے تھے "بھابی! پتا ہے، ساری دنیا روم کے بارے میں کیا کہتی ہے؟"

وہ تنگ آ کر بولیں "مجھے دنیا سے کیا مطلب ہے۔ میں دوسروں کی باتیں سن کر رائے قائم نہیں کرتی۔ میری اپنی ذاتی رائے ہے۔ آپ لوگ مغرب والوں کی باتیں سن سن کر چیزوں کو پسند اور ناپسند کرتے ہیں، مختلف چیزوں، شہروں، شخصیتوں کے بارے میں وہ جو کچھ آپ کو بتاتے ہیں، آپ انہی پر یقین کر لیتے ہیں۔ اپنی پسند اور عقل کو استعمال میں نہیں لاتے۔

دیکھا جائے تو لبنیٰ کا یہ موقف غلط بھی نہیں تھا۔ ایک زمانہ تھا جب ہالی وڈ کی فلموں اور فلم اسٹاروں کے بارے میں انگریزی اخباروں میں جو پبلسٹی کی جاتی تھی، ہم اس پر من و عن یقین کر لیا کرتے تھے۔ کسی ایکٹریس کو جو بھی لقب یا نام ہالی وڈ والے دیا کرتے تھے ساری دنیا اس پر ایمان لے آتی تھی اور بعد میں وہی رائے قائم کر لیا کرتی تھی۔ یہی عالم سیاست کا ہے، شہروں کا ہے مثلاً لندن کو ہم مغرب کے حوالے سے پہچانتے ہیں۔ سیاسی شخصیتوں کو انہی کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اس کے برعکس اپنی ذاتی رائے ظاہر کرے تو سب اس کا مذاق اڑانے لگتے ہیں۔ اس ڈر سے بھی بہت سے لوگ کھلم کھلا اختلاف رائے کی جرات نہیں کرتے۔ خیر یہ تو طے تھا کہ ہماری بیگم کو روم اتنا پسند نہیں آیا تھا جتنا کہ آنا چاہئے تھا بلکہ انہوں نے روم کے بارے میں جو پڑھا، سنا یا فلموں میں دیکھا تھا اس کے بعد اصل روم کو دیکھ کر وہ خاصی مایوس ہوئی تھیں۔ وہ کیونکہ یورپ کے راستے روم پہنچی تھیں اس لئے انہیں یہ شہر اور بھی پرانا، بوسیدہ اور گندہ نظر آ رہا تھا۔ وہ روم کو جس قدر زیادہ دیکھ رہی تھیں ان کی مایوسی اتنی ہی زیادہ بڑھ رہی تھی۔ ہم لوگ کلوزیم گئے بیضوی شکل کی یہ قدیم عمارت اب کس قدر ٹوٹ پھوٹ بھی گئی ہے اور روم والے اس کی مرمت پر بھی زیادہ توجہ نہیں دے رہے بات یہ ہے کہ جب کنٹرات ہی سے اتنی زیادہ آمدنی ہو جاتی ہے تو پھر مرمت اور تعمیر نو پر پیسہ ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کلوزیم میں رئیس، امراء اور شاہی خاندان کے لوگ غلاموں کی جنگ دیکھنے اکٹھے ہوتے تھے۔ نہتے لوگوں کو خونخوار شیروں کے سامنے پھینک دیا جاتا تھا یا پھر معمولی سا ہتھیار دے کر یہ موقع دیا جاتا تھا کہ وہ خونی درندے کو ہلاک کر دیں اور یہ تماشائی سب بہت شوق سے دیکھا کرتے تھے۔ کہتے ہیں اس عمارت میں پچاس ہزار لوگوں کا اجتماع ہو سکتا تھا۔ ہمیں تو یقین نہیں آیا مگر یہ معلوم ہے کہ اس زمانے میں روم کے اونچے خاندانوں کے لوگ بمع خواتین اس قسم کے بے رحمانہ، ظالمانہ اور غیر انسانی کھیل دیکھ کر بہت خوش ہوا کرتے تھے۔ ادھر انسان اپنی زندگی اور موت کی جنگ میں مصروف ہوتا ادھر مہمان شراب و شباب میں ڈوبے، عیش و عشرت میں کھوئے خوش فعلیوں میں مصروف نظر آتے۔ کم از کم فلموں میں تو قدیم روم اور کلوزیم کا یہی نقشہ دکھایا گیا ہے۔ غالباً بات یہ تھی کہ روم دنیاوی خوشحالی اور نعمتوں سے مالا مال تھا، پیسے کی فراوانی تھی، ہر طرف امن و امان تھا۔ فتوحات کے ذریعے دنیا بھر کی دولت روم میں اکٹھی ہو رہی تھی۔ جب قوموں کو یہ سہولتیں، آسائشیں اور برکتیں حاصل ہو جائیں تو پھر وہ اپنی مصروفیات، دلچسپی اور ہیجان انگریزی کے لئے نت نئے طریقے تلاش کرتی ہیں اور دراصل یہی ان کے زوال کا نقطہ آغاز ہوتا ہے۔ روم والوں پر بھی یہی بیتی، یہاں تک کہ وہ عیش و عشرت اور رنگینیوں کے اتنے خوگر ہو گئے کہ بربادی کی راہ پر گامزن ہو گئے۔ آج یہ تفریح گاہ، یا عشرت گاہ نشان عبرت ہے۔ روم کی ہر تاریخی عمارت، گرجا اور حویلی کے بارے میں کوئی نہ کوئی رنگین کہانی مشہور ہے۔ ان لوگوں نے تو اپنی عبادت گاہوں کو بھی عشرت گاہوں میں تبدیل کر دیا تھا اور عورت کو اس قدر گرا دیا تھا کہ وہ محض کھلونا اور سامان آرائش بن کر رہ گئی تھی۔

کلوزیم سے باہر نکلے تو سڑک کے دوسری جانب ایک عمارت پر چھوٹا سا بورڈ لگا ہوا نظر آیا۔ ہم نے کہا شاید یہ انڈر گراؤنڈ ٹرین کا اسٹیشن ہے۔ پچھلی مرتبہ جب ہم وہاں گئے تھے تو انڈر گراؤنڈ ٹرین کے لئے سارا شہر کھدا پڑا تھا۔ سوچا چلو روم کی سب وے بھی دیکھ لیں۔ اندر گئے تو سنگِ مرمر کا فرش اور دیواریں تھیں، مگر ہر چیز میلی اور خاک آلود۔ معلوم ہوا کہ ابھی سب وے کی لائن اسی جگہ تک پہنچی ہے۔ آئندہ سالوں میں اسے اور

آگے بڑھانے کا ارادہ ہے۔ پہلے ارادہ کیا کہ چلو روم کی سب وے میں بھی سفر کریں مگر پھر خیال آیا کہ اس کا تو سارا حسن ہی بالائے زمین ہے چنانچہ کھنڈرات دیکھنے کے لئے سب وے اسٹیشن سے باہر نکل گئے۔

روم میں ہمیں دو پرابلم پیش آ رہی تھیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی ہماری زبان نہیں سمجھتا۔ نہ ہم ان کی زبان سمجھ سکتے تھے۔ دوسرے یہ کہ دوپہر کو سب قیلولہ فرماتے تھے اور ہمیں بھی رفتہ رفتہ یہ شاہانہ اور نوابانہ عادت پڑتی جا رہی تھی۔ گرمی کے موسم میں یہاں لوگ دوپہر کو کھانے اور سونے کے لئے لمبی چھٹی کرتے ہیں۔ دفتر وغیرہ دیر سے کھلتے ہیں۔ دوپہر کو تین چار گھنٹے کے لئے بند ہوتے ہیں اور پھر شام کو کھل کر رات گئے تک کھلے رہتے ہیں۔

یہاں تک تو خیر ٹھیک ہے مگر بعض علاقوں میں تو دکانیں اور ریستوران بھی بند ہو جاتے ہیں۔ پہلے دن تو ہم ویٹی کن اور دوسرے سیاحوں کے مراکز میں گھومتے رہے تھے' اس لئے کھانے پینے کی مشکل نہیں پیش آئی۔ مگر دوسرے ہی دن دوپہر کو ایک بجے کھانے کی تلاش میں نکلے تو ریستوران بند تھے۔ سوال کے جواب میں ہر شخص نے شانے اچکا دئے بھوک بہت تیز لگی تھی چنانچہ سوچا کسی دکان سے کھانے کے لئے بسکٹ یا ڈبل روٹی وغیرہ خرید لیں۔ ڈبل روٹی تو ہمیں سامنے ہی رکھی ہوئی نظر آ گئی مگر مکھن' جام اور بسکٹ نظر نہیں آئے اور نہ ہی خاتون دکان دار ہماری بات سمجھ سکیں۔ ہم ان سے مکھن کے بارے میں پوچھتے اور وہ دوڑی دوڑی جاتیں اور صابن یا شیمپو اٹھا لاتیں۔ یہ بات نہیں کہ یہ لوگ بنتے ہیں یا مکر کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ انہیں انگریزی نہیں آتی اور اس پر انہیں کوئی شرمندگی یا ندامت بھی نہیں ہے۔ آپ ان کی زبان سمجھیں یا نہ سمجھیں ان کی بلا سے۔ وہ تو اپنا الو سیدھا کر لیتے ہیں۔ جس کا جی چاہے وہ نہ جائے اٹلی اور روم۔

ہم ایک ٹورسٹ بس میں سوار ہو کر ٹور پر نکلے۔ بس میں ایک خاتون کمنٹری کر رہی تھیں۔ اور راستے میں نظر آنے والے تمام تاریخی مقامات کے بارے میں بتا رہی تھیں۔ ان کی انگریزی بھی بس واجبی سی تھی۔ مگر وہ بس کے عملے میں واحد خاتون تھیں جو انگریزی سے واقف تھیں۔ وہ کسی کلب یا تاریخی عمارت کے بارے میں سیاحوں کو بتاتیں اور پھر بے اختیار ان کی زبان سے اطالوی زبان کے فقرے بھی نکل جاتے۔ ہمارے یہاں بڑے بڑے لوگ بھی اگر انگریزی سے ناواقف ہوں تو شرم سار سے رہتے ہیں' مگر روم کے لوگ ایسے نہیں ہیں وہ اپنی خامیوں پر بھی فخر کرتے ہیں۔ آزاد اور زندہ قوموں کی یہی پہچان ہوتی ہے۔

ویٹی کن سٹی ہم پہلے بھی جا چکے تھے۔ اس بار لبنیٰ اور جاوید صاحب بھی ہمارے ساتھ تھے۔ پہلے تو ہم نے میوزیم دیکھا۔ اس قدر وسیع و عریض اور نوادرات سے بھرا ہوا ہے کہ کیا بتائیں۔ آرٹ کے نمونے دیکھ دیکھ کر دل بھر جاتا ہے اور پھر اتنا وقت بھی نہیں ہوتا کہ ہر شاہکار پر توجہ دیں اور غور سے اسے دیکھیں۔ یہ کام بھی سیاحوں کے لئے گائیڈ مرد یا خواتین کر دیتے ہیں۔ ایک طرف سے چلتے ہوئے سارے میوزیم پر تبصرہ کر دیتے ہیں۔ آج کل ان شاہکاروں کی جو حیثیت ہے اس کے پیش نظر تو یہ میوزیم اربوں' کھربوں ڈالر مالیت کا ہے۔ ایک ایک پینٹنگ لاکھوں ڈالر کی ہے۔ جن لوگوں نے یہ شاہکار تخلیق کئے ہیں ان کے تو وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ ایک دن ان کے فن کی اتنی بھاری قیمت ہو گی۔ زندگی میں تو وہ بے چارے مفلوک الحال ہی رہے۔ بعض کو تو اپنی تصویروں کی اتنی قیمت بھی نہ ملی کہ عزت سے روٹی ہی کھا لیتے۔ اس میوزیم میں بھی ہر جگہ کے مانند سیاح خواتین کی بہتات تھی جو ہر تصویر کو اس قدر غور اور تفصیل سے دیکھ رہی تھیں کہ حیرت ہوتی تھی اور ان کی سمجھ میں بھی کیا آ رہا ہو گا؟ آرٹ کی باریکیوں کو سمجھنے کے لئے اور ان سے لطف اندوز ہونے کے لئے بھی ایک خاص پس منظر' ذوق اور شوق ہونا چاہئے۔ مگر یہ سب کی سب خواتین اس قدر ذوق و شوق اور غور سے یہ تصویریں دیکھ رہی تھیں جیسے لگتا تھا کہ سچی قدر داں اور فن کو جاننے والی ہیں۔ مرد سیاح شاہکاروں سے زیادہ غور اور شوق سے خاتون سیاحوں کو دیکھ رہے تھے۔

ہم نے کہا "کس قدر بے ذوق لوگ ہیں کہ تصویروں کو چھوڑ کر انسانوں کو دیکھ رہے ہیں۔"

جاوید صاحب بولے "وہ انسانی شاہکاروں کے مقابلے میں خدائی شاہکاروں کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور یہ بات کسی حد تک درست بھی تھی۔"

روم میں بقول دانشوروں کے ہر جانب میوزیم بکھرے ہوئے ہیں۔ نوادرات'

شاہکار، پرانی یادگاریں۔ بھئی ظاہر ہے کہ جب شہر اتنا پرانا ہو گا تو وہاں کی ہر چیز بھی پرانی ہو گی اور آج کل یہ رواج چل پڑا ہے کہ ہر پرانی چیز کو نوادرات کا نام دیتے ہیں۔ اس لئے روم سرتاپا نوادرات سے لدا پھندا ایک شہر ہے۔ ویٹی کن سٹی کا میوزیم لمبائی چوڑائی میں روم کے میوزیم سے کم نہ ہو گا۔ غالباً تصاویر اور پینٹنگز بھی یہاں اتنی ہی ہیں مگر سیاحوں کو تو میوزیم میں جانے سے مطلب ہے۔ تصویریں اور ان کی فنی باریکیاں خواہ ان کی سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ جس طرح پکے راگوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے ذوق کو بلند کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح میوزیم کے شاہکاروں کو دیکھنے کے لئے بھی ایک خاص علم اور ذوق درکار ہے جو سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے پاس نہیں تھا۔ (لیکن یہ کہ سکتے ہیں کہ کوئی کوئی تصویر اچھی بھی لگی جو ہماری سمجھ میں آئی) ہمارے برابر میں ہی ایک گائیڈ کے بارے میں بتا رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک امریکی لمبے چوڑے بزرگ تھے سر پر کاؤ بوائے ہیٹ رکھے اور بڑے شوخ رنگ کی بو شرٹ پہنے وہ گائیڈ سے ہر تصویر کے بارے میں پوچھتے کہ اس کی قیمت کیا ہو گی؟ گائیڈ بعض کی قیمت کا اندازہ تو بتا دیتا اکثر کے بارے میں کہتا کہ ان کی کوئی قیمت ہی نہیں ہے۔ ان صاحب کے ہاتھ میں نوٹ بک تھی۔ جس پر وہ بڑی سنجیدگی سے کچھ تحریر کرتے جا رہے تھے۔ انہوں نے جیب سے کیلکولیٹر نکال کر کچھ حساب لگایا اور پھر بے اختیار چلا کر بولے "جانتے ہو کہ اس کمرے میں موجود پینٹنگز کی قیمت کیا ہے؟ سب نے انکار میں گردن ہلا دی، وہ بولے "اس کمرے میں جو پینٹنگز اور مصوری کے شاہکار ہیں ان کی قیمت کا اندازہ سوا دو کھرب ڈالر ہے۔"

سیاحوں کے چہرے پر حیرت اور استعجاب کی جھلک نمودار ہوئی۔ خدا جانے ان امریکن کاؤ بوائے کا حساب درست تھا یا نہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی زندگی میں مصور جن تصاویر کو بے معنی اور بے قیمت سمجھا کرتے تھے آج ان کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔

ہم لوگ جس طرح زمینیں اور جائدادیں خریدتے ہیں۔ اسی طرح یورپ اور امریکا کے لوگ پینٹنگز خریدتے ہیں اور گھر بیٹھے ان کی قیمتیں بڑھتی رہتی ہیں۔ یہ ایک بے حد منفعت بخش کاروبار ہے بلکہ اب تو چوروں نے بھی اس طرف توجہ دینی شروع کر دی ہے نوادرات کے علاوہ تصاویر کی چوری بھی اب ایک معمول بن چکا ہے جو چور نہایت ہوشیاری سے یہ کارروائی کرتے ہیں۔ اصل تصویر کی جگہ نقلی تصویر لگا دیتے ہیں اور اس طرح کروڑوں ڈالر کا مال ادھر سے ادھر کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ جعلی تصاویر کی خرید و فروخت بھی اب بہت بڑے کاروبار کی صورت اختیار کر گئی ہے۔

جب نوادرات، مصوری کے شاہکاروں سے جی بھر گیا (یہ بد ذوقی کی انتہا نہیں تو اور کیا ہے؟) تو ہم کو بھوک ستانے لگی۔ ویٹی کن سٹی کہنے کو تو مقدس سرزمین ہے۔ لیکن اس کی حیثیت ایک نمائش گاہ کی سی ہو کر رہ گئی ہے۔ ہزاروں لاکھوں سیاح یہاں آ کر خوب روپیہ لٹاتے ہیں۔ آس پاس کے علاقوں میں نوادرات فروخت کرنے والوں کی چاندی ہے جو معمولی معمولی سی اشیا بھی منہ مانگے داموں فروخت کرتے ہیں اور سیاح ان یادگاروں کو سمیٹنے کے لئے مرے جاتے ہیں ویٹی کن میں پوپ کے محل سے تھوڑے فاصلے پر ایک ریسٹورنٹ تلاش کر لیا گیا۔ دوپہر کا وقت تھا اور سورج کی تمازت نے ہمیں ہلا دیا تھا۔ گرمی ہمارے ملک جیسی تو نہیں ہوتی مگر بے حد حبس زدہ اور جسم میں چبھنے والی ہوتی ہے۔ ہمارے ملک کی طرح لوگ پسینے میں شرابور بھی نہیں ہوتے مگر جسم پسیج جاتا ہے اور چہرے سرخ ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ملک کی گرمی میں پسینے کی بدبو دم نہیں لینے دیتی۔ روم کی گرمی آنکھوں کو بھلی لگتی ہے کیونکہ لوگوں نے خصوصاً" خواتین نے بہت دلفریب پہنا ہوتا ہے۔ مغربی لباس سے تو اب آپ بخوبی واقف ہو چکے ہوں گے۔ جینز اور چست قمیص مردانہ اور زنانہ پہناوا ہے۔ فرق یہ ہے کہ مردوں کی قمیصوں کے تین بٹن ہوتے ہیں اور خدا جانے خواتین اپنی قمیصوں میں بٹن لگوائی ہی کیوں ہیں۔ یہ بلاوجہ کی فضول خرچی ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرا لباس اسکرٹ اور بلاؤز ہوتا ہے۔ یہ جس قدر نظر فریب لباس ہے، اس کا اندازہ اس لباس میں ملبوس خواتین کو دیکھنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ اسکرٹ اب مختصر ترین ہوتا جا رہا ہے اور بلاؤز بے حد اسٹائلش ہوتا ہے۔ درزی کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح کم سے کم کپڑا استعمال کیا جائے اور اسے زیب تن کرنے کے بعد خواتین کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ درزی نے جو برائے نام لباس بنایا ہے اس کو بھی جگہ جگہ اس طرح کھول دیا جائے کہ دھوپ اور تازہ ہوا لگتی رہے، پھر بعض بلاؤز تو اس قدر مہین کپڑے کے ہوتے ہیں

کہ یہی پتا نہیں چلتا کہ لباس ہے بھی یا نہیں۔ بچپن میں آپ نے بھی ایک بے وقوف اور وہمی بادشاہ کی کہانی سنی ہو گی۔ جس کے درباریوں نے اسے یقین دلایا تھا کہ ایک جولاہے نے اس کے لئے لاجواب لباس تیار کیا ہے حالانکہ یہ لباس محض خیالی تھا اور دراصل بادشاہ سلامت بالکل ننگے دھڑنگے دربار میں تخت پر جلوہ گر تھے۔ یورپ کی عورتوں کے لباس بھی خواتین میں مقبول ہے۔ اس کے بارے میں تفصیل بتانا مخرب اخلاق حرکت کے زمرے میں آتا ہے۔ خدا جانے اس لباس کو کس منطق کی رو سے لباس کہا جاتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ویٹی کن سٹی میں پوپ کی مقدس رہائش گاہ کی زیارت کرنے کے لئے جو خواتین تشریف لاتی ہیں وہ بھی اپنے لباس کی طرف دھیان دینے کا تکلف گوارا نہیں کرتیں۔

رشید جاوید اس حرکت پر ناراض بھی تھے اور حیران بھی۔ بار بار کہہ رہے تھے کہ یار یہ کس قدر بے شرم عورتیں ہیں کہ اپنے مقدس مقامات کا بھی احترام نہیں کرتیں اور نہ ہی انہیں پوپ کا کوئی خدمت گار شرمندہ کرتا ہے۔ ہم نے انہیں گرجا گھروں اور کلیساؤں کے باہر لے جا کر کھڑا کر دیا جہاں خواتین نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ کبھی کبھار عبادت کی غرض سے تشریف لے جاتی ہیں اور یہاں بھی حمام میں سب ننگے کا محاورہ صادق آتا ہے۔ مگر جاوید صاحب ایک بات مان گئے۔ کہنے لگے "بھئی ماننا پڑے گا۔ واقعی ان قوموں نے بہت ترقی کر لی ہے۔"

چنانچہ دمکتے ہوئے بلکہ دہکتے ہوئے سرخ و سفید گالوں اور منی اسکرٹ سے جھانکتی ہوئی مخروطی ٹانگوں کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے ہم بھی ویٹی کن کے نزدیکی ریستوران میں پہنچ گئے۔ یہ قدیم طرز کی عمارت تھی۔ فرنیچر بھی قدیم طرز کا تھا۔ یہاں تک کہ شراب کے گلاس اور پیالے بھی پرانے طرز کے تھے۔ گویا قوم نے اپنی روایات کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا تھا۔ ویٹریس یہاں بھی موجود تھیں۔ خدا جانے یورپ میں اب یہ کام مردوں کے ذمے کیوں نہیں رہا؟ البتہ دوسرے ریستورانوں کے برعکس اس ریستوران کی ویٹریس خواتین معقول لباس پہنے ہوئے تھیں یہ ایسا معقول لباس تھا کہ اگر ہمارے ملک کا کوئی مولوی دیکھ لے تو "لاحول" پڑھے بغیر نہ رہے، مگر اس ماحول میں یہ بے حد باپردہ اور شائستہ لباس معلوم ہو رہا تھا کیونکہ باقی جگہوں پر تو بس کچھ نہ پوچھئے۔ ویٹریس خواتین کا لباس بھی پرانے انداز کا تھا۔

ہم نے جاوید صاحب کی توجہ اس نکتے کی طرف مبذول کرائی تو وہ کچھ دیر آنکھیں پھاڑے لباس کو (اور اس بہانے ویٹریس) کو دیکھتے رہے۔ پھر کہنے لگے "اس کا مطلب ہے کہ یہ قوم پرانے زمانے میں بھی شرم و حیا سے بے گانہ تھی۔"

ہم نے کہا "ورنہ اتنی ترقی کیسے کرتی؟"

بولے "ترقی کرنے کے لئے محض بے شرمی ہی کافی نہیں ہے۔"

ہم نے کہا "مگر خاصی ضروری ہے۔ اب تم خود ہی دیکھ لو، جس ملک میں جتنی بے شرمی ہے وہ اتنا ہی زیادہ ترقی یافتہ ملک ہے۔"

کہنے لگے "اور جاپان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

ہماری اس متوقع شکست کو ویٹریس نے اپنی دخل در معقولات سے روک دیا۔ اس کے ہاتھ میں پرانے زمانے کے بادشاہوں کے فرمان نما ایک مینو تھا جو منقش لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ ہم تو سمجھے کہ اس کے اندر بھی درختوں کے پتوں یا پتھروں پر کھانوں کی فہرست درج ہو گی۔ مگر اندر سے کاغذ ہی نکلا۔ خاصی مایوسی ہوئی...... کافی دیر تک ہم اس مینو کو ہر زاویے سے پڑھتے رہے۔ مگر کچھ پلے نہیں پڑا۔ دیکھئے اول تو انگریزی کھانوں کے نام پڑھنا اور سمجھنا ہی خاصا مشکل ہے اوپر سے روم کے کھانے اور رومن قسم کے نام بھلا کہاں سمجھ میں آتے۔ ویٹریس کئی بار ہمارے پاس آ کر بے نیل و مرام جا چکی تھی۔ ریستوران میں خاصا رش تھا اور وہ ہمیں زیادہ وقت بھی نہیں دے سکتی تھی مگر ہم لوگوں کا تبادلہ خیال اور انہماک دیکھ کر وہ سمجھ رہی تھی کہ شاید بہت پیٹو قسم کے لوگ ہیں اور بہت لمبا چوڑا کھانے کا آرڈر دیں گے۔ مگر نصف گھنٹے کے غور و خوض کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ فرائی انڈا اور ٹوسٹ منگا لیا جائے تو مناسب رہے گا۔ جب ہم نے یہ آرڈر ویٹریس کو بتایا تو اس نے دانت پیس کر ہمیں دیکھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ ہمیں اٹھا کر پرانے طرز کی بڑی سی کھڑکی سے باہر پھینک دیتی۔ مگر خاصی صابر اور خوبصورت عورت تھی۔ اس لئے غصہ ضبط کر گئی۔ پوچھنے لگی "پینے کے لئے کیا لاؤں؟"

ہم نے کہا "پانی۔"

وہ حیران ہو کر ہماری شکل دیکھنے لگی۔ پہلے تو سمجھی ہی نہیں مگر جب ہم نے اطالوی

زبان میں (پانی) کہا تو وہ بہت پریشان ہوئی کہنے لگی "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ پانی کا آپ کیا کریں گے؟"

جاوید صاحب نے کہا "ارے بھئی پئیں گے اور پانی کا کیا کرتے ہیں؟"

اس نے ہمیں اپنی بھوری بھوری آنکھوں سے گھور کر دیکھا اور بولی "اس کے علاوہ کوئی ڈرنکس وغیرہ۔"

ہم نے جاوید صاحب سے کہا "یہ شراب وغیرہ کے بارے میں پوچھ رہی ہے۔"

لبنیٰ نے ہمیں حیران ہو کر دیکھا اور فرمانے لگیں "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ یہ تو مقدس شہر کا ریستوران ہے یہاں شراب وغیرہ کی گنجائش کہاں ہو سکتی ہے؟"

ہم نے بی بی ویٹریس سے کہا "سنو۔ تمہارے پاس کون کون سی اور کہاں کہاں کی شرابیں ہیں۔"

اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اس نے ایک ہی سانس میں پندرہ بیس قسم کی شرابیں گنوا دیں' پھر انگور کی' کھجور کی اور خدا جانے کس کس چیز کی وائن کی فہرست سنانے لگی۔ لبنیٰ خانم تو حیرت زدہ رہ گئیں۔ جب وہ سانس لینے کو رکی تو ہم نے جاوید صاحب سے کہا "دیکھو بھائی' تم فرائی انڈے کا آرڈر دے کر اسے پہلے ہی بہت ناراض کر چکے ہو' اب اگر پینے کے لئے بھی کچھ نہیں منگایا تو یہ ہمیں قتل کر دے گی۔"

بولے "کیا بے ہودہ باتیں کرتے ہو؟ اس فرنگن سے ڈر کر اب ہم شراب بھی پئیں؟"

ہم نے کہا "کچھ نہ کچھ تو ضرور پینا چاہئے" پھر ہم نے ویٹریس پر خان صاحب والا نسخہ آزمایا اور بہت مسکرا کر پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟"

وہ اس اچانک اور غیر متوقع سوال پر حیران پریشان رہ گئی۔ یعنی کہاں شراب کا آرڈر دینا تھا اور کہاں ہم اس کا نام پوچھ رہے تھے۔ کہنے لگی "فیڈرا۔"

ہم نے کہا "بہت اچھا نام ہے۔ ہمارے ملک میں بھی اٹلی کی ایک فلم آئی تھی جس میں ہیروئن کا نام فیڈرا تھا اور وہ پرانے زمانے کی ملکہ تھی۔"

جاوید صاحب نے لقمہ دیا "اور بہت آوارہ مزاج تھی۔"

فیڈرا کو یہ بات بہت پسند آئی کہنے لگی "وہ ہماری پرانی داستانوں کا ایک کردار

ہے۔ بہت رومانٹک ملکہ تھی جس پر مہربان ہوتی تھی اگلے دن اسے مروا دیا کرتی تھی۔ اچھا یہ بتائیں کہ آپ لوگ کس ملک سے آئے ہیں؟"

جاوید صاحب کی حس مزاح پھڑکی۔ بولے "کوہ قاف سے۔"

پوچھنے لگی "وہ کہاں پر ہے؟"

ہم نے کہا "کبھی پاکستان کا نام سنا ہے؟"

اس نے اپنی خوبصورت گردن انکار میں ہلا دی۔ ہماری بیوی کی حب الوطنی کو آنچ پہنچی۔ کہنے لگی "بہت جاہل عورت ہے۔"

ہم نے پوچھ لیا "تم کہاں تک پڑھی ہو؟"

اتنی دیر میں کاؤنٹر کے پیچھے سے ایک موٹا سا گورا چٹا' درمیانی عمر کا آدمی اپنی بڑی سی توند پر ایپرن باندھے تیزی سے ہماری جانب آیا اور فیڈرا کو اطالوی زبان میں خدا جانے کیا کیا کہنا شروع کر دیا۔ اس کی موٹی سی گردن' گنجا سر' موٹے موٹے بازو اور شانے بہت تیزی سے حرکت کر رہے تھے اور الفاظ مشین گن کی گولیوں کے مانند اس کے پھولے ہوئے سرخ و سفید منہ سے برآمد ہو رہے تھے۔ ہم سمجھ گئے کہ وہ فیڈرا کو ڈانٹ رہا ہے کہ گاہکی کا ٹائم ہے اور تم یہاں کھڑی باتیں بنا رہی ہو۔ ریستوران سیاحوں سے بھرا ہوا تھا اور پورے ریستوران میں فیڈرا کے علاوہ صرف ایک اور تندرست بلکہ موٹی اور لمبی تڑنگی ویٹریس ڈیوٹی پر تھی۔ یہ موٹے صاحب کاؤنٹر کے پیچھے آرڈر وصول کرتے تھے اور اندر باورچی خانے میں روانہ کر دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اتنی مصروفیت کے وقت ایک ویٹریس اگر بلاوجہ باتیں بنانے کھڑی ہو جائے تو دھندا ہی چوپٹ ہو جائے چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہو رہا تھا۔

فیڈرا نے بھی شانے اچکا اچکا کر تیزی سے اپنی صفائی میں کچھ کہا اور بار بار ہماری جانب اشارے کرتی رہی۔ مگر موٹے رومن نے ایک نہ سنی۔ ہمیں بہت غصے سے گھورا اور دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر خود ہی کچھ بڑبڑاتا ہوا واپس چلا گیا۔ یوں لگا جیسے ہمیں بددعائیں دے رہا ہے۔ ساتھ ہی اس نے فیڈرا کو بھی ہدایت کی کہ ہماری میز کے پاس سے ہٹ جائے۔ اس کے اشارے پر دوسری موٹی اور لمبی تڑنگی ویٹریس جو ہماری پنجابی فلموں کی ہیروئن بننے کے لئے لاجواب تھی' ہمارے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ فیڈرا نے جاتے جاتے

ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں ہم سے کہا کہ اگر لنچ کے بعد آپ لوگ آئیں تو فرصت میں باتیں کریں گے۔ جاوید صاحب کو اس کی یہ ادا اس قدر پسند آئی کہ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ جیب سے تین سولیرا کے تین سکے نکال کر اس کی خدمت میں پیش کر دئے۔ جنہیں اس نے مسکراتے ہوئے قبول کر لیا اور رخصت ہو گئی کیونکہ موٹا رومن جس کی شکل نیرو سے ملتی تھی اسے دوبارہ پکارنے لگا تھا اور اس بار شاید اپنی زبان میں اسے گالیاں بھی دے رہا تھا۔ مگر وہ بھی اول نمبر کی ڈھیٹ تھی۔ شرارت سے ہماری جانب دیکھا اور مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ اب پنجابی فلموں کی ہیروئن ہمارے سامنے کھڑی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اسے لاچا کرتا پہنا دیا جاتا تو وہ ہماری بڑی سی بڑی ہیروئن کو لاچار کر دیتی۔ صورت شکل بھی اچھی تھی اور قد و قامت اور ڈیل ڈول بھی ۱۹۹۰ء کی انجمن سے مشابہ تھا۔ ہم نے فوراً اس کی خدمت میں تین عدد فرائڈ انڈوں اور چھ عدد ٹوسٹ کا آرڈر پیش کیا اور اس کے دریافت کرنے سے پہلے ہی کہہ دیا کہ کوکا کولا، جوس، لسی، دودھ جو کچھ بھی دستیاب ہو لے آئے۔ یہ عجیب و غریب آرڈر اسے پسند تو نہیں آیا مگر وہ تین سولیرا کی ٹپ دیکھ چکی تھی چپ چاپ چلی گئی۔

لنچ سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے اٹھ کر نیپکن سے ہاتھ صاف کئے اور چل پڑے۔ وہ کچھ بولی تو نہیں مگر دل ہی دل میں گالیاں دیتی ہو گی۔ دراصل وہاں ٹپ دینا کچھ لازمی نہیں ہے۔ گاہک کی مرضی پر منحصر ہے اور ہم تین سولیرا کی خطیر رقم پہلے ہی فیڈرا کی نذر کر چکے تھے۔ رخصتی کے وقت ہم نے بہت تلاش کیا مگر وہ ہمیں نظر نہ آئی۔ شاید موٹے رومن نے باورچی خانے میں اس کی ڈیوٹی لگا دی تھی۔

ویٹی کن سے تھکے تھکائے ہم پھر بس میں سوار ہو کر اپنے ہوٹل میں پہنچ گئے اور ٹھنڈے کمروں میں کمبل اوڑھ کر سو گئے، شام کو بیدار ہوئے، نہائے، دھوئے اور سیر کے لئے باہر نکل پڑے۔ دراصل ہم اس محاورے کے مطابق عمل کر رہے تھے کہ جب روم میں رہو تو وہی کچھ کرو جو رومن کرتے ہیں۔ رومن کیونکہ قیلولہ ضرور کرتے ہیں اور شام ہی کو گھر سے باہر نکلتے ہیں۔ اس لئے ہم نے بھی یہی مناسب جانا۔

یہ اتوار کا دن تھا۔ یہ انڈا اور دو ٹوسٹ کبھی کے ہضم ہو چکے تھے۔ جاوید صاحب کا مشورہ تھا کہ کسی اچھے سے ریستوران میں چل کر پیٹ بھر کر کھانا کھائیں۔ ایک جگہ گئے اور ایک گنجے (خدا جانے روم میں گنجے اتنے زیادہ کیوں ہوتے ہیں؟) سے بڑے میاں کے ہاتھ میں ایک سولیرا کا سکہ رکھ دیا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ ہم نے انہیں اشاروں سے سمجھایا کہ ہمیں باورچی خانے کے اندر لے چلو۔ وہ کچھ نہ سمجھے تو جاوید صاحب نے ایک سولیرا مزید ان کے حوالے کر دیا۔ وہ سمجھے تو پھر بھی نہیں مگر ہمارے ساتھ چل پڑے۔ باورچی خانہ خاصا صاف ستھرا تھا اور تین موٹی موٹی صحت مند گوری چٹی خواتین باورچن کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ ایک خاتون ابلے ہوئے چاولوں میں سے پیچ نکال رہی تھیں۔ ہم نے اشارے سے بتایا کہ ہمیں یہ چاول درکار ہیں۔ بڑے میاں نے دو سولیرا کے نشے میں آ کر باورچنوں کے سامنے ایک لمبی تقریر جھاڑ دی۔ جس کے جواب میں وہ سب ہمیں ہنس ہنس کر دیکھنے لگیں۔ لبنیٰ نے آگے بڑھ کر دیگچیوں کے ڈھکنے اٹھا اٹھا کر جھانکنا شروع کر دیا۔ ایک دیگچی میں مرغ کا سالن ٹائپ کی کوئی چیز تھی۔ ہم نے اس کا بھی آرڈر دے دیا۔ اب تو باورچی خانے میں ایک ہلچل مچ گئی۔ ہر باورچن نے بڑھ چڑھ کر اپنی اپنی دیگچیاں دکھانے کی کوشش کی۔ مگر سوائے اسپاگیتھی کے ہمیں کوئی چیز پسند نہیں آئی۔ ان تین چیزوں کا آرڈر دے کر ہم تینوں باورچی خانے سے باہر نکلنے لگے تو موٹی موٹی باورچنیں آپس میں زور و شور سے باتیں کرنے لگیں۔

لبنیٰ نے کہا "یہ تو زیادتی کی بات ہے۔ انہیں بھی ٹپ دینی چاہئے۔"

پوچھا "کس بات کی؟"

بولیں "تعاون اور خلوص کا بدلہ تو ملنا چاہئے انہیں۔ اب یہی دیکھ لیجئے کہ ان ہی کی بدولت آج ہم پیٹ بھر کر کھانا کھائیں گے" بات واقعی معقول تھی۔ جاوید صاحب ہمارے خزانچی تھے۔ انہوں نے فوراً جیب میں ہاتھ ڈال کر سو سولیرا کے تین سکے نکالے اور تینوں خواتین کے حوالے کر دئے۔ انہوں نے بے حد خوشی کا اظہار کیا، اگر بس چلتا تو شاید ہماری بلائیں بھی لے لیتیں مگر پھر انہوں نے لبنیٰ کو اپنے موٹے موٹے بازوؤں میں دبا کر پیار کیا اور جانے کیا کیا کہتی رہیں۔ لبنیٰ کا خیال ہے کہ وہ انہیں دعائیں دے رہی تھیں۔ جاوید صاحب کا خیال تھا کہ وہ کہہ رہی تھیں کہ ایسے بے وقوف اور انوکھے گاہک ہر روز ہمارے ریستوران اور باورچی خانے میں آیا کریں۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب ابھی افراط زر اور کساد بازاری اتنی زیادہ نہیں ہوئی

تھی۔ دو سو تین سو لیرا کی بخشش بہت رئیس لوگ ہی دیا کرتے ہوں گے اور عام سیاحوں سے تو اٹلی کے لوگ کسی قسم کی بخشش کی توقع ہی نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مجبوراً انہیں بے وقوف بنا کر ان سے رقم بٹورتے رہتے ہیں۔

اب جو ہم ریستوران کی رنگین میز پوش والی میز پر جا کر بیٹھے تو گنجے بڑے میاں نے سارے ہال کے گلدستے لا کر ہماری میز پر سجا دیئے تھے اور پوچھ رہے تھے کہ پینے کے لئے کیا لاؤں؟ ہم نے کہہ دیا دودھ۔"

وہ تھوڑے سے حیران تو ہوئے مگر کھانے کے ساتھ وائن، بیئر اور دودھ پینا اٹلی میں کوئی نرالی یا معیوب بات نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے وہ دوڑ کر گئے اور ٹھنڈے دودھ کے تین گلاس لا کر ہمارے سامنے رکھ دئے۔ وہ ہم پر یوں صدقے واری جا رہے تھے کہ ہم شرمندہ ہونے لگے۔ جاوید صاحب نے یہ قرار داد پیش کی کہ جب تک روم میں رہیں گے اسی ریستوران میں کھانا کھائیں گے۔ اور سب نے متفقہ طور پر یہ قرار داد منظور کر لی۔ دراصل ہماری جو یہاں آؤ بھگت ہو رہی تھی وہی ہمیں خوش کرنے کے لئے کافی تھی۔ انسان عزت کا تو بھوکا ہوتا ہے۔ میرا مطلب ہے کھانے کے علاوہ۔

کھانا شروع ہوا تو لطف آ گیا۔ مرغ کا سالن جس کا نام رومن میں خدا جانے کیا تھا، خاصا مزیدار تھا۔ مصالحے وغیرہ بھی ہمارے پاکستانی کھانوں جیسے تھے۔ پھر سادہ چاول کے ساتھ اس کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ اسپا گیتھی ہم نے زندگی میں پہلی بار کھائی تھی کھائی کب تھی کھانے کی کوشش کی تھی۔ یہ سویوں کی شکل کی چیز ہوتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ سویاں سیدھی اور سخت ہوتی ہیں۔ یہ ملائم اور ریشم کے لچھوں کے مانند ہوتی ہے۔ اٹلی والے تو بڑے مزے سے چھری کانٹے کی مدد سے کھا لیتے ہیں مگر ہمارا یہ حال تھا کہ کانٹے میں سمیٹتے تو وہ پھسل کر دوسری جانب سے پلیٹ میں گر جاتیں۔ ادھر ادھر دیکھا تو کوئی ہماری طرف متوجہ نہ تھا۔ ایک رومن جوڑا سامنے کی میز پر بیٹھا اسپا گیتھی کھا رہا تھا۔ وہ بڑے مزے سے سویوں کے درمیان میں کانٹا رکھ کر اسے گھماتے تو ساری سویاں کانٹے میں گیند کی طرح لپٹ جاتیں۔ وہ بڑے مزے سے اٹھا کر منہ میں رکھ لیتے۔ ہم نے بہت کوشش کی مگر ناکام رہے۔ پھر چمچے اور کانٹے کی مدد سے کھانا چاہا مگر وہ تو پارے کی طرح پھسلی جا رہی تھیں۔ جاوید صاحب نے چھری کانٹا ایک طرف رکھا اور ہاتھوں سے چاولوں کی طرح کھانا شروع کر دیا۔ اس طرح یہ ہوا کہ نوالے میں سے آدھی سویاں تو پلیٹ میں گر جاتیں مگر آدھی ان کے منہ میں چلی جاتیں، مگر وہاں سے بھی مڑے دھاگوں کی مانند باہر نکلنے کو بے تاب رہتیں۔ ہمیں معلوم ہی نہیں تھا کہ ہماری یہ کاوشیں رائیگاں نہیں جا رہی تھیں۔ گنجے بڑے میاں ہمیں بہت غور سے دیکھتے رہے تھے اور باورچی خانے کے اندر جا کر موٹے باورچنوں کو بھی یہ نظارہ دکھا چکے تھے۔ ہنسی کی دبی دبی آوازوں پر ہم نے پلٹ کر دیکھا تو وہ تینوں خواتین کچھ فاصلے پر کھڑی ہنس رہی تھیں اور بڑے میاں کے چہرے پر بھی فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ لبنیٰ کی پلیٹ میں اسپا گیتھی جوں کی توں موجود تھی۔ ایک موٹی باورچن نے آگے بڑھ کر اطالوی زبان میں ایک مختصر سی تقریر کی اور پھر ایک خالی کرسی پر بیٹھ کر نمونے کے طور پر لبنیٰ کو چھری کانٹے کی مدد سے اسپا گیتھی کھانے کا مظاہرہ دکھایا۔ انہوں نے دو تین لقمے لئے اور ساری پلیٹ صاف ہو گئی باقی ماندہ باورچنوں کا ہنسی کے مارے برا حال تھا۔ اب ہال میں موجود دوسرے لوگ بھی اس تماشے سے لطف اندوز ہونے لگے تھے۔ ہم نے بغور جائزہ لیا تو پتا چلا کہ اور بھی کئی سیاح اسپا گیتھی کھانے کی کوشش میں ناکام ہو چکے تھے۔ ایک جوڑا جو غالباً نیا شادی شدہ تھا، بڑے پیار سے ایک دوسرے کو اسپا گیتھی کھلا رہا تھا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ شوہر اسپا گیتھی کی ڈوری کا ایک سرا اپنی طناز بیگم کے منہ میں رکھ دیتے اور وہ ایک لمبی سانس کھینچ کر پوری کی پوری ڈوری منہ میں کھینچ لیتیں اور شوہر خوشی سے تالیاں بجاتے۔ اس طرح ایک ایک اسپا گیتھی کھانے میں دیر تو لگتی تھی مگر یہ نہایت معقول اور موثر طریقہ تھا۔ ہم نے بھی اپنی بیگم کو اسی انداز میں کھانے کا مشورہ دیا مگر ان کی پلیٹ تو موٹی باورچن مظاہرے کے دوران میں صفا چٹ کر چکی تھی۔ دوسرے یہ کہ لبنیٰ کو یہ طریقہ بھی اچھا نہیں لگا۔ بولیں "کچھ تو شرم کیجئے۔ یہ بھی کوئی طریقہ ہے۔"

جاوید صاحب نے کہا "بھابی! روم میں ویسا ہی کرنا چاہیے جیسا کہ رومن کرتے ہیں۔"

مگر لبنیٰ کو یہ مشورہ بھی پسند نہیں آیا۔ بہرحال چاول اور مرغ سالن سے پیٹ تو بھر چکا تھا۔ بعد میں آئس کریم نے لطف دوبالا کر دیا۔ جاوید صاحب نے مزید عیاشی کی خاطر کافی کا آرڈر بھی دے دیا اور ہم بہت آسودگی سے کرسیوں پر نیم دراز ہو گئے۔ یہ

ریستوران بھی فٹ پاتھ پر تھا۔ اس کا کچھ حصہ عمارت کے اندر بھی تھا مگر بیشتر کرسیاں فٹ پاتھ پر لگی ہوئی تھیں اتنی دیر میں ایک اسکوٹر پر ایک طرح دار نوجوان گلے میں آرگن لٹکائے آیا۔ فٹ پاتھ کے ساتھ اسکوٹر کھڑا کیا اور ریستوران کے اندر چلا آیا۔ گنجے بڑے میاں نے اسے دیکھ کر بہت خوشی کا اظہار کیا چند اور جوڑے بھی مسکرائے۔ اس نے باری باری ہر میز کے سامنے جاکر آرگن بجایا۔ ہر ایک نے تالیاں بجاکر داد دی اور چند سولیرا بھی اس کے حوالے کئے۔ ہمارے پاس آکر اس نے جھک کر تعظیم دی اور اطالوی زبان میں بہت لچھے دار تقریر جھاڑ دی۔

ہم نے کہا "تھری کوائنز ان دی فونٹین" والا گانا تمہیں آتا ہے" وہ گانے کے بولوں سے سمجھ گیا اور زور زور سے سرہلانے لگا ہم نے کہا "وہی سنا دو" اس نے آرگن سنبھال کر بجانا شروع کر دیا ۔ یہ نغمہ ان دنوں ساری دنیا میں بہت مقبول تھا ریستوران میں موجود لوگوں نے بلند آواز میں گانا شروع کر دیا۔

THREE COINS IN THE FOUNTAIN

EACH ONE SEEKING HAPPINESS.

واقعی ایک سماں بندھ گیا۔ نوجوان نے جوش میں آکر ساز کو طول دے دیا اور ریستوران میں موجود خواتین و حضرات نے بھی اپنی سریلی اور بے سری آوازوں میں گلوکاری کا خوب مظاہرہ کیا۔ حد یہ کہ باورچی خانے کے اندر سے تینوں موٹی موٹی باورچنیں بھی باہر آکر گانے میں شامل ہوگئیں۔ یہاں تک کہ سڑک پر چلتے راہ گیروں نے بھی رک کر تال کے ساتھ تالیاں بجانا اور گانا شروع کردیا۔ پانچ سات منٹ تک یہ سلسلہ جاری رہا اور پھر جب ساز کی آواز بند ہوئی تو ہر طرف پر زور تالیاں گونجنے لگیں۔ سڑک پر سے گزرنے والے جوڑوں نے بھی یہ جانے بغیر کہ معاملہ کیا ہے' خوب زور زور سے تالیاں اور نوجوانوں نے سیٹیاں بجانی شروع کر دیں۔ اس پرفارمنس سے خوش ہو کر حاضرین نے مزید لیرا اس گویے بلکہ سازندے کی نذر کئے۔ ہمارا تو کچھ دینے ولانے کا ارادہ نہیں تھا مگر لبنیٰ نے شرم دلائی اور کہا کہ اس نے ہماری فرمائش پر اتنا اچھا ساز بجایا ہے۔ اگر ہم نے کچھ بخشش نہ دی تو یہ سب لوگ کیا سوچیں گے۔

جاوید صاحب بولے "بھابی ان کے سوچنے سے ہماری صحت پر کیا اثر پڑے گا؟ یہ ہمارا آگا پیچھا تو جانتے نہیں۔ بدنامی تو وہاں ہوتی ہے جہاں لوگ آپ کو جانتے ہوں۔ یہاں روم میں ہمیں کون جانتا ہے اور ہمیں کون سا روز روز اس ریستوران میں آنا ہے۔"

ہماری نظر گنجے بڑے میاں اور موٹی موٹی باورچنوں کی طرف اٹھ گئی۔ پروگرام کے مطابق ہمیں ہر روز یہیں کھانا کھانے کے لئے آنا تھا اور لبنیٰ کو یہ گوارا نہیں تھا کہ ہم ان موٹی موٹی باورچنوں اور گنجے بڑے میاں کے آگے شرم سار ہوں چنانچہ جاوید صاحب نے بادل ناخواستہ جیب میں ہاتھ ڈالا اور دو تین سولیرا کے سکے نکال کر نوجوان کے حوالے کر دئے۔ ہمیں لبنیٰ نے آنکھوں آنکھوں میں شرم دلائی تو ہم نے بھی جیب خاص سے دو سو لیرا کے دو سکے سازندے کی خدمت میں پیش کر دئے۔ وہ سینوریتا کہتا ہوا اسکوٹر پر بیٹھا اور رخصت ہوگیا۔ غالباً کسی اور ریستوران میں ساز بجانے کے لئے۔ جاوید صاحب نے جلدی جلدی حساب لگایا اور بولے "یہ شخص دس منٹ کے اندر اندر ڈیڑھ دو ہزار لیرا سمیٹ کر لے گیا اور صبح سے رات تک خدا جانے کتنے ہزاروں لیرا کما لیتا ہو گا پھر وہ آہ بھر کر کہنے لگے "یار کاش تم بھی کوئی ساز بجانا سیکھ لیتے تو آج ہمیں روم میں کرنسی کی پرابلم پیش نہ آتی۔"

گنجے بڑے میاں بے حد خوش و خرم نظر آرہے تھے۔ انہوں نے ہمارے پاس آکر تیزی سے دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر خدا جانے کیا کیا کہنا شروع کر دیا۔ خوشی کے مارے ان کا چہرہ گلاب کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ ہمارے اندازے کے مطابق وہ نوجوان سازندے کی فن کاری کی تعریف کر رہے تھے اور مارے خوشی کے ان کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ ہم نے بل لانے کو کہا تو وہ مٹکتے اور وہی نغمہ گنگناتے ہوئے چلے گئے۔ ادھر باورچی خانے سے بھی تینوں موٹی خواتین کی سریلی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہم تو مان گئے ان رومیوں کو۔ اس قدر زندہ دل اور رومان پسند اور خوش باش قوم ہم نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی اور شاید اس کے بعد بھی نہیں دیکھی۔ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ اگر اس قوم سے کوئی مقابلہ کر سکتا ہے تو وہ ہماری قوم ہے۔ مگر بدقسمتی سے ہماری قوم میں وہ شائستگی' تہذیب اور نظم و ضبط نہیں ہے ورنہ ہمارا لاہور بھی روم سے کچھ کم تو نہیں ہے۔ بہرحال یہ بھی زندہ دلان لاہور کی ادائے خاص ہے۔

رات کو ہم سیاحوں کے کوچ میں سوار ہو کر اور بھی کئی یادگاروں پر گئے اور نائٹ کلبوں وغیرہ کے علاقے کا پھیرا بھی لگایا۔

یہاں حسب معمول سیاحوں کا ہجوم تھا۔ سیاح کلبوں کی سیر کر رہے تھے اور رومن نوجوان سیاح خواتین کا تماشا دیکھنے میں مصروف تھے۔ اکیلی دوکیلی عورتوں کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ ان کو چٹکی بھی کاٹ لیتے ہیں اور جواب میں انہیں ایک تحسین آمیز مسکراہٹ مل جاتی ہے۔ بھئی خوب ہیں یہ روم کے لوگ اور ان کے طور طریقے بھی۔ لوگ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں کہ یہ ایک لازوال شہر ہے۔

جاوید صاحب بولے "لازوال تو واقعی ہے۔ اتنی بار اس پر زوال آیا ہے کہ اب کھنڈر اور ملبے کا ڈھیر بن کر رہ گیا ہے۔ اس کے باوجود لازوال ہے۔"

دراصل جاوید صاحب (وہ اب مرحوم ہو چکے ہیں) انتہائی کٹر پاکستانی تھے اور وہ یہ برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے کہ کسی بھی معاملے میں کوئی دوسرا ملک پاکستان پر بازی لے جائے۔ یہاں تک کہ برائی میں بھی وہ کسی دوسرے ملک کا پاکستان پر سبقت لے جانا گوارا نہیں کرتے تھے۔ روم کے ہر کھنڈر کو دیکھ کر وہ کہتے "کیا فضول چیز ہے؟ ایسے کھنڈر ہمارے ملک میں کیا کم ہیں؟ فرق یہ ہے کہ ہم ان کی اتنی تعریف نہیں کرتے۔ لاہور کو دیکھ لو' ملتان کو دیکھ لو' بہاولپور کو دیکھ لو' سندھ کو دیکھ لو' موئن جودڑو کو دیکھ لو' ٹیکسلا کو دیکھ لو' یار ہم تو بہت نالائق لوگ ہیں۔ ہمارے پاس کمی کس چیز کی ہے آخر؟"

ہم نے کہا "عقل' سلیقے اور پلاننگ کی۔"

بولے "دیکھا نہیں تم نے' یہ لوگ اپنی کسی حرکت پر' کسی عادت پر شرمندہ نہیں ہوتے۔ بدتمیزی بھی کرتے ہیں تو اس پر فخر کرتے ہیں۔ انگریزی کا ایک لفظ نہیں جانتے اور اس بات پر فخر کرتے ہیں۔ قطار نہیں بناتے' دھکم پیل کرتے ہیں۔ سیٹیاں بجاتے ہیں پھر بھی ان باتوں پر شرمسار نہیں ہوتے۔ ایک ہم ہیں کہ ہر بات پر مارے شرمندگی اور ندامت کے زمین میں گڑے جاتے ہیں۔ یہ اپنے کھنڈروں اور ملبے پر بھی فخر کرتے ہیں اور ساری دنیا کو دکھاتے ہیں۔ کروڑوں اربوں ڈالر اس ملبے کو دکھا کر کما لیتے ہیں۔ ایک ہم ہیں جو غیر ملکیوں کی آمد پر اپنے کھنڈروں کے آگے قناتیں کھڑی کر دیتے ہیں تاکہ ان کی نظر نہ پڑے' ورنہ ہمیں شرمندگی ہو گی۔ یار آفاقی کبھی سوچا تم نے' ہم کس قدر احساس کمتری کا شکار ہیں۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟"

لبنیٰ خانم نے بہت دانائی کی بات کی' بولیں "دراصل یہ لوگ کبھی غلام جو نہیں رہے۔ ہم تو غلام رہ رہ کر ہمیشہ کے لئے ذہنی طور پر غلام ہو گئے ہیں۔"

ہم نے کہا "مگر اب تو ہم آزاد ہو چکے ہیں۔"

اس بار فلسفہ بگھارنے کی جاوید صاحب کی باری تھی۔ کہنے لگے میرے دوست ہم آزاد ہونے کے بعد بھی غلاموں کے غلام ہیں۔ یہ بیوروکریٹس' یہ سرمایہ دار' یہ وڈیرے' جاگیردار' یہ افسر جو انگریز ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں......"

ہم نے کہا "بس بس یار اب زیادہ لمبی تقریریں مت کرو ہم پاکستان میں رہ کر بھی یہی تقریریں سنتے رہتے ہیں۔ پرائے ملک میں تو چین سے رہنے دو۔"

انہوں نے لمبی آہ بھری اور بولے "یہی نشانی ہے ہماری ذہنی غلامی کی۔ میرے بچے تم بھی مجبور ہو اپنی غلامانہ ذہنیت سے اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔"

پتا نہیں قصور کس کا ہے۔ مگر کسی نہ کسی کا تو ضرور ہے۔

روم میں چار پانچ دن گزارنے کے بعد اور اسی ریستوران میں خشکہ اور مرغ سالن کھانے کے بعد ہم نے روم سے رخت سفر باندھا۔ گنجے بڑے میاں سے خوب گلے مل کر رخصت ہوئے موٹی موٹی باورچنوں کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا اور وقت رخصت دو دو سولیرا فی باورچن ان کی خدمت میں پیش کئے۔ انہوں نے بھی ہمیں بہت جذباتی انداز میں رخصت کیا اور توقع ظاہر کی کہ ہم دوبارہ بلکہ سہ بارہ روم آئیں گے اور ان کے ریستوران میں کھانا کھایا کریں گے اور ٹھنڈا دودھ پیا کریں گے۔ یکایک موٹی باورچن کو کچھ یاد آیا۔ وہ برابر کی دکان سے ایک انتہائی حسین لڑکی کو اپنے ساتھ لے کر آئی جس نے ہمارے مابین مترجم کے فرائض سرانجام دئیے۔ ہمیں افسوس اس بات کا تھا کہ ان کو یہ خیال پہلے کیوں نہ آیا۔ ورنہ ہمیں گفتگو میں خاصی آسانی رہتی اور روم کی ایک اور خوبصورت لڑکی سے ہماری دوستی ہو جاتی بہرحال مترجم نے آتے ہی بے حد غلط انگریزی میں بتایا کہ اس کا نام سلوانا ہے۔ ہم نے کہا کہ ہم بھی ایک سلوانا منگانو کو جانتے ہیں۔ وہ اٹلی کی بہت مشہور فلمی ہیروئن ہے اور تمہاری ہی طرح خوب صورت ہے۔ وہ بہت خوش ہوئی حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ فلمی سلوانا منگانو سے زیادہ دلکش تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ

گوشت پوست کی شکل میں ہمارے سامنے تھی، مگر ہم اس سے کہتے تو وہ مبالغہ سمجھتی۔

سلوانا نے کہا کہ یہ خواتین دریافت کر رہی ہیں کہ آپ لوگوں نے حوض میں سکے بھی پھینکے ہیں یا نہیں؟ فوری طور پر ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

جاوید صاحب کہنے لگے "یار وہی بدبودار جگہ جہاں گھوڑوں کی لید کی بدبو سے دم گھٹا جاتا ہے۔ ہمارے لاہور کا پرانا شہر اس سے کہیں زیادہ خوبصورت اور دلکش ہے۔ یہ لوگ اسی طرح سیاحوں سے پیسے بٹورتے ہیں۔ انہیں لوٹنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

ہماری اردو گفتگو مترجم کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ شاید ہم حوض میں سکے ڈالنا بھول گئے ہیں اور موٹی باورچنوں کو یہ اطلاع دے دی۔ انہوں نے اپنے موٹے موٹے ہاتھ اپنے ایپرن میں ڈال کر کسی جیب میں سے سو سولیرا کا ایک سکہ کہیں سے تلاش کر کے نکالا اور مترجم کے حوالے کیا۔ اس نے دو تین سو لیرا ہمارے حوالے کئے اور کہا "یہ کہتی ہیں کہ جانے سے پہلے آپ یہ سکے حوض میں ضرور پھینک دینا اور یہ خواہش کرنا کہ آپ پھر روم تشریف لائیں۔"

ہم نے موٹی باورچنوں کی طرف دیکھا۔ انہوں نے زور زور سے گردن ہلا کر اس کی تصدیق کر دی۔ ان کا یہ جذبہ محبت اور خلوص ہمیں بھی متاثر کر گیا۔ اتنی دیر میں گنجے بڑے میاں بھی آ گئے تھے۔ انہوں نے بھی اپنی سفید کوٹ کی جیب میں سے سولیرا کا سکہ نکال کر سلوانا کے حوالے کیا اور درخواست کی کہ ان کی طرف سے حوض میں پھینکنے کے لئے تمہیں دے دیا جائے ان رومنوں کی جذباتیت اور فراخ دلی نے ہمیں حیران کر دیا تھا بہرحال ہم نے اپنے دئے ہوئے لیرا میں سے چار سو لیرا وصول تو کر لئے اور پہلے ان چاروں کا شکریہ ادا کیا اور پھر سلوانا کا شکریہ ادا کرتے رہے۔ وہاں سے رخصت ہونے لگے تو وہ پانچوں فٹ پاتھ کے باہر تک الوداع کہنے کے لئے آئے۔

جاوید صاحب کچھ دیر تو جذبات کے سمندر میں غوطہ زن رہے۔ پھر بولے "چلو کم از کم چار سولیرا تو وصول ہوئے۔"

ہم نے کہا "کیا مطلب؟ کیا تم یہ سکے حوض میں نہیں ڈالو گے؟"

"ہرگز نہیں" وہ بولے۔

"جاوید صاحب! یہ تو کمینگی کی انتہا ہو گی۔ ذرا سوچو تو تم اپنے پاکستانی ہونے پر بہت فخر کرتے ہو، مگر تمہارا کردار کیا ہے؟ تمہارا رویہ کیا ہے؟ تمہاری ذہنیت کیا ہے؟"

وہ شرمندہ ہو کر بولے "بس بس یار! زیادہ شرمندہ مت کرو۔ ہم ہوٹل جانے سے پہلے ابھی حوض پر جا کر فوارے میں سکے پھینکیں گے۔"

چنانچہ ہم ایک گھوڑا گاڑی میں سوار ہو کر اسی قدیم علاقے میں پہنچے جہاں گھوڑوں کی لید کی بدبو پھیلی ہوئی تھی اور رات گزرنے کے باوجود سیاحوں کا مجمع لگا ہوا تھا۔ ہم نے فوراً دو سکے حوض میں پھینکے اور خشوع و خضوع سے خواہش کی کہ ہمیں ایک بار پھر روم کی سیر کرنے کا موقع ملے۔ کچھ دیر بعد ہم اپنے ہوٹل پہنچ کر اپنا سامان سمیٹنے لگے۔ جاوید صاحب کہنے لگے "یار تم نے تو مجھے بھی جذباتی کر دیا۔ واقعی وہ چاروں بہت مخلص اور محبت کرنے والے لوگ ہیں۔"

جاوید صاحب کو ہم نے یہ بات کبھی نہیں بتائی کہ ہمیں ریستوران کی باورچنوں اور گنجے بڑے میاں نے جذباتی نہیں کیا تھا۔ دراصل سلوانا نے ہمیں جذباتی کر دیا تھا۔ ہم جب ٹرین میں سوار ہوئے تو ہم نے حسب عادت اپنا یہ راز بھی اپنی بیگم کو بتا دیا وہ مسکرائیں اور بولیں "واقعی بہت پیاری لڑکی ہے۔ اگلی بار اگر روم آئے تو اس کے لئے پاکستانی شلوار قمیص کا تحفہ لے کر آئیں گے۔"

ہم نے دل میں سوچا، اگر بیوی ہو تو ایسی۔ اسی لئے تو ہم اپنی بیوی سے کوئی راز نہیں چھپاتے۔

فلورنس ایسا شہر ہے جہاں پہنچ کر پتھروں کی اہمیت کا اندازہ ہونے لگتا ہے پتھر کی سڑکیں، پتھر کی گلیاں، پتھر کی عمارتیں، کلیسا، گرجا گھر، عجائب گھر، پتھر کے مجسمے، یہ ایک مکمل پتھریلا شہر ہے۔ ہم ایئرکنڈیشنڈ کوچ کے ذریعے فلورنس پہنچے تھے اور ہر چیز کو حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ یہ سارا کا سارا شہر عجائب گھر ہے۔ کیسی کیسی یادگاریں، کیسی عمارتیں، کلیسا، میوزیم، یہاں تک کہ قبرستان تک فن کدہ نظر آتے ہیں۔ خان صاحب اور بٹ صاحب بھی اس نظارے سے حیرت زدہ بلکہ کچھ خوف زدہ سے لگ رہے تھے۔
ایک درمیانہ درجے کے ہوٹل میں ہم نے کمرے حاصل کئے۔ یہ شہر روم کے مقابلے میں سستا نظر آیا۔ کم از کم ہوٹلوں کی حد تک تو یہی اندازہ ہوا۔ ہوٹل بہت خوبصورت اور صاف ستھرا تھا۔ آسائش اور آرام کی ہر چیز موجود تھی۔ اس عمارت میں بھی زیادہ استعمال پتھروں کا ہی تھا۔ بھورا پتھر، سرخ پتھر، سفید پتھر، سیاہ پتھر، بٹ صاحب کافی دیر تک چپ چاپ رہے، پھر جب ہم کافی پی کر کچھ تازہ دم ہوئے تو بولے "بھائی یہ شہر تو بہت پھریتلا ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے پتھریلا؟"

"ظاہر ہے میرا مطلب یہی ہے۔ اتنے بہت سے پتھر ان لوگوں نے اکٹھے کہاں سے اور کیسے کئے ہوں گے؟"

ہم نے کہا "میرے عزیز! پتھر پہاڑوں میں سے نکلتے ہیں۔ یہاں آپ دیکھ لیجئے کہ آس پاس پہاڑیاں، پتھریلے ٹیلے بہت ہیں۔ اس لئے ان لوگوں نے ان پتھروں کو خوب استعمال کیا اور بہت سلیقے سے استعمال کیا۔"

خان صاحب نے تبصرہ کیا "اس قدر پتھر تو پہاڑوں پر بھی نہیں ہوتے۔ پہاڑ تو صرف ایک پتھر ہوتا ہے اور یہاں اتنے ڈھیر سارے پتھر جمع کئے گئے ہیں۔ اس شہر کو دیکھ کر تو سر پھوڑنے کو جی چاہتا ہے۔"

"کس کا؟ اپنا یا دوسروں کا؟"

کہنے لگے "اپنا ہی سر پھوڑ سکتے ہیں کیونکہ پتھر تو اپنی جگہ جمے ہوئے ہیں۔ وہ فیض احمد فیض کا کیا شعر ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ پتھر تو بندھے ہوئے ہیں اور کتے کھلے بھرتے ہیں۔"

فیض کے شعر کا یہ خلاصہ بلکہ تفسیر سن کر ہم بہت متاثر ہوئے۔

"جی وہ شعر یہ ہے کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور آزاد۔"

کہنے لگے "میرا مطلب یہی حال تھا بہرحال شعر کا مفہوم تو یہی ہے نا۔"

خان صاحب کی ایک خوبی یہ ہے کہ انہیں بے شمار اشعار کے مفہوم یاد ہیں۔ پورا شعر ان کے حافظے میں کسی طرح نہیں رہ سکتا اور وہ اشعار کا نہایت فراخدلی سے استعمال بھی کیا کرتے ہیں۔

مثلاً فرمایا "وہ غالب کا ایک شعر ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ پتا نہیں کون کون زمین میں دفن ہے روز باغوں میں پھول کھلتے ہیں۔"

"آپ کا مطلب ہے

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

"ہاں ہاں، وہی۔ خیر مفہوم تو یہی ہے نا۔"

ان کی اس عادت کا ہمیں اب بخوبی علم ہو چکا تھا اور اب ہم ان کے مفہوم سے فوراً شعر پہچان لیا کرتے تھے۔

فلورنس کو آپ بہت خوبصورت میوزیم بھی کہہ سکتے ہیں اور اس شہر میں لاتعداد میوزیم بھی موجود ہیں، جہاں داخلے کے لئے کم سے کم دو تین سو لیرا کا ٹکٹ خریدنا پڑتا ہے ہم اگلے دن نیشنل میوزیم پہنچ گئے۔ وہاں بھی داخلے کے لئے ٹکٹ خریدنا پڑتا تھا، غالباً دو یا تین سو لیرا کا آپ اب تک اندازہ لگا چکے ہوں گے کہ دو تین سو لیرا اس زمانے میں خاصی معقول رقم تھی۔ اس سے آپ تین کون آئس کریم خرید سکتے تھے۔ تربوز کی چھ قاشیں خرید سکتے تھے۔ مونگ پھلی یا "چنا جور گرم" قسم کی چٹ پٹی چیزوں کی تین پڑیاں

خرید سکتے تھے۔ ویٹریس کو تین بار ٹپ دے کر اس کی مسکراہٹیں اور لگاوٹ آمیز سروس ادھار لے سکتے تھے مگر نیشنل میوزیم دیکھنا بھی ضروری تھا۔ خان صاحب نے ترکیب بتائی "سنو تم اندر جا کر دیکھ آؤ' ہم دونوں کو بھی بتا دینا کہ اندر کیا کیا دیکھا ہے؟"

خاصی مشکل ڈیوٹی تھی مگر وہ دونوں لیرا خرچ کرنے کے موڈ میں نہیں تھے چنانچہ انہوں نے نیشنل میوزیم کے سامنے والے چبوترے پر کبوتروں اور انسانی کبوتریوں کے درمیان وقت گزارنے کو ترجیح دی۔ پچاس لیرا کا دانہ خریدا اور کبوتروں کی ضیافت شروع کر دی۔ یورپ میں تقریباً ہر تاریخی عمارت پر کبوتروں کا ہجوم ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی خانقاہوں اور درگاہوں پر کبوتر منڈلاتے رہتے ہیں۔ مگر یورپ میں کبوتروں کے درمیان سجی ہوئی سیاح خواتین کا نظارہ زیادہ نظر فریب ہوتا ہے سمجھ میں نہیں آتا یہ پیٹو کبوتر سارا دن چگنے کے باوجود زندہ کیوں کر رہتے ہیں؟ خان صاحب نے خاصی دیر ریسرچ کرنے کے بعد بتایا کہ بہت سے کبوتر دانہ نہیں چگتے محض سیاحوں اور مہمانوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتے رہتے ہیں کبھی سر پر بیٹھ گئے' کبھی بازو پر براجمان ہو گئے۔ کبھی تو کسی حسینہ کے سر' شانوں اور بازو پر بھی درجنوں کبوتر بیٹھے نظر آتے ہیں اور وہ خوش ہو ہو کر تصویریں بنواتی رہتی ہیں۔ مشاہدے میں آیا کہ کبوتروں میں حس جمال خاصی ہوتی ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ جتنی زیادہ خوبصورت سیاح خاتون ہوتی ہے اتنے ہی زیادہ کبوتر اس کے اردگرد پھڑپھڑاتے رہتے ہیں اور یہ عجیب مقدس قسم کا منظر ہوتا ہے۔ سیاح انہیں اپنے ہاتھ پر رکھ کر بھی دانہ کھلاتے ہیں اور کبوتر نہایت بے تکلفی سے ہاتھ پر بیٹھ کر جب ہتھیلی پر چونچیں مارتے ہیں تو عجیب گدگداہٹ سی محسوس ہوتی ہے۔ ان ملکوں کے کبوتر بھی خاصے سیاح نواز ہوتے ہیں اور اپنی حکومت کی آمدنی میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔

خیر' ہم میوزیم کے اندر پتھر کے مجسموں اور آلات کے نمونوں سے سر پھوڑتے رہے اور خان صاحب اور بٹ صاحب باہر کبوتروں اور کبوتریوں کے ناز و انداز کا لطف اٹھاتے رہے۔

یہ میوزیم بالکل ویسا ہی تھا جیسے میوزیم ہم پہلے روم میں اور ویٹی کن سٹی میں دیکھ چکے تھے۔ فرق صرف تصویروں اور مجسموں کا تھا اور کیونکہ ہم اس معاملے میں کندۂ ناتراش تھے اس لئے ہمیں یہ فرق بھی محسوس نہیں ہوا۔ میوزیم کی عمارت کے باہر کھڑے ہو کر ہم نے ایک دوسرے کی تصویریں بنائیں اور پھر سیاحوں کے دستور کے مطابق راہ چلتی حسیناؤں کے ہاتھ میں کیمرا تھما کر ان سے درخواست کی کہ ہم تینوں کی تصویر بنا دیں۔ سیاح اس قسم کی خدمات نہایت ذوق و شوق سے سرانجام دیتے ہیں۔ اب یہ آپ کی قسمت ہے کہ تصویر کیسی آتی ہے۔ بہرحال ملاقات اور بات چیت کے لئے تقریب ملاقات یا بہانہ بہت معقول ہے۔ خان صاحب نے اس طرح اپنی انگریزی کی خوب اصلاح کی۔ خان صاحب کا فلسفہ یہ تھا کہ اٹلی والوں کے ساتھ انگریزی بولنا بہت آسان ہے کیونکہ وہ یا تو بالکل انگریزی نہیں جانتے یا پھر کم از کم آپ سے کم ہی انگریزی جانتے ہیں۔ اس لئے وہ بے جھجک ہو کر انگریزی کی ٹانگ توڑتے رہے اور انہوں نے اپنی انگریزی خاصی بہتر بنا لی۔ (خود ان کے اندازے کے مطابق) یہ اور بات ہے کہ امریکیوں اور انگریزوں کے ساتھ انگریزی میں بات چیت کرتے ہوئے وہ حسب سابق جھجکتے تھے۔

فلورنس میں تاریخی عمارتوں' کلیساؤں میوزیم گھروں اور آرٹ گیلریوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ خان صاحب نے بہت عقل مندی کی بات کی' کہنے لگے "دیکھو بھائی' یہ سب میوزیم' گرجا' عمارتیں' اندر سے ایک جیسی ہوتی ہیں اگر کوئی فرق ہے بھی تو وہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ نے ایک چیز دیکھ لی تو سمجھو سب ہی دیکھ لیا۔ اس لئے ہر جگہ پر بلاوجہ لیرا ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ ہم ہر عمارت کے سامنے کھڑے ہو کر تصویریں بنوا لیں تاکہ سند رہے اور وطن واپسی پر سب کو دکھانے کے کام آئے۔ آپ نے تصویروں میں دیکھا ہو گا کہ ایک صاحب بندوق تھامے مردہ شیر پر پاؤں رکھے کھڑے ہیں۔ بس اتنا ہی دستاویزی ثبوت کافی ہوتا ہے۔ یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ شیر کہاں مارا تھا؟ کیسے مارا تھا؟ کس سائز کا تھا؟ وغیرہ وغیرہ"

ہم خان صاحب کی دانائی پر اش اش کر اٹھے۔ ماننا پڑے گا کہ ٹیکنیکل طور پر یہ بے حد موثر اور لاجواب ترکیب تھی جس پر ہم نے کسی حد تک عمل بھی کیا۔

فلورنس کے درمیان ایک دریا بہتا ہے جس کا نام آرنو ہے اس دریا پر مختلف مقامات پر پل بنے ہوئے ہیں جو اپنی کاریگری اور صنعت کاری میں بے مثال ہیں۔ بے مثال تو اس شہر سنگ و فن کی ہر شے ہے۔ اگر روم لازوال عمارتوں کا شہر ہے تو فلورنس لازوال انسانوں کا شہر ہے کیسے کیسے شہرہ آفاق' یگانہ روزگار لوگوں نے اس شہر میں جنم لیا

اور یہاں اپنے علوم و فنون کے مظاہر چھوڑ گئے جو رہتی دنیا تک باقی رہیں گے۔ فلورنس صحیح معنوں میں ایک حیرت کدہ ہے۔ روم اگر کھنڈروں کا شہر ہے تو فلورنس سنگی حسن و رعنائی کا شہر ہے۔ بقول بٹ صاحب کے "یہ ایک سنگین شہر ہے" لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کے کسی ایک اتنے مختصر سے شہر کی حدود میں اتنی نادر روزگار شخصیتوں نے بھلا کب سانس لی ہو گی جن میں سے ہر ایک اپنے اپنے میدان میں آفتاب و مہتاب تھا۔

کہتے ہیں کہ فلورنس وہ شہر ہے جہاں پانچ سو ساڑھے پانچ سو سال قبل آج کی ترقی اور جدت کا آغاز ہوا تھا اور اس شہر کو یورپ میں تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کا سنگ میل قرار دیا جا سکتا ہے۔ مجسمہ تراش مائیکل اینجلو' ماہر شماریات و فلکیات گلیلو' "ڈیوائن کامیڈی" کا خالق دانتے۔ سیاسیات جدید کا باوا آدم میکاؤلی جس نے "پرنس" جیسی کتاب لکھ کر دنیا بھر میں تہلکہ مچا دیا تھا' پھر مصور لیونارڈو جس نے مونا لیزا جیسا شاہکار مصوری کا نمونہ تخلیق کیا۔ ادب کے میدان میں بھی فلورنس نے بڑے نامور لوگ پیدا کئے۔ کتنے مصوروں' مجسمہ سازوں نے اپنی زندگیوں کے سالہا سال صرف کر کے اس شہر کے گوشے گوشے کو فن کدہ بنا دیا کہ ہر دیکھنے والی آنکھ محو حیرت رہ جاتی ہے یہ پتھروں کا اور پتھر کے مجسموں کا شہر ہے بلکہ صنم کدہ ہے جہاں دیکھئے مجسمے' خود مائیکل اینجلو نے بے شمار بت تراشے جو شہر میں جا بجا استادہ اس کی عظمت کی داستانیں سناتے ہیں۔ بی بی مریم کا مجسمہ...... حضرت عیسیٰ کے مجسمے اور سب سے بڑھ کر ڈیوڈ (حضرت داؤدؑ عیسیٰ) کا مجسمہ یہ مجسمہ سنگ تراش نے ایک بہت بڑے سنگ مرمر کے تودے کو تراش کر تخلیق کیا اور اپنے فن کو انتہا پر پہنچا دیا۔ خدا جانے وہ مذہبی عقیدے اور جذبات کی رو میں آ کر یہ کام کرتا تھا یا محض صوری گری کا شوق تھا۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا اس کی یادگاریں حیرت انگیز ہیں اور انہیں دیکھ کر عقل انسانی حیران رہ جاتی ہے۔ یہ مجسمے محض انسانوں تک ہی محدود نہیں ہیں۔ جانوروں کے مجسموں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے۔

ہم بہت دیر تک مائیکل اینجلو اور فلورنس میں موجود دوسرے مجسموں کی تعریف کرتے رہے اور مختلف ذرائع اور گائیڈ بکس سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں خان صاحب اور بٹ صاحب پر اپنی اہلیت کا سکہ بٹھاتے رہے۔ ایک دو دن تو خان صاحب خاموش رہے پھر ایک روز ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ کہنے لگے "دیکھو بھائی صاحب آپ کی تقریریں ہم نے بہت سن لیں۔ ٹھیک ہے یہ سب بڑے کاریگر لوگ تھے' ہنر مند تھے' فن کار تھے مگر ایسا بھی نہیں کہ دنیا میں ایسا کام کسی اور نے نہیں کیا۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان کاموں کا کسی نے ڈھنڈورا نہیں پیٹا۔"

بٹ صاحب نے پوچھا "اور کس جگہ ایسے مجسمے اور بت ہیں؟"

وہ کہنے لگے "مشکل یہ ہے کہ آپ لوگوں کو اپنی تہذیب' جغرافیے اور کارگزاریوں کا علم ہی نہیں ہے۔ تم نے کبھی ایلورا اور اجنتا کے غاروں کا نام سنا ہے؟"

ظاہر ہے۔ ہم دونوں نے سنا تھا بلکہ ہم نے تو جنوبی ہندوستان میں سالہا سال پہلے جب ابھی شعور نے آنکھ بھی نہیں کھولی تھی تو ان غاروں کا نظارہ بھی کیا تھا' مگر بٹ صاحب کو ہندوستان کی ہر چیز سے چڑ ہے۔ کہنے لگے "یار چھوڑو' وہ تو بہت بے ہودہ اور عریاں مجسمے ہیں۔"

خان صاحب کہنے لگے "اور ان مجسموں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ عورت اور مرد کی برہنگی کا کون سا پہلو ہے جو ان میں پیش نہیں کیا گیا اور وہ بھی بے حد تفصیل سے۔ ایلورا اور اجنتا والوں نے تو دنیا کی نظروں سے الگ تھلگ غاروں اور گپھاؤں میں وہ بت تراشے ہیں مگر ان لوگوں کی بے شرمی دیکھئے کہ کھلے عام' سڑکوں' بازاروں اور چوراہوں میں بھی یہ عریاں مجسمے موجود ہیں۔ بچے' بڑے' جوان بوڑھے سبھی انہیں دیکھتے ہیں اور کسی کو ذرا بھی حیا نہیں آتی۔"

بٹ صاحب کو یاد آ گیا "ہاں ہاں' یہ تو ٹھیک ہے۔ یاد ہے وہاں ان ننگے مجسموں کو وہ عورتیں کتنے غور اور شوق سے دیکھ رہی تھیں؟ ایک بات ہے۔ میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ سیاح عورتیں بھی بہت بے شرم ہوتی ہیں۔"

خان صاحب کا لیکچر ابھی تک جاری تھا۔ کہنے لگے "ان غاروں میں ان گنت انسانوں نے پہاڑوں کو ہتھوڑوں اور چھینیوں سے تراش کر اس قدر حیران کرنے والے مجسمے اور مناظر بنائے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ہزاروں گمنام لوگوں نے اپنی زندگیاں خاک میں ملا دیں مگر آج کوئی ان کا نام و نشان تک نہیں جانتا۔ میں آپ کو بتاؤں۔ یہ یورپ والے پبلسٹی میں بہت ماہر ہیں۔ دنیا میں کتنے لوگوں نے کارنامے کیے ہیں۔ کیسے کیسے شہر' کیسے کیسے کھنڈر اور کیسی کیسی عمارتیں موجود ہیں مگر شہرت ہے تو

صرف یورپ کی چیزوں کی۔ دنیا بھر میں بچہ بچہ ان سے واقف ہے انہوں نے خوب ڈھنڈورا پیٹا ہے اپنا اور تو اور امریکا تک ان سے مار کھا گیا ہے۔ اتنا بڑا اور ترقی یافتہ ملک ہے مگر امریکا کی کون سی چیز مشہور ہے؟ لے دے کے صرف ڈزنی لینڈ۔ ہمارے اپنے ملک میں کیسے کیسے تاریخی مقامات اور عمارتیں موجود ہیں مثلاً تاج محل، شاہی مسجد، قلعہ آگرہ، مگر دنیا میں مشہور صرف وہی ہیں جنہیں یورپ والوں نے شہرت دی ہے۔"

ہم نے فوراً سفید رومال دکھایا اور کہا "ہم آپ کے جذبات کی قدر کرتے ہیں اور آپ سے اتفاق کرتے ہیں" ہم جانتے تھے کہ اگر ہتھیار نہ ڈالے تو خان صاحب موقع بے موقع تقریروں کے ذریعے ہمارا ناطقہ بند کر دیں گے چنانچہ صلح کرنے اور مونچھ نیچی کرنے میں ہی بہتری تھی۔ مگر جب ٹھنڈے دل سے سوچا تو خیال آیا کہ واقعی ان کی بہت سی باتیں درست بھی تھیں۔

فلورنس میں بھی سیاحوں اور گائیڈز کے ہجوم نظر آتے تھے جن کے روم سے شہر کی سنگلاخ خوبصورتی میں زندگی کی حرارت اور گوشت پوست کی رعنائیاں بھی نظر آنے لگتی ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ان شہروں کی خوبصورتی اپنی جگہ لیکن اگر حسینوں کے میلے اور خوبصورت انسانوں کی رونق اور ریل پیل نظر نہ آئے تو شاید ان کا من پھیکا پڑ جائے یا پھر دیکھنے والے کا بہت جلد دل بھر جائے فلورنس تو یوں بھی صاحب جمال شہر ہے جس میں سیاحوں کی وجہ سے جمال کی رعنائیوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ خان صاحب اور بٹ صاحب تو شہر مجسموں، گنبدوں، کلیساؤں اور میوزیم گھروں کے بجائے چلتے پھرتے حسن کے نمونوں کو ہی زیادہ تر دیکھتے رہے اور فائدے میں رہے۔

کہتے ہیں کہ فلورنس کی سیر کا بہترین وقت نومبر کا مہینہ ہوتا ہے جب آسمان انتہائی صاف شفاف اور نیلا ہوتا ہے اور موسم بھی بہت دلفریب ہوتا ہے۔ روم کی بہت سی جگہوں کے نام ہم یاد نہیں رکھ سکے تھے مگر فلورنس میں ہم نے باقاعدگی سے کاغذ اور قلم ہمراہ رکھا اور جس جگہ کا نام سنا فوراً نوٹ کر لیا۔ مثلاً پیازہ' مائیکل اینجلو کہتے ہیں کہ یہاں ٹیرس پر کھڑے ہو کر فلورنس کو دیکھو تو یہ بھورا بھورا سفید اور پتھریلا شہر عجیب و غریب منظر پیش کرتا ہے۔ فلورنس کی ایک خوبی یہ بتائی جاتی ہے کہ گزشتہ پانچ سو سال میں اس میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے۔ وہی گلیاں، بازار، عمارتیں، کلیسا، گنبد، مجسمے اور وہی قدیم انداز کا شہر جس کے عین بیچوں بیچ سے دریائے آرنو بہتا ہے اور اس پر تعمیر شدہ پل بذات خود ایک حسین منظر پیش کرتا ہے۔

اٹلی فلموں کی نسبت سے بھی پہچانا جاتا ہے یہاں کے پس منظر میں بنائی جانے والی فلموں نے ساری دنیا میں خوب دھومیں مچائیں اور ان شہروں کی کشش اور حسن میں مزید اضافہ کر دیا۔ ایک زمانے میں "اے روم ود اے ویو" نامی فلم فلورنس کے پس منظر میں بنائی گئی تھی چنانچہ سیاح وہ عمارت دیکھنے ضرور جاتے تھے جہاں اس فلم کی شوٹنگ ہوئی تھی۔ یہاں پہنچنے کے لئے ایک قدیمی (بلکہ قدیم ترین) آٹو میٹک لفٹ کے ذریعے تین منزل نیچے تک جانا پڑتا ہے۔ یہ لفٹ بقول گائیڈز دنیا کی قدیم ترین لفٹ ہے۔

خان صاحب اور بٹ صاحب نے فوراً اعلان کر دیا کہ اس لفٹ میں سوار ہونا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ ہم نے کہا "سینکڑوں' ہزاروں لوگ ہر روز اسی لفٹ سے نیچے جاتے ہیں مگر آج تک کوئی حادثہ نہیں پیش آیا۔"

وہ بولے "کون جانے ہمارے سوار ہوتے ہی حادثہ پیش آ جائے۔ اصل حادثہ تو صرف ایک ہی بار ہوتا ہے اگر ہماری موجودگی میں یہ حادثہ پیش آ گیا تو کیا ہو گا؟"

دراصل یہ سب تو محض باتیں تھیں۔ وہ باہر بیٹھ کر سیاح خواتین کی رونق دیکھنا چاہتے تھے، پھر یہ فلم ان دونوں میں سے کسی نے نہیں دیکھی تھی۔

خان صاحب نے کہا "اگر ہم نے وہ جگہ دیکھ لی تو پھر فلم بھی دیکھنی پڑے گی۔ اس لئے تم خود ہی جا کر دیکھ آؤ۔ واپس آ کر ہمیں بتا دینا۔"

اس جگہ کا نام کوزی ڈانا ہے۔ یہاں تو برائے نام ہی شوٹنگ ہوئی تھی۔ زیادہ تر شوٹنگ تو فلم ساز نے ہالی ووڈ میں سیٹ لگا کر مکمل کی تھی۔ مگر جب یہ عمارت دیکھی تو اندازہ ہوا کہ فلم ساز نے اصل اور نقل میں کوئی فرق نہیں چھوڑا تھا۔ اس جگہ کی مالک سینورینا مراسکو ہیں۔ ان کی دادی نے ۱۹۰۳ء میں یہ جگہ قائم کی تھی۔ سینورینا مراسکو ۱۹۲۹ء میں یہاں آئی تھیں۔ اس وقت ان کی عمر ۲۶ سال کے لگ بھگ تھی۔ ہم نے ان سے ۱۹۷۰ء میں ملاقات کی تو وہ خود بھی سفید بالوں والی ہو چکی تھیں۔ مگر بے حد اسمارٹ اور باوقار۔ انہوں نے بتایا کہ ان کی دادی بھی اب تک بقید حیات ہیں۔ ہم نے کہا "سینو رینا کیا آپ ان سے ہماری ملاقات کرا سکتی ہیں؟"

وہ مسکرائیں اور سرہلا کر اندر چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد واپس آئیں اور ہمیں اپنے ہمراہ لے کر اندر گئیں۔ ہمارے ساتھ چھ سات اور سیاح خواتین بھی ہو لیں۔ اندر ایک قدیم طرز کے کمرے میں جو پرانے انداز کے فرنیچر سے آراستہ تھا۔ ان کی دادی اماں ایک کرسی پر تشریف فرما تھیں اور ٹیلی ویژن سے شوق فرما رہی تھیں۔ ان کی گود میں ایک کالی بلی بیٹھی ہوئی تھی جسے وہ بہت پیار سے سہلا رہی تھیں۔ بلی نے اجنبیوں کو بڑی کاہلی سے آنکھیں کھول کر دیکھا اور پھر خواب خرگوش میں کھو گئی۔ چند خواتین دادی اماں سے بات چیت کرنے کی بہت مشتاق تھیں مگر سینورینا نے کہا کہ وہ کافی اونچا سنتی ہیں اس لئے بے کار شور و غل ہو گا' ظاہر ہے کہ تقریباً ایک سو چار سال کی عمر میں ان کا زندہ رہنا ہی کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ ان کی پوتی نے ان کے کان کے پاس منہ لے جا کر خاصی بلند آواز میں اطالوی زبان میں کچھ کہا تو بڑی بی نے ٹیلی وژن کے اسکرین سے نظریں ہٹا کر ہم لوگوں کو دیکھا۔ سب سے ہاتھ ملایا اور بہت شفقت آمیز انداز میں مسکرائیں۔ اس کے بعد یہ ملاقات ختم ہو گئی۔

سینورینا مراسکو نے فخریہ بتایا کہ جب جرمن فوجوں نے فلورنس پر قبضہ کر لیا تھا اس وقت بھی وہ اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں گئی تھیں۔ وہ بولیں..... "ہمیں اپنی جان کی پروا نہیں تھی۔ صرف یہ ڈر تھا کہ کہیں جرمن فوجی ہمارے شہر کو نقصان نہ پہنچائیں۔ ایک بار ہم نے سنا کہ جرمن ایک کے سوا دریا کے تمام پل اڑانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ ہم لوگ کلیساؤں اور گرجوں میں جا کر دعائیں مانگتے رہے۔ اگلے دن جرمن اچانک شہر سے رخصت ہو گئے۔ ان کی جگہ نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقہ کے فوجی آ گئے اور ہماری جان میں جان آئی۔"

فلورنس کے لوگ بھی روم والوں سے کچھ کم نہیں۔ وہ بھی انہی کی طرح دلچسپ اور بے تکلف ہیں۔ ریستورانوں میں جاؤ تو ویٹریس مسکرا کر خیر مقدم کرتی ہیں اور مہمانوں کو ہر ممکن آرام پہنچانے کی کوشش کرتی ہیں۔ بڑے چھوٹے ریستورانوں کے علاوہ فلورنس میں "گھریلو ریستوران" بھی کافی تعداد میں ہیں۔ ان میں ایک بڑا سا کمرا ہوتا ہے جس کے ایک کنارے پر بار اور ریستوران ہوتا ہے اور دوسرے پر باورچی خانہ۔ ان ریستورانوں میں عموماً" خاندان کے سبھی افراد کام کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیاں بھی دوڑ دوڑ کر کام کرتے نظر آتے ہیں۔ جو ایک نہایت دلچسپ اور انوکھا منظر ہوتا ہے۔ ان جگہوں پر کھانا بھی نسبتاً" سستا ہوتا ہے۔ کھانے کے معاملے میں شروع میں تو خان صاحب اور بٹ صاحب بہت زیادہ احتیاط کرتے تھے۔ عام طور پر تو انڈا اور ٹوسٹ پر ہی گزارہ کرتے۔ مگر جب اس خوراک سے اکتا گئے تو پھر آملیٹ اور انڈے کا سینڈوچ یا سبزی کا سینڈوچ بھی کھانا شروع کر دیا۔ بٹ صاحب نے کہا بھئی نہ جانے یہ لوگ کس طرح بناتے ہوں گے اس کا علاج خان صاحب نے یہ نکالا کہ کلمہ پڑھ کر پھونکتے اور کھا لیتے۔ ان کا بیان تھا کہ اس طرح ہر چیز حلال ہو جاتی ہے۔

فلورنس بھی اٹلی ہی کا ایک شہر ہے چنانچہ یہاں بھی موٹر کاروں والے اسی قاتلانہ انداز میں کاریں دوڑاتے ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے ایکسیڈنٹ کرنے کی ریہرسل کر رہے ہوں۔ یہ غنیمت ہے کہ شہر میں بہت سی سڑکیں کاروں کی آمدورفت کے لئے ممنوع قرار دے دی گئی ہیں مگر موٹر سائیکلوں اور اسکوٹروں پر کوئی پابندی نہیں ہے اسی طرح بائیسکل پر بھی پابندی نہیں ہے۔ اٹلی کے لوگ بائیسکل بھی کار کے انداز میں ہی چلاتے ہیں اور کیونکہ یہ بے آواز سواری ہے اس لئے عام طور پر پیچھے سے آ کر ایسی ٹکر مارتے ہیں کہ مرد تو مرد خواتین بھی چاروں شانے چت سڑک پر پڑی نظر آتی ہیں۔ کاروں کے ہارنوں کا شور یہاں بھی کم نہیں ہے اور ٹریفک جام ہونے کی صورت میں وہ شور قیامت برپا ہوتا ہے کہ خدا کی پناہ' دیکھئے نا قدیم شہر کا باشندہ ہونا اور اس پر فخر کرنا علیحدہ بات ہے اور اطالوی ہونا بالکل مختلف معاملہ ہے۔ کاریں ہم نے اور ملکوں کے لوگوں کو بھی چلاتے ہوئے دیکھا ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اطالوی بریک لگانے پر یقین ہی نہیں رکھتے اور کار ایسے دوڑاتے ہیں جیسے پر ہجوم سڑک پر نہیں کسی سنسان سمندر میں اپنی کشتی بھگائے لئے جا رہے ہیں۔ اس حساب سے تو یہاں بے شمار حادثے ہونے لازمی ہیں مگر حادثے حیرت انگیز حد تک کم ہوتے ہیں۔ جب ہم نے اس کا سبب ایک اطالوی خاتون سے پوچھا تو وہ بولیں "آپ نہیں جانتے کہ یہ کتنے مقدس لوگوں کی سرزمین ہے۔ ہمارے سینٹ اور پیشوا ہماری حفاظت کرتے ہیں ورنہ ہم لوگ تو اپنی طرف سے مرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔" اس بات پر ہمیں لاہور والوں کی وہ بات یاد آ گئی کہ ہم تو بہت خرابیاں کرتے ہیں مگر داتا صاحب کی مہربانی سے ہم پر کوئی آنچ نہیں آتی۔ دیکھا آپ نے ہم نے کہا تھا نا

کہ اطالوی مزاج ہم سے بہت نزدیک ہیں۔

تیسرے دن ہم نے محسوس کیا کہ جب ہم تیار ہو کر باہر نکلتے تو خان صاحب عموماً سو رہے ہوتے یا پھر کہہ دیتے کہ میں نے تو سارا شہر' سارے مجسمے' سارے گرجے باہر سے دیکھ لئے ہیں' اگر آپ کو شوق ہے تو آپ جایئے اور دیکھئے۔

پہلے تو ہم نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی اور پھر انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ اگلے دن بٹ صاحب نے ہمیں اطلاع دی کہ خان صاحب پر بھی ماحول کا اثر ہو گیا ہے اور وہ اومان فرما رہے ہیں۔

"کس سے؟" ہم نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہوٹل کی مالکہ سے" انہوں نے بتایا۔

ہم یہ بتانا بھول ہی گئے کہ ہمارا ہوٹل پندرہ بیس کمروں پر مشتمل مختصر سا تھا اور اس کی مالکہ ایک پختہ عمر کی اطالوی خاتون تھیں۔ ہمیشہ بہت بنی سنوری رہا کرتی تھیں اور صورت شکل اور جسم بھی خاصا دلکش تھا۔ انہوں نے پہلے ہی دن ہمیں اپنی کتھا سنا دی تھی اور بتا دیا تھا کہ ان کے شوہر جو کشتی رانی کے بہت شوقین تھے ایک دن کشتی لے کر سمندر میں گئے تو دس بارہ سال گزرنے کے باوجود واپس نہیں لوٹے۔ انہوں نے بہت تلاش کرایا' اخباروں اور ٹی وی میں اشتہار دیئے مگر "سینور" کا کوئی پتا نہیں چلا۔ اب وہ اپنی سولہ سترہ سالہ بیٹی کے ساتھ یہ ہوٹل چلاتی ہیں اور بہت نیک اور پارسا زندگی گزار رہی ہیں۔ گزشتہ دس بارہ سال میں ان کے صرف چھ سات اسکینڈلز ہی بنے ہیں اور وہ بھی ان کی حاسد سہیلیوں نے مشہور کر دیئے ورنہ وہ خاصی محتاط تھیں اور انہوں نے اپنی تنہا زندگی کے چند لمحے ہنسی خوشی گزارنے کے خیال سے مختصر سے رومانس کئے تھے ورنہ وہ ابھی تک بدستور اپنے شوہر سے وفادار تھیں۔

پھر وہ بولیں "سینور! آپ ہی بتایئے میری جیسی خوبصورت' تنہا عورت اگر کبھی کبھی کسی معقول مرد سے دوستی کر لے تو اس میں دنیا والوں کو جلنے کی کیا ضرورت ہے۔؟ آپ یہ دیکھئے کہ میں نے آج تک اپنے شوہر کو نہیں بھلایا ہے اور نہ ہی دوسری شادی کرنے کا ارادہ کیا ہے۔"

بعد میں ہمیں ہوٹل کے اطالوی چوکیدار نے بتایا کہ اس وفاداری کا ایک سبب یہ تھا کہ اطالوی اور کیتھولک رسم و رواج کے مطابق جب تک ان کے شوہر کی وفات کی تصدیق نہ ہو جائے وہ باقاعدہ دوسری شادی نہیں کر سکتی تھیں۔ دوسرے یہ کہ ہوٹل وغیرہ بدستور ان کے شوہر کے نام تھا اور وہ اگر دوسری شادی کر لیں تو انہیں یہ ساری جائداد اپنے شوہر کے رشتے داروں کے حوالے کرنی پڑے گی۔ بہرحال بقول خود وہ خاتون بے حد پارسائی کی زندگی گزار رہی تھیں۔

کہنے لگیں "دیکھئے سینور! میری بیٹی میرے سامنے اپنے دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے جاتی ہے اس کے باوجود میں پتھر کی سل سینے پر رکھے بیٹھی ہوں۔"

بٹ صاحب نے ہم سے کہا "ان کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔"

ہم نے ان کا نام دریافت کیا۔ جواب میں انہوں نے بہت لمبا چوڑا اطالوی نام بمع شوہر کے نام اور القاب وغیرہ کے بتایا جسے یاد رکھنے اور سمجھنے کے لئے کسی کمپیوٹر کا دماغ درکار تھا۔ پھر وہ سادگی سے بولیں "آپ مجھے مریم کہہ سکتے ہیں یا میری کہہ دیجئے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

اگلے دن ناشتے کے بعد خان صاحب نے اس پارسا خاتون کے بارے میں بہت بلند و نیک خیالات کا اظہار کیا اور فرمایا کہ دیکھئے یورپ میں بھی ایسی نیک اور پاک دامن بیبیاں ہوتی ہیں۔ اس روز وہ ہمارے ساتھ جانے سے انکاری ہو گئے۔

اگلے دن بھی بہانہ بازی کرنے لگے۔ جس کے بعد بٹ صاحب نے یہ کھوج لگائی کہ دراصل وہ مریم سے پیار کی پینگیں بڑھا رہے ہیں۔ بٹ صاحب کو اعتراض پیار کی پینگوں پر نہیں تھا انہیں اعتراض یہ تھا کہ اپنے سے بڑی عمر کی خاتون کے ساتھ محبت کا ناٹک رچاتے ہوئے خان صاحب کو شرم آنی چاہئے تھی۔

ہم نے کہا "چھوڑیئے بٹ صاحب! عشق ان چیزوں سے بالا تر ہوتا ہے اور پھر اگر خان صاحب نے کوئی دلچسپی تلاش کر لی ہے تو یہ خوشی کی بات ہے۔ ذرا یہ سوچئے کہ اگر یہ معاملہ آگے بڑھ گیا تو وہ ہوٹل کے مالک ہو جائیں گے اور ہم جب بھی فلورنس آئیں گے ہمارا قیام و طعام مفت ہو گا۔ اب اگر وہ صاحب آزادی سے عشق کریں تو اس قسم کا کوئی امکان موجود نہیں ہے۔"

بٹ صاحب اس دلیل کی معقولیت سے بہت متاثر ہوئے بلکہ شاید دل ہی دل میں

پچھتائے بھی ہوں گے کہ ایسا نادر موقع انہوں نے کیوں گنوا دیا۔ صاحب زادی شکل و صورت میں خاصی سے زیادہ تھیں، مگر ہوٹل کی ملکیت سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا اس لئے "یہ گناہ بے لذت" بٹ صاحب کو بھی پسند نہ تھا۔

اب ہوا یہ کہ میں اور بٹ صاحب تو فلورنس کی خاک چھانتے پھرتے اور خان صاحب اپنی انگریزی اور اپنے مالی حالات کو بہتر بنانے کی کوششوں میں مصروف رہتے۔ ایک دن تو وہ کچھ شرمائے شرمائے سے رہے مگر پھر بقول بٹ صاحب ان کے دیدے کا پانی مرگیا اور انہوں نے ہمیں اپنے مدارج عشق سے آگاہ کرنا شروع کر دیا۔ وہ اچانک بہت خوش لباس ہو گئے تھے۔ شام کو ہم آئے تو سوٹیڈ بوٹیڈ بیٹھے ہوئے تھے اور بہت اچھی خوشبو لگا رکھی تھی۔ ہم نے پوچھا "یہ خوشبو کب سے لگانی شروع کر دی؟"

بولے "آپ کو کیا بتاؤں دراصل خوشبو میری کمزوری ہے"

بٹ صاحب نے پوچھا "آپ کی یہ کمزوری پہلے تو ظاہر نہیں ہوئی تھی۔"

کہنے لگے "مناسب موقعے کے انتظار میں تھی۔ دراصل یہ خوشبو مجھے مریم نے تحفتاً" دی ہے۔"

بٹ صاحب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ہمیں دیکھا اور پوچھا "آپ نے تحفے میں کیا دیا ہے؟"

بولے "ابھی میں سوچ رہا ہوں"

اس رات کھانے پر ہم چھوٹے سے ہال میں گئے تو دیکھا کہ سینورینا مریم بھی تیرو تفنگ سے لیس تھیں اور بذات خود ہماری میز پر کھانا لا کر رکھ رہی تھیں۔ بعد میں انہوں نے اپنے دست حنائی سے ہمیں کافی بنا کر پلائی۔ بٹ صاحب کہنے لگے "لگتا ہے بھابی اب ہم سے بل وصول نہیں کرے گی۔"

ہم نے کہا "میاں صاحبزادے! یہ بھابی اٹلی والی ہے۔ یہاں حساب یہ ہے کہ حساب جو جو بخشش سو سو۔ محبت اپنی جگہ ہے اور کاروبار اپنی جگہ۔"

مریم انگریزی میں خان صاحب سے بھی گئی گزری تھی۔ اس لئے دونوں کا بہت اچھی طرح گزارہ ہو رہا تھا۔ ویسے بھی عشق کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ یہ بے زبان تو ہفت زبان ہوتا ہے خان صاحب نے بتایا کہ مریم نے انہیں اپنے گمشدہ شوہر کی تصویریں دکھائی ہیں اور خطوط بھی پڑھائے ہیں۔ ہم نے پوچھا

"خطوط کس زبان میں تھے؟"

بولے "اطالوی میں"

ہم نے کہا "آپ نے کیوں کر پڑھ لئے؟"

بولے "یار اس کے خلوص پر غور کرو۔ اس نے تو بہرحال پڑھا دیئے۔ میری سمجھ میں نہیں آئے یہ اور بات ہے؟"

پھر بتایا کہ اٹلی کے لوگ خاصے روایت پسند ہیں اور یورپ والوں کی طرح انگلی پکڑتے ہی پہنچا نہیں پکڑتے۔ پہلے بڑے رسان سے کورٹ شپ کرتے ہیں ایک دوسرے کو سمجھتے اور پسند کرتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرے مراحل کی باری آتی ہے۔"

بٹ صاحب ہنسنے لگے اور بولے "بھابی نے ایک ہی دن میں خان صاحب کو اپنے ملک کے رسم و رواج بھی سمجھا دیئے۔"

ہم نے کہا "یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ ایسے فیصلے جو سوچ سمجھ کر کئے جاتے ہیں ہمیشہ پائیدار ہوتے ہیں۔"

خان صاحب گہری سوچ میں تھے پھر اچانک کہنے لگے "یار وہ کیا شعر ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ آئینہ دیکھنے کے بعد میرا محبوب اور چھوٹا ہو جاتا ہے۔"

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ بھلا وہ کون سا جادو کا آئینہ ہے جسے دیکھتے ہی محبوب کی عمر یا قدوقامت چھوٹی ہو جاتی ہے؟ کافی دیر سوچا پھر آخر کھوج لگا ہی لیا۔ دراصل خان صاحب کا اشارا اس شعر کی طرف تھا:

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

انہوں نے شعر سنتے ہی تصدیق کر دی کہ انہیں اس شعر کی تلاش تھی۔ پھر بولے "میں یہ شعر مریم کو سنانا چاہتا ہوں۔"

بٹ صاحب بولے "اس کے پلے کیا پڑے گا؟"

کہنے لگے "بھئی انگریزی میں ترجمہ کر کے سناؤں گا۔ وہ بھی مجھے اطالوی کے شعر سناتی رہتی ہے۔"

خدا جانے انہوں نے کیا ترجمہ کیا اور کیا شعر سنایا مگر اگلے دن بتایا کہ اسے یہ شعر اتنا پسند آیا کہ شرم سے لال ہو گئی۔ بٹ صاحب بولے "غصے سے لال ہو گئی ہو گی۔"

خان صاحب کا دل عشق میں اتنا گداز ہو چکا تھا کہ اس قسم کی باتوں کو اہمیت ہی نہیں دیتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اگلے روز وہ دونوں وزٹ پر جا رہے ہیں ہم نے ان کے لئے دعائے خیر کی اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ ہم نے بٹ صاحب سے کہا کہ آپ نے سارے شہر میں جگہ جگہ مائیکل اینجلو کے مکمل اور نامکمل مجسمے اور تراشے ہوئے بت دیکھے ہیں۔ آج ہم لوگ مائیکل اینجلو کا مکان دیکھنے کے لئے چلتے ہیں۔ بٹ صاحب کو مائیکل اینجلو یا اس کے گھر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر وقت گزاری بھی کرنی تھی اس لئے وہ خاموشی سے ساتھ ہو لئے۔ فلورنس میں ایک خاص بات یہ ہے کہ سارا شہر اپنے نامور فرزندوں کے نام سے واقف ہے۔ شہر کی کسی گلی میں آپ مائیکل اینجلو یا دانتے یا لیونارڈ کا پتا پوچھ لیجئے، جواب میں یہ کوئی نہیں پوچھے گا کہ وہ کون صاحب ہیں اور کیا کرتے ہیں؟ یا مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ یہ سارا شہر اپنے عظیم فن کاروں پر فخر کرتا ہے اور انہیں ان کے پیار کے ناموں سے پکارتا ہے۔ مائیکل اینجلو کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ ایک پرانی طرز کا مکان ہے۔ دروازے کے سامنے مائیکل اینجلو کا ایک مجسمہ لگا ہوا ہے۔ ظاہر ہے یہ کسی اور سنگ تراش نے مائیکل اینجلو کے مرنے کے بعد بنایا ہو گا۔ دانتے کا گھر بھی ایک گلی میں تھا اور پتھر کا بنا ہوا تھا۔

اٹلی والوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ہر چیز کا ایک نام رکھا ہوا ہے۔ مثلاً دریائے آرنو پر جو سات پل بنے ہوئے ہیں ان میں سے ہر ایک کا نام ہے۔ ایک پل کا نام "پونتے ویکیو" ہے۔ اس کے آس پاس قیمتی جواہرات اور سناروں کی دکانیں ہیں پونتے ویکیو رات کے وقت بہت خوشنما منظر پیش کرتا ہے۔ جب دکانوں کا عکس دریا کے پانی میں نظر آتا ہے تو راہ گیر ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دنیا کے اکثر شہروں میں ہم نے دیکھا ہے کہ بہتے دریا ہیں یا جھیلیں ہیں اور اہل شہر نے ان دریاؤں، نہروں اور جھیلوں کو خوبصورت تفریح گاہوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ ہم لاہور والے آج تک اپنی خوبصورت نہر کے بارے میں کوئی ڈھنگ کا فیصلہ نہیں کر سکے ہیں اور دریائے راوی کو تو ہم نے خیر اس کے حال پر ہی چھوڑ دیا ہے۔

فلورنس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ رات کے وقت یہ بے رونق ہو جاتا ہے۔ یہ تو سچ ہے کہ دوسرے شہروں کی مانند یہاں چہل پہل، روشنی اور رونق نہیں ہوتی مگر پھر بھی ہماری دلچسپی کا بہت سامان وہاں نظر آیا۔ بے فکر جوڑے گلے میں بانہیں ڈالے بیٹھے ہوئے تھے۔ ریستورانوں اور کافی ہاؤسوں میں خوب رونق تھی۔ زیادہ تر رونق ہم جیسے سیاحوں کے دم قدم سے ہوتی ہے۔ رات کا کھانا کھانے کے لئے ہم ایک ریستوران میں گئے تو پہلی بار پنیرا کھانے کا اتفاق ہوا۔ دراصل اس کی شکل ہمیں اچھی نہیں لگی تھی۔ عجیب لیس دار سی چیز تھی اس لئے کھانے کو جی نہیں چاہا۔ فلورنس میں ہم نے پہلی بار پنیرا کھایا اور بالکل اچھا نہیں لگا حالانکہ بعد میں امریکا میں تو یہ پنیرا ہماری کمزوری بن گیا تھا۔ پنیرا بنیادی طور پر یونانی ہے مگر بعد میں اٹلی والوں نے اسے اپنا لیا۔ پھر امریکا والوں نے اسے اپنا "قومی کھانا" بنا لیا۔

کھانے کے بعد ہم نے بٹ صاحب سے فرمائش کی کہ چلو آج اس شہر کے پلازے اور پیازے وغیرہ دیکھتے ہیں۔ پلازہ سائنوریا ایک خاصا بڑا چوک ہے اور یہاں روشنیاں بھی کافی تعداد میں تھیں۔ کبوتروں کی یہاں بھی بہتات تھی جہاں لڑکیاں انہیں دانہ کھلانے اور ان سے چہلیں کرنے میں مصروف تھیں فلورنس میں ایک "باب جنت" بھی ہے۔ اس کے ساتھ کوئی مقدس کہانی وابستہ نہیں ہے۔ صرف اتنا ہے کہ یہ بے حد خوبصورت منقش دروازہ ہے۔ فلورنس میں بھی فوارے موجود ہیں مگر روم کے فواروں کے مانند زیادہ مشہور نہیں ہیں۔ ڈومو گرجا بھی یہاں کی ایک مشہور معروف اور قابل دید عمارت ہے اس کلیسا کے آس پاس بہت سی قبریں ہیں۔ ایک قبرستان کہہ لیجئے۔ کہتے ہیں کہ مائیکل اینجلو، دانتے اور میکاؤلی کی قبریں بھی اسی قبرستان میں ہیں۔ پھر "پلازہ ویکیو" گئے یہاں دستکاریوں کا سامان فروخت ہوتا ہے اور بہت سے مرد سیاح صرف خوبصورت، صحت مند اور شوخ و بے باک سیلز گرلز سے گپ شپ لگانے کی خاطر وہاں کے پھیرے لگاتے ہیں اور ان سے مہنگے داموں چیزیں خرید کر لے آتے ہیں۔ یہاں ہر پلازہ اور پیازہ میں بے شمار مختلف اقسام کے چھوٹے بڑے انسانوں اور جانوروں کے مجسمے بھی ہوتے ہیں۔ مجسموں کی اس قدر کثرت بھی بعض اوقات بار گزرنے لگتی تھی۔ بٹ صاحب بہت تنگ آ چکے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ہمیں اس شہر سے رخصت ہونا چاہئے ورنہ ہم سب بت پرست

ہو جائیں گے۔

"پلازہ میڈونا" پر بھی خوب رونق تھی۔ اطالوی لڑکے سیاح خواتین کو دیکھ کر سیٹیاں بجا رہے تھے اور آوازیں کس رہے تھے اور وہ خوش ہو ہو کر ان کی طرف بوسے اچھال رہی تھیں۔ بٹ صاحب اٹلی میں سیاح خواتین کی بے حیائی سے بہت نالاں تھے اور بار بار کہتے تھے کہ یہ مادر پدر آزاد عورتیں دوسروں کے اخلاق تباہ کرنے ان ملکوں میں کیوں آ جاتی ہیں۔ ہم نے انہیں تسلی دی اور بتایا کہ ان عورتوں کے آنے سے پہلے ہی ان لوگوں کے اخلاق کافی خراب ہو چکے ہیں۔ ایک کاؤنٹر نما کھوکھے پر بٹ صاحب نے کھڑے ہو کر کافی کا آرڈر دیا۔ وہاں اور بھی سیاحوں کا مجمع تھا۔ دراصل جب اس پتھر کے شہر میں چلتے چلتے لوگ تھک جاتے ہیں اور پیاس محسوس کرتے ہیں تو بیئر وغیرہ پینے کے لئے ایسی جگہوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ شاید میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ جس مقام پر مائیکل اینجلو کا بنایا ہوا "ڈیوڈ کا مجسمہ" استادہ ہے اس جگہ کا نام "پلازہ سینورا" ہے' کہتے ہیں کہ اس نے یہاں سے کافی دور پر یہ مجسمہ تراشا تھا جس پر اس کی زندگی کے ساٹھ قیمتی سال صرف ہوئے تھے۔ بعد میں اس دیو قامت مجسمے کو رسیوں کی مدد سے کھینچ کر اس پلازہ میں لایا گیا۔ فلورنس میں مائیکل اینجلو کے نامکمل مجسمے بھی بڑی حفاظت کے ساتھ رکھے گئے ہیں۔

"پلازہ سینورا" میں دوسرے مجسموں کی بھی کمی نہیں ہے۔ اس شہر کا بچہ بچہ شہر کے نامور لوگوں کی کہانیوں اور ان کی تاریخ سے واقف ہے۔ کسی ریستوران میں جائیں تو ویٹر یا ویٹریس آپ کو مختلف شخصیتوں سے منسوب قصے کہانیاں سنانا شروع کر دیتے ہیں خدا جانے ان میں جھوٹ کتنا ہوتا ہے اور سچ کتنا؟ دریائے آرنو کے کنارے لوگ مچھلیاں بھی پکڑتے ہیں۔ مگر عام طور پر یہ جگہ کو اسپاٹ کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ اس شہر کے باسی بہت رومانی مزاج اور فن کارانہ طبیعت کے مالک ہیں۔ باہر سے آنے والے اس سے بھی منچلے ہوتے ہیں۔ پادریوں کی بھی یہاں کمی نہیں ہے۔ جو کلیساؤں میں ڈبے بجا بجا کر سیاحوں کو چندہ دینے کی ترغیب دیتے رہتے ہیں۔ گاہے گاہے سر سے پیر تک سیاہ لباس میں لپٹی ہوئی راہبائیں بھی نظر آ جاتی ہیں جو اپنے اردگرد کے گناہ افزا مناظر سے بچنے کے لئے اپنی نگاہیں بالکل سامنے رکھتی ہیں اور کوشش کرتی ہیں کہ کسی

اور جانب نہ دیکھیں۔ اس کوشش میں وہ کبھی کبھی حادثوں کا شکار بھی ہو جاتی ہیں۔ بٹ صاحب بار بار پوچھ رہے تھے کہ یہاں کوئی نائٹ کلب نہیں ہے۔ ہم انہیں کیا جواب دیتے۔ فلورنس جیسے شہر میں چند روزہ قیام کے دوران میں اگر سیاح نائٹ کلب اور تھیٹر دیکھنے کی برملا خواہش ظاہر کرے تو اس بدذوق' بدتہذیب اور خدا جانے کیا کیا کہا جاتا ہے اور ہم یہ الفاظ سننے کے روادار نہیں تھے۔

شام کو بلکہ جھٹپٹے کے وقت ہم ہوٹل واپس پہنچے تو دیکھا کہ خان صاحب اپنے کمرے میں موجود ہیں۔ ان کی قتالۂ عالم محبوبہ استقبالیہ پر موجود تھی۔ ہمیں دیکھا تو بہت پراسرار اور رازدارانہ انداز میں مسکرائی اور سر جھکا لیا۔ بٹ صاحب کہنے لگے "لیجئے جناب' لگتا ہے شادی کی بات چیت پکی ہو گئی۔ اب آپ قاضی صاحب اور چھواروں کا بندوبست کرلیں۔"

خان صاحب کے کمرے میں پہنچے اور دروازے پر دستک دی ان کی آواز آئی "کون ہے؟ آ جاؤ" ہم اندر داخل ہوئے تو وہ محراب نما کھڑکی کی جانب رخ کئے بیٹھے تھے اور باہر جھانک رہے تھے۔ ہماری آمد کے بعد کوئی لفٹ نہیں دی۔ بٹ صاحب کو یہ حرکت بہت ناگوار گزری۔ کہنے لگے "خان صاحب معاف کرنا' ہم ہوٹل میں رہنے کے لئے آپ کے محتاج نہیں ہیں۔ ہم خود بھی اپنے خرچ پر ہوٹل میں رہ سکتے ہیں۔ آپ اتنا غرور نہ کیجئے۔"

یہ کہہ کر پلٹ کر جانے لگے۔ خان صاحب نے تیزی سے اچانک پلٹ کر دیکھا اور بٹ صاحب کو پکارا۔ اب جو ہم نے غور سے دیکھا تو ان کی ایک آنکھ سیاہ ہو رہی تھی۔ رخسار پر بھی چوٹوں کے نشانات تھے۔ ہم نے گھبرا کر پوچھا "خان صاحب کیا بات ہے؟ کیا سیڑھیوں سے گر گئے؟" وہ کچھ دیر چپ رہے' پھر یہ راز فاش کیا کہ جب وہ باغ میں گئے تو وہاں مریم کے دو سابق عاشق مل گئے جنہوں نے ان کی خوب مرمت کی' پھر بولے

"دیکھئے بھائی جان! میں تو اس ہوٹل میں ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتا یا تو اس شہر سے چلئے یا پھر صبح تک یہ ہوٹل چھوڑ دیجئے۔"

ہم نے کہا "مگر بھائی اس قدر ناراض کیوں ہوتے ہو اس میں مریم کا کیا قصور ہے؟"

انہوں نے کہا "جس وقت وہ دونوں مسٹنڈے میری مرمت کر رہے تھے مریم

خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ بعد میں جب میں نے شکایت کی تو بولی "دیکھئے سینور خان! آخر وہ بھی میرے سابق چاہنے والے ہیں۔ میں آپ کی خاطر ان سے کیسے بگاڑ لوں گی جب کہ آپ کے یہاں رہنے کا امکان بھی بہت کم ہے۔ ان سے تو پھر بھی واسطہ پڑ سکتا ہے۔ کس قدر ہرجائی اور فضول قسم کی عورت ہے یہ مریم۔"

انہوں نے اس شان میں لمبے لمبے قصیدے پڑھنے شروع کر دیئے۔ بٹ صاحب زیر لب مسکراتے رہے، پھر بولے "ہماری قسمت میں اٹلی والی بھابی کی لکیر ہی نہیں ہے تو خان صاحب کا کام کیسے بن جاتا؟"

دوسرے دن ہم نے ناشتے کے بعد رخت سفر باندھا۔ خان صاحب تو اس ہوٹل میں ناشتا کرنے کے بھی روادار نہ تھے مگر ہم دونوں کا بھوک کے مارے برا حال تھا۔ ناشتے کے بعد کافی لے کر وہ خاتون خود ہی چلی آئیں اور بڑی معصومیت سے خان صاحب سے ان کی خیریت پوچھتی رہیں پھر بولیں کہ آپ دل چھوٹا نہ کریں یہاں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ تھوڑے دن بعد تم بھی ان کی مرمت کر دینا۔ اگر کہو تو دو چار لفنگوں اور بدمعاشوں کی خدمات حاصل کر لوں؟ خان صاحب خاموش رہے۔ بس خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ واپسی پر کہنے لگے "دیکھا آپ نے، کیسی پتھر دل عورت ہے اور کیوں نہ ہو، کم بخت رات دن پتھروں کے درمیان ہی تو رہتی ہے۔"

ان کا یہ حسب حال تبصرہ واقعی لطف دے گیا۔ ہماری اگلی منزل وینس تھی جسے اطالوی زبان میں "وی نیزیا" کہتے ہیں۔

اٹلی کی جو بے شمار چیزیں ساری دنیا میں مشہور ہیں ان میں وینس سرفہرست ہے۔ اٹلی عجیب و غریب ملک ہے۔ اس لحاظ سے کہ کوئی شہر کھنڈروں کے لئے مشہور ہے، کوئی پتھروں کے لئے اور کوئی نہروں کے لئے۔ وینس سمندر کے کنارے واقع ہے بلکہ ایک اعتبار سے سمندر کے اندر بھی واقع ہے۔ وہ اس طرح کہ جب سمندر میں جوار بھاٹا نہ ہو تو اس شہر کے بہت سے چوک اور گلیاں خشک نظر آتی ہیں مگر جب سمندر کا پانی چڑھتا ہے تو دیکھتے ہی دیکھتے، "آنا" فانا" ڈیڑھ دو فٹ پانی ہر طرف پھیل جاتا ہے۔ ایسے میں بہت انوکھا اور خوبصورت منظر دیکھنے میں آتا ہے۔ سیاح، خوبصورت سیاح خواتین، مقامی دکاندار اور مختلف سائز اور قدو قامت کی حسین لڑکیاں اپنی جینز اور اسکرٹ سنبھال کر بھاگتی نظر آتی ہیں۔ سڑکوں کے کنارے ریستورانوں کی میزیں اور کرسیاں جلدی جلدی سمیٹ کر اندر پہنچا دی جاتی ہیں اور لمحہ بھر کے اندر یہ سارا شہر گھٹنے گھٹنے پانی میں ڈوب جاتا ہے مگر وینس کے لوگ پانی سے نہیں ڈرتے۔ وہ تو اس سے پیار کرتے ہیں کہ یہی تو ان کی وجہ شہرت، سرمایہ افتخار اور روٹی روزی کا ذریعہ ہے۔ وینس میں جانے کے لئے سمندر کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے۔ ساحل سے اسٹیمر، کشتی یا اسی قسم کی آبی سواریوں میں بیٹھ کر سیاح وینس جاتے ہیں اور پھر وہیں کے ہو رہتے ہیں۔

خان صاحب نے جب وینس پر پہلی نظر ڈالی تو بولے "یہ کون سی عجیب بات ہے۔ ہمارے ملک میں تو زیادہ بارش اور سیلاب کے زمانے میں جگہ جگہ وینس کا نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے۔" مگر یہ ان کی بدذوقی کی انتہا تھی۔ کہاں وینس اور کہاں مثال کے طور پر ڈیڑھ دو فٹ گندے پانی میں ڈوبا ہوا وہ لاہور کا لکشمی چوک یا مزنگ چونگی وغیرہ۔ وینس، وینس ہے۔ اس کا مقابلہ کوئی اور شہر کرے، یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ جب سمندر سے مختلف راستوں کے ذریعے پانی وینس میں داخل ہوتا ہے تو پھر یہ شہر عجیب دیکھنے سے تعلق رکھتا

ہے۔ خصوصاً" رات کے وقت۔ پانی کے داخلے کا سب سے بڑا ذریعہ "گرینڈ کینال ہے"
اس گرینڈ کینال میں آگے جا کر تقریباً چالیس پچاس دوسری نہریں بھی مل جاتی ہیں اور
سڑکوں کے مانند آبی راستوں کے دوراہے' سہ راہے اور چوراہے بن جاتے ہیں۔ ان
نہروں میں گنڈولوں کی آمدورفت شب و روز جاری رہتی ہے۔ "یہ گنڈولا" اسی طرح ہے
جیسے کشمیر کی ڈل جھیل میں شکارا۔ گنڈولا عموماً" اخروٹ کی لکڑی کا بنا ہوا ہوتا ہے اور اسے
شہر کی سڑکوں پر چلنے والی ٹیکسیوں کی طرح یک رنگ کر دیا جاتا ہے جو عموماً" سیاہ ہوتا ہے۔
"گنڈولے" والوں نے بھی ٹیکسی ڈرائیوروں کی طرح اپنی یونیفارم مقرر کر لی ہے۔
جو بہت اسمارٹ اور خوبصورت ہوتے ہیں۔ ایک تو اٹلی کے وجیہ و خوش شکل مرد' اس پر
سیاہ پتلون اور سفید اور کالی دھاریوں والی قمیص ٹائی شرٹ' پھر جب یہ حضرات اپنے
گنڈولے چلانے یا بھگانے کے لئے تیزی سے چپو چلاتے ہیں تو بڑی رومانی قسم کی آواز
پیدا ہوتی ہے بلکہ ایک ہلکا سا شور ہی سمجھ لیجئے' پھر جب آپ آرام سے گنڈولا میں دراز
یا نیم دراز ہو کر خوابیدہ نگاہوں سے وینس کا نظارہ کرتے ہیں تو واقعی ایک خواب کا سا عالم
طاری ہو جاتا ہے۔ "گرینڈ کینال" ایک طویل سڑک کے مانند ہے اور بل کھاتی' لہراتی'
مختلف نہری چوراہوں وغیرہ سے بچ بچا کر یا ان کے عین درمیان سے گزرتی ہوئی دو ڈھائی
میل تک چلی جاتی ہے۔ ان کے کنارے سینکڑوں خوبصورت عمارتیں اور محل وغیرہ بنے
ہوئے ہیں' جن میں رہائش بھی ہے' ہوٹل' دفاتر اور کاروباری مقاصد کے لئے بھی
استعمال کی جاتی ہیں۔ یہ بے حد خوبصورت اور خوشنما عمارتیں ہیں۔ جن کی نظیر میں نے
کسی اور شہر میں نہیں دیکھی۔ کہتے ہیں کہ وینس کا موجودہ شہر کسی زیر زبر کی تبدیلی کے بغیر
گذشتہ پانچ ساڑھے پانچ سو سال سے سطح زمین اور سطح سمندر پر موجود ہے۔ وینس کے
بارے میں زیادہ تر داستانیں یا من گھڑت جھوٹی سچی کہانیاں سنانے کا فرض عموماً" گنڈولے
والے سرانجام دیتے ہیں۔ گائیڈ یہاں بھی ہوتے ہیں کہ یہ عہد جدید کی ایک ایسی ایجاد
ہے جس سے کوئی مہذب اور سیاحوں کی بھرمار والا ملک محفوظ نہیں ہے' مگر وینس کے
"گنڈولا بان" ہی عام طور پر گائیڈ کے فرائض بھی نبھاتے رہتے ہیں اور دیکھا جائے تو اس
میں ان کا نقصان بھی کیا ہے۔ سیاح ان کہانیوں سے متاثر ہو کر اکثر انہیں بخشش وغیرہ بھی
دے دیا کرتا ہے اور پھر یہ غیر ملکی سیاح حسیناؤں سے ملاقات اور میل جول بڑھانے کا
بھی بہترین ذریعہ ہے۔ اطالوی مردوں کا واقعی جواب نہیں ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی ایک ہی
مخلوق ہے۔ قدرت نے انہیں حسن و جمال بھی عطا کیا ہے' زبان کی شیرینی اور لچھے دار
انداز بیان بھی' پھر جھوٹ بولنے میں انہیں جو کمال حاصل ہے وہ بہت کم قوموں کے
مردوں کے حصے میں آیا ہو گا۔ حسن کی تعریف اور خواتین کی توصیف اتنی زیادہ کرتے ہیں
کہ خوشامد کے زمرے میں آ جاتی ہے۔ پھر بے باک' بے شرم اور ڈھیٹ بھی بلا کے
ہوتے ہیں۔ ان پر تو وہی مثال صادق آتی ہے کہ آم کے آم' گٹھلیوں کے دام۔ سیاح
عورتوں سے پیسے بھی وصول کرتے ہیں اور اکثر و بیشتر ان کی رفاقت حاصل کرنے میں بھی
کامیاب ہو جاتے ہیں۔

ہم تینوں یعنی میں خان صاحب اور بٹ صاحب بھی اسٹیمر پر سوار ہو کر وینس میں
داخل ہوئے۔ اسٹیمر کی تیز رفتاری کے باعث جب نہر کا پانی آس پاس کی عمارتوں سے
ٹکراتا ہے تو عجیب سماں اور صوتی اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ اس منظر اور اس ماحول کا
جواب وینس کے سوا اور کہاں؟

پھر ہماری بسوں' تانگوں اور ریڑھے والوں کے مانند گنڈولے والے بھی آپس میں
خوب ریس لگاتے ہیں مگر عموماً" ایسے خوفناک حادثات سے دو چار نہیں ہوتے جو سڑکوں پر
رونما ہوتے ہیں۔ "گرینڈ کینال" پر جا بجا محراب دار' پرانی وضع کے پل بنے ہوئے ہیں
جن پر سے گزر کر لوگ نہروں کو عبور کرتے ہیں۔ میں شاید آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ
وینس کی ہر چیز' ہر عمارت' مختصر یہ کہ انسانوں کے علاوہ باقی ہر چیز پانچ چھ سو سال پرانی ہے'
مگر آج بھی دلفریب لگتی ہے پلوں کے اوپر حسین جوڑے کھڑے محبت بھری باتوں میں
مصروف نظر آتے ہیں۔ نیچے نہر سے گزرنے والے ان پر آوازے کستے ہیں' ان کی جانب
بوسے اچھالتے ہیں اور گنڈولے والے تو باقاعدہ گانے بھی گاتے ہیں مگر ان باتوں پر کوئی برا
نہیں مناتا۔ اسے آپ زندہ دلی کہ لیجئے یا بے ہودگی' یہ آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔ مگر
جب تک آپ وینس میں رہتے ہیں یہ سارا ماحول اور تمام طلسماتی منظر ایک رومانی کیفیت
پیدا کر دیتا ہے۔ جس کے سحر سے آزاد ہونا آسان نہیں ہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ سارا وینس
ہی پانی پر آباد ہے۔ جی نہیں' خشکی والے علاقے بھی ہیں۔ تنگ پتھریلی گلیاں' چھوٹے
چھوٹے چوک اور "پیازہ" ان تنگ اور لہراتی گلیوں میں پیدل چلنے کا بھی اپنا علیحدہ لطف

ہے کیونکہ یہ دنیا کی جدید ترین ایجادات' یعنی موٹروں' بسوں' ٹرکوں' اسکوٹروں وغیرہ کی لعنت سے مکمل پاک اور آزاد علاقہ ہے۔ یہاں گھومنے میں اتنا مزہ آتا ہے کہ جی چاہتا ہے انہی پراسرار گلیوں میں پیدل چلتے چلتے گم ہو جائیں اور پھر لوٹ کر نہ جائیں۔ مگر یہ محض عارضی خواہشیں ہیں کیونکہ اگر سچ مچ کی جنت بھی ہو تو تھوڑے دن کے بعد لاہور' پیارا لاہور اور اپنا گندا سندا ملک یاد آنے لگتا ہے اور لاہور کی خاک آلود' شور سے بھری ہوئی سڑکیں اور غلاظت سے لتھڑی ہوئی گلیاں دل کو بے چین کر دیتی ہیں۔ ان گلیوں میں (اور نہروں کے گنڈولوں میں بھی) حسیناؤں کا ہجوم رہتا ہے۔ جن میں مقامی اور غیر مقامی دونوں کی بہتات ہے اور پھر ان کے ملبوسات (اگر انہیں تکنیکی طور پر ملبوسات کہا جا سکتا ہے) تو بے حد نرالے اور دلکش ہوتے ہیں۔ لباس پہننا دوسرے لفظوں میں نہ پہننا یا برائے نام پہننا تو بس مغرب کی دوشیزاؤں پر ختم ہے اور اس لحاظ سے اٹلی بھی دول مغرب میں ہی شامل ہے۔ یہ بھی مقام شکر ہے ورنہ اگر یہاں ایسے لباسوں اور ایسے حسینوں کی کثرت نہ ہوتی تو شاید دنیا میں اٹلی اور اس کے مختلف شہروں کی دھوم بھی نہ ہوتی۔ ہم نے تو جب پہلی پہلی بار اٹلی کو دیکھا تو منی اسکرٹ کا فیشن سارے مغرب کو اپنی بانہوں میں لئے ہوئے تھا۔ خیر بعد میں بھی یورپ اور امریکا گئے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ خواتین کی حد تک فیشن خواہ کوئی ہو اس کے نام پر جسمانی حسن و زیبائش کی نمائش ہر لباس میں جاری رہتی ہے۔ پھر خوب تیز فر فر چلتی ہوئی ہوا ان لباسوں کو اپنے جھونکوں کے ساتھ اڑائے اڑائے پھرتی ہے اور ان کے ساتھ ہی یہ چلتے پھرتے حسن کے نمونے مزید حسین اور خوش منظر ہو جاتے ہیں۔ پتا نہیں آپ کو ہم نے بتایا یا نہیں کہ اٹلی کے حسن میں مغرب کی کشش اور مشرق کی جاذبیت یکجا ہو گئی ہے۔ عورتیں گوری ہوتی ہیں مگر ان کی جلد اور رنگت یورپ کی میموں کی طرح پھیکی پھیکی اور بے مزہ نہیں ہوتی۔ اس میں ایک اور ہی بانکپن اور دلکشی ہوتی ہے۔ پھر کھلتے ہوئے گندمی رنگ بھی نظر آتے ہیں جو متناسب نقش و نگار اور کٹیلے جسموں کے حسن میں اور اضافہ کر دیتے ہیں۔

وینس کا چہرہ دن کے وقت کچھ اور ہوتا ہے' ڈھلتے سورج اور شفق کے پس منظر میں اس کا جمال کچھ اور ہوتا ہے اور رات کو جب جگمگاتی ہوئی عمارتوں کی روشنیاں پانی پر اپنا عکس ڈالتی ہیں اور نیم تاریخ نہروں میں ہلکی ہلکی روشنیاں جھلملاتی ہیں تو ایک خواب جیسا سماں طاری ہو جاتا ہے۔ ایسے میں چپوؤں کی آوازیں' اسٹیمروں کے انجن کا شور' گنڈولے والوں کے نغمے اور زندگی سے بھرپور سیاحوں کے گانوں کی آوازیں جادو سا طاری کر دیتی ہیں۔ دیکھئے ہمارا یہ مشورہ اپنے پلے باندھ لیجئے۔ اگر اللہ توفیق دے تو زندگی میں ایک بار وینس کا ایک پھیرا ضرور لگائیے۔

اس نہری شہر میں عجیب عجیب نظارے دیکھنے کو ملتے ہیں گنڈولا پانی میں کشتیوں پر ہی خرید و فروخت ہو رہی ہے۔ گھروں کے باہر گشتی بان دکاندار آوازیں لگا رہے ہیں اور سودا بیچ رہے ہیں۔ پھر پولیس اور مجرم بھی اس ماحول کا ایک حصہ ہیں۔ کبھی کوئی تیز رفتار گنڈولا یا کشتی گزرے اور اس کے پیچھے سائرن بجاتا ہوا دوسرا اسٹیمر ہو تو سمجھ جائیے کہ "پولیسیا" یعنی پولیس مجرموں کے تعاقب میں ہے۔ خیریت ہے کہ گولیاں وغیرہ نہیں چلتیں۔ غالباً" سیاحوں کے احترام میں' ورنہ ذرا غور فرمائیے کہ کیا عالم ہوتا۔ بے چارے سیاح اور شہری اس "پولیس مقابلے" سے بچنے کے لئے پانی میں کودتے اور غوطے کھاتے نظر آتے۔ ان نہروں کے کنارے ہر طرح کی ضرورت کا سامان موجود ہوتا ہے۔ سینما گھر' تھیٹر' ریستوران' نائٹ کلب' مختصر یہ کہ سیاحوں اور انسانوں کو جن چیزوں کی ضرورت محسوس ہو سکتی ہے وہ بس اس نہری شہر میں دستیاب ہو جاتے ہیں بلکہ کچھ ان سے زیادہ بھی۔

یوں تو وینس میں ان گنت پل ہیں اور ان میں سے بعض کے نام بھی ہیں لیکن شہر کے بیچوں بیچ گرینڈ کینال پر جو پل ہے اس کا نام "ایالتو" ہے۔ غالباً" یہ وینس کا سب سے بڑا اور سب سے خوبصورت پل ہے۔ اس پل پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو عجیب منظر ہوتا ہے۔ اس کے درمیان میں ایک ٹریفک سگنل بھی ہے اور ہر طرف مختلف چھوٹی چھوٹی نہریں رگوں کی طرح پھیلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایک گنڈولے والے نے یہ اطلاع دی کہ اس پل کا نام تو "ایالتو" ہے مگر اسے "آہوں کا پل" کہتے ہیں۔

"مگر کس لئے؟" ہم نے پوچھا

خان صاحب بیزار ہو کر بولے "یار آہیں نہیں سمجھتے۔ تم نے دیکھا نہیں آس پاس کیسے کیسے مناظر ہیں۔ انہیں دیکھ کر ہمارے جیسے لوگ آہیں بھرنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں؟"

بٹ صاحب بہت دیر سے سحر زدہ سے تھے۔ کہنے لگے "واقعی اتنی بہت سیاح خوبصورت عورتوں اور ان کے ساتھ دوسرے لوگوں کو دیکھ کر تو میرے دل سے بھی ٹھنڈی آہیں نکل رہی ہیں۔"

ہم نے کہا "ذرا دم لو بھائی' اس اللہ کے بندے سے تو پوچھو کہ یہ "آہوں کا پل" کیوں کہلاتا ہے۔؟"

خان صاحب جھٹ بولے "ٹھہرو" میں اس سے پوچھتا ہوں" "دراصل فلورنس کے دوران قیام مریم کی محبت کے زمانے میں ان کی انگریزی بقول ان کے خاصی اچھی ہو گئی تھی اور وہ خاصے پر اعتماد تھے چنانچہ انہوں نے انگریزی میں گنڈولے والے جوان رعنا سے پوچھا "وہائی یو کال اٹ برج آف سائز"

(WHY YOU CALL IT BRIDGE OF SIGHS)

گنڈولے والے کی توجہ اس وقت برابر سے گزرنے والے گنڈولے میں سوار تین حسیناؤں کی جانب تھی۔ بھلا ہم جیسے تین بے مزہ مسافر اس کی دل بستگی اور توجہ کا سامان کیونکر فراہم کر سکتے تھے؟ اس نے پاس سے گزرنے والا گنڈولا والے سے اطالوی زبان میں کچھ کہا اور پھر ایک آنکھ میچ کر زور سے سیٹی بجائی۔

خان صاحب نے منہ بنا کر کہا "یار یہ تو بہت بدمعاش اور لوفر ٹائپ آدمی ہے۔"

بٹ صاحب بولے "اس سے کہو کہ کشتی روک کر ہمیں یہیں اتار دے۔"

"کیا مطلب، یعنی ہم نہر میں کود جائیں؟"

"نہیں یار! اتنے بہت سے خالی گنڈولے گھومتے پھر رہے ہیں کسی اور میں سوار ہو جائیں گے۔"

اتنی دیر میں "گنڈولا بان" کی مصروفیت میں کمی آ گئی تھی۔ خان صاحب نے اس سے دوبارہ وہی سوال کیا۔ اس نے پہلے تو سر کھجایا پھر کہنے لگا "سینور! آپ یہ جانتے ہیں کہ ہمارا یہ شہر صدیوں پرانا ہے؟"

ہم تینوں نے سر ہلا کر اقرار کیا۔

کہنے لگا "پرانے زمانے میں وینس کا جیل خانہ اس پل کے دوسری جانب تھا۔ اس جیل خانے میں مجرموں کو پھانسی دی جاتی تھی یا اس کی گردن اڑا دی جاتی تھی۔"

"اچھا! کیا واقعی؟"

"بھائی! اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ پرانے زمانے میں ہر ملک میں مجرموں کو پھانسی یا موت کی سزا دی جاتی تھی۔ ہاں بھئی' تم بتاؤ پھر کیا ہوا؟" یہ خان صاحب تھے جو بٹ صاحب کے احمقانہ سوال پر بہت برہم نظر آ رہے تھے۔

گنڈولا والے نے سامنے سے آنے والی کشتی سے بڑی ہنرمندی کے ساتھ اپنے گنڈولے کو بچایا پھر بولا "تو جب مجرم پھانسی کے لئے لے جاتے تھے تو اس پل سے گزرتے ہوئے وہ بے چارے آہیں بھرا کرتے تھے اور ظاہر ہے آنسو بھی بہاتے ہوں گے۔ آس پاس کھڑے ہوئے لوگ بھی غم زدہ ہو کر رونے اور آہیں بھرنے لگتے تھے۔ ایک عجیب سماں ہو جاتا تھا۔ ہر طرف سسکیوں اور آہ و بکا کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں اس پل کا نام "آہوں کا پل" ہی بہت موزوں تھا۔"

ہم سب بھی اداس ہو گئے۔ خان صاحب بولے "تو اب وہ جیل خانہ اور پھانسی گھر کہاں ہے اور مجرموں کو کس راستے سے لے جایا جاتا ہے؟"

اطالوی نوجوان ہنس پڑا۔ کہنے لگا "آج کل پھانسی کا رواج ہی کہاں ہے اور پھر مجرم بھی بہادر اور ڈھیٹ ہو چکے ہیں۔ زمانہ بدل گیا ہے سینور! بالکل بدل گیا ہے۔ اوپر والا خدا بھی جانتا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے نگاہیں اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا جہاں پل پر ایک جوڑا مصروف محبت تھا۔ گنڈولا والے کے منہ سے پھر بے ساختہ سیٹی کی آواز نکل گئی اور پھر وہ ہم لوگوں کی طرف دیکھ کر نہایت غیر شریفانہ انداز میں ہنسنے لگا۔ خان صاحب نے کہا "میں آپ کو بتا دوں یہ قوم ایک دن اسی پانی میں غرق ہو جائے گی۔ ان کے لچھن دیکھ رہے ہیں؟"

مگر بعد میں خان صاحب پر بھی ماحول نے ایسا اثر کیا کہ ان کے لچھن بھی خاصے بگڑ گئے۔ وہ داستان آپ کو کچھ دیر بعد سنائی جائے گی۔ گنڈولے والے در حقیقت بقول خان صاحب خاصے لفنگے لوگ تھے۔ ٹیکسی' رکشا والوں کی تمام خوبیاں اور خرابیاں ان میں موجود تھیں مثلاً وہ موقع پا کر ایک سواری کے ہوتے ہوئے دوسرے تیسرے مسافر بھی گنڈولے میں بٹھا لیتے ہیں اور مسافر اعتراض کرے تو بڑی معصومیت سے اطالوی زبان

میں چرب زبانی شروع کر دیتے ہیں۔ زیادہ کرایہ وصول کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ جس طرح سڑکوں سے سیاح ناواقف ہوتے ہیں۔ اسی طرح نہری راستوں سے بھی وہ غریب نابلد ہوتے ہیں۔ چنانچہ گنڈولا والے انہیں خوب چکر دیتے ہیں۔ سیاح بار بار کناروں پر وہی کلیسا' محل' عمارتیں دیکھتا ہے مگر یہ فیصلہ نہیں کرپاتا کہ یہ وہی ہیں جو وہ پہلے بھی دیکھ چکا ہے یا کوئی نئی جگہ ہے۔ یہاں تک کہ کناروں کے مکانوں کی کھڑکیوں اور بالکونیوں میں مسکراتے' لجاتے' انگڑائیاں لیتے اور اشارے کرتے ہوئے حسین چہرے بھی انہیں یکساں ہی لگتے ہیں۔ جس طرح مغربی ممالک میں سڑکوں پر پارکنگ کے لئے پارکنگ میٹر لگے ہوئے ہیں یا پرانے زمانے میں گھوڑے باندھنے کے لئے لکڑی کے کھمبے وغیرہ ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح نہروں کے ساتھ ساتھ کشتیاں اور گنڈولے باندھنے کے لئے بھی کھمبے نصب ہوتے ہیں۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ وینس کے لوگ پھولوں سے بھی محبت کرتے ہیں۔ مکانوں' محلات اور مختلف عمارتوں کے چھجوں اور بالکونی میں گملے اور پھولوں کے گچھے ایک عجیب منظر پیش کرتے ہیں۔ عمارتوں کی چھتیں عام طور پر سرخ رنگ کی ہوتی ہیں اور یہ یکسانیت اوپر کھڑے ہو کر مکانوں اور وینس کا نظارہ کرنے والوں کو بہت بھلی لگتی ہے۔

وینس کا ایک مشہور اور قابل دید مقام "پیازہ سان مارکو" ہے یہ ایک خوبصورت پیازہ ہے بلکہ کہنا چاہئے کہ شہر کا سب سے خوش منظر چوک ہے۔ آس پاس خوبصورت محرابوں والی عمارتیں ہیں۔ ایک جانب پرانے بادشاہوں کا پرشکوہ محل ہے اور عین بالمقابل وینس کا سب سے مشہور و معروف گرجا گھر ہے جسے "سان مارکو" کہتے ہیں۔ یہ پیازہ اسی کے نام سے منسوب ہے۔ اس کلیسا میں دنیا بھر کے نوادر اور قیمتی و نایاب اشیا موجود ہیں۔ جو وینس کے سوداگر دنیا کے مختلف ملکوں اور شہروں سے لائے اور انہیں اس کلیسا میں سجا دیا۔ اس کلیسا کے بارے میں عجیب و غریب کہانیاں گھڑنے میں تو یہ لوگ ماسٹر ہیں۔ اس کلیسا کے سامنے ایک خوبصورت اور بلند مینار ہے۔ کسی زمانے میں یہ مینار جہازوں کو روشنی اور راستہ دکھانے کے کام آتا ہو گا۔ کہتے ہیں کہ فلک پیما گلیلیو نے ستاروں اور فلک کی پراسرار پہنائیوں کو دیکھنے کی غرض سے اس مینار پر اپنی دوربین نصب کی تھی۔ پھر بعد میں محبت میں ناکام ہونے والوں نے اسی مینار کو "خودکشی کے آلے" کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ محبت میں کامیابی نہ ہوئی تو سیدھے مینار پر پہنچے اور نیچے کود گئے۔ یہ نہیں کہ چھلانگ لگانے والوں میں محض مرد ہوتے تھے۔ جی نہیں' دوشیزائیں بھی یہ دلیرانہ حرکت کرتی تھیں اور بعض اوقات جب فلک ناہنجار دو محبت کرنے والوں کے درمیان حائل ہو جاتا تھا یا سماج ان کے مابین اونچی اونچی دیواریں کھڑی کر دیتا تھا تو یہ جوڑے بھی اس سوا تین سو فٹ اونچے مینار پر چڑھتے اور پھر دوسرے جنم میں ملاقات کا وعدہ کر کے دھڑام سے نیچے کود جاتے۔ بہرحال یہ تو پرانی داستانیں ہیں۔ آج کل یا تو لوگوں (وینس والوں نے) محبت کرنی ترک کر دی ہے یا پھر انہیں محبت میں ناکامی نہیں ہوتی۔ چنانچہ یہ جگہ ان دنوں سیاحوں اور حسینوں سے معمور ہوتی ہے اور نت نئے چہرے' نئے نئے ملبوسات اور ملک ملک کے لوگ یہاں نظر آتے ہیں۔

مجسمے اس شہر کے چوکوں میں بھی نصیب ہیں مگر اتنی بڑی تعداد میں نہیں جتنے کہ فلورنس میں نظر آتے ہیں۔ لیکن برہنگی اور عریانی (اور اس کے ساتھ ہی حسن' نزاکت اور دلکشی) میں یہ مجسمے فلورنس کے بتوں سے کم نہیں ہیں۔ پیازہ سان مارکو سے گرینڈ کینال اور دوسرے مقامات کے لئے سواریاں (یعنی کشتیاں اسٹیمر اور گنڈولے) دستیاب ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک طرح کا ماڈرن گھاٹ ہے اور بہت دلچسپ و دلکش سماں پیش کرتا ہے۔

اگلے دن خان صاحب نے ہمیں صبح سویرے دو معلومات فراہم کیں۔ ایک تو یہ کہ وینس وہ شہر ہے جہاں سے دنیا کا سب سے پہلا اخبار شائع ہوا تھا اور دوسری یہ کہ مشہور و معروف سیاح مارکو پولو اسی شہر کا رہنے والا تھا۔ بٹ صاحب پوچھنے لگے "اس اخبار کا کیا نام تھا اور صفحات کتنے تھے؟"

ہم نے پوچھا "مارکو پولو کون سے مکان میں رہتا تھا؟"

خان صاحب جھلا کر بولے "بھئی تم لوگ تو بڑے جاہل ہو اور جاہل ہی رہنا چاہتے ہو۔ ارے یہ وینس کے لوگ صدیوں پہلے جہاز رانی اور سوداگری کے ماہر تھے اور ساری دنیا میں تجارت کرتے پھرتے تھے۔"

بٹ صاحب نے اپنی تاریخ دانی کا مظاہرہ کیا "اور یہی لوگ سمندری قزاق بھی تھے اور سمندروں میں مسافروں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔"

خان صاحب بولے "یہ تمہیں کس نے بتایا؟"

"میں نے ہالی ووڈ کی ایک فلم میں دیکھا تھا۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" خان صاحب بیزار ہو گئے۔

"اب یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟"

خان صاحب کچھ شرما سے گئے۔ ہم نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے تو خاموش رہے۔ فلورنس کے ایک تجربے نے انہیں خاصا کہنہ مشق اور بقول بٹ صاحب بے شرم بنا دیا تھا۔

کہنے لگے "وہ ہمارے کمرے کے سامنے جو بالکونی ہے نا' وہاں ایک بہت خوبصورت لڑکی رہتی ہے۔"

"اچھا تو اس لڑکی نے تمہیں دیکھتے ہی چلا چلا کر یہ ساری معلومات فراہم کرنی شروع کر دیں؟"

"یار بے وقوفی کی باتیں ترک کرو۔ آج صبح سویرے وہ مجھے ملی تھی۔"

"کہاں؟" ہم دونوں کی زبان سے ایک ساتھ نکلا۔

"ہوٹل کے باہر میں صبح سویرے اٹھ کر ورزش کے لئے بالکونی میں گیا تو وہ نظر آ گئی۔"

"کیا وہ بھی صبح صبح ورزش کر رہی تھی؟"

"نہیں یار' لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی' پھر بالکونی سے ہٹ گئی۔ میں منہ ہاتھ دھو کر کپڑے تبدیل کر کے ہوٹل سے باہر ٹہلنے گیا تو وہ سامنے والے چوک میں مل گئی' پھر ہم دونوں نے خوب باتیں کیں۔"

"کس زبان میں؟"

"یار انگریزی میں اور کس زبان میں۔"

"خیر خیر چھوڑو' پھر کیا ہوا؟"

"پھر ہم دیر تک ٹہلتے رہے۔ موسم بھی بہت اچھا تھا کیونکہ دن کے وقت دھوپ میں تو یہاں خاصی گرمی اور تمازت ہو جاتی ہے نا۔"

"بھئی پہیلیاں مت بجھواؤ خلاصہ بیان کرو اور مطلب کی بات بتا دو۔"

وہ پہلے تو شرمانے کی ایکٹنگ کرتے رہے' پھر رک رک کر بولے "دوستو! ہم سفر سے زیادہ دوست اور رازدار کوئی نہیں ہوتا۔ سنو' وہ مجھ سے پیار کرنے لگی ہے اور میں بھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی کمزوری بن چکے ہیں۔"

بٹ صاحب کو غصہ آ گیا۔ "تم تو شادی شدہ ہو' وہاں بیوی تمہاری جان کو روتی ہو گی۔"

"فضول باتیں مت کرو" ہم نے بٹ صاحب کو ڈانٹا اور ساتھ ہی آنکھ سے اشارا بھی کر دیا۔ "تم جانتے ہو کہ اسلام نے مردوں کو چار شادیوں کی اجازت دی ہے اور پھر جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی"

بٹ صاحب کہنے لگے "معلوم ہوتا ہے یہاں ہمیں کوئی قاضی ضرور تلاش کرنا پڑے گا۔"

خان صاحب رومانٹک ہو گئے۔ بولے "وعدہ کرو' تم لوگ میرا ساتھ دو گے؟"

"بے شک' بے شک' آخر دم تک۔ دوست ہوتے کس لئے ہیں؟"

ناشتے کے بعد ہم تینوں بالکونی پر چلے گئے۔ وہاں پھولوں سے لدے ہوئے گملوں اور چند سکھانے کے لئے لٹکائے ہوئے رنگین کپڑوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ خان صاحب نے جیب سے ماؤتھ آرگن نکالا اور بجانا شروع کر دیا۔ خاصی بے سری آواز تھی مگر چند لمحے بعد سامنے بالکونی میں پھولوں کے گملوں کے ساتھ ایک پھول سا چہرہ نمودار ہو گیا۔ واقعی کیا خوبصورت چاند جیسا چہرہ تھا اور کس قدر قیامت خیز سراپا تھا۔ بال اس کے ترشے ہوئے تھے پھر بھی کمر تک پھیلے ہوئے تھے۔ سرخ پھولدار اسکرٹ میں وہ سچ مچ گل و گلزار نظر آ رہی تھی۔ خان صاحب کو (یا شاید ہم سب کو) دیکھ کر وہ مسکرانے لگی۔ بے حد دلکش اور پرکشش مسکراہٹ تھی۔ خان صاحب نے اشارے سے اسے نیچے آنے کو کہا اور وہ غڑاپ سے بالکونی کی کھڑکی کے پیچھے غائب ہو گئی۔

"آؤ' جلدی سے چلو' وہ انتظار کر رہی ہو گی۔" خان صاحب نے ہمارا بازو پکڑ کر کھینچا۔

"پہلے یہ بتاؤ کہ یہ ماؤتھ آرگن تمہارے پاس کہاں سے آیا؟"

بولے "صبح سویرے ایک لڑکے سے خریدا تھا۔ وہ بجاتا ہوا جا رہا تھا۔ دو سو لیرا میں

برا تو نہیں ہے۔ سیکنڈ ہینڈ ہے مگر بہت کام کی چیز ہے۔" ہم ان کے بیان کو فوراً مان گئے۔

ہوٹل کے باہر وہ حسینہ وینس ہمارے انتظار میں ٹہل رہی تھی۔ ہم لوگوں کو دیکھا تو پھول کی طرح کھل اٹھی اور اٹھلاتی ہوئی ہماری طرف چلی آئی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے سراپا کے مانند اس کی چال بھی بے حد نشہ آور اور لچکیلی تھی۔ ہم نے اٹلی کی فلموں میں جتنی حسینائیں اور ہیروئنیں دیکھی تھیں وہ درحقیقت ان سب سے زیادہ دلکش تھی۔ اٹلی میں دو ہی قسم کی عورتیں نظر آتی ہیں۔ ایک بے حد پرکشش اور خوبصورت متناسب جسم والی اور دوسری موٹی موٹی اور بے ہنگم جسموں والی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام شاید توازن قائم کرنے کی غرض سے کیا تھا۔ ورنہ اگر محض خوبصورت جسموں والی یا صرف موٹی موٹی عورتیں ہی' اس ملک میں ہوتیں تو اس ملک کا تو خیر جو حال ہونا تھا ہوتا ہی مگر بے چارے سیاحوں کا کیا حال ہوتا؟ ذرا سوچئے۔ غور فرمایئے۔

بٹ صاحب نے سرگوشی کی "اس کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔"

خان صاحب رسان سے بولے "پوچھ لیا۔ اس کا نام لولو ہے۔"

"یہ کیا نام ہوا؟"

خان صاحب بولے "یار اس ملک میں ایسے ہی نام ہوتے ہیں۔ ہر جگہ کا اپنا دستور ہے۔ ہمارے ملک میں بھی تو لپی' ٹمی' پپی جیسے نام ہوتے ہیں۔ "لولو" تو بہت پیارا نام ہے۔ تمہیں یاد نہیں کتنی مشہور ایکٹریس ہے وہ جینا لولو بریجیڈا۔"

اس مثال کے بعد ہمارا لاجواب ہونا لازم ہو گیا۔ اتنی دیر میں لولو ہمارے نزدیک آ گئی تھی۔ خان صاحب کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ انہوں نے ایک ہی سانس میں اتنی انگریزی بولی کہ انگریزی کا سیلاب آ گیا اور اس میں وہ غریب ڈوب گئی۔ مطلب یہ کہ ایک لفظ بھی اس کے پلے نہیں پڑ سکا۔ ہم نے خالص خدمت خلق کے جذبے کے تحت اسے آسان اور عام فہم انگریزی میں بتایا کہ ہم لوگ کون ہیں' کہاں سے آئے ہیں۔ اس کا شہر اور ملک ہمیں کس قدر پسند آیا ہے۔

وہ بولی "اور میں؟"

ہم نے کہا "تمہارا تو جواب ہی نہیں ہے۔ سینوریٹا! تم تو اتنی حسین ہو کہ ہم نے اٹلی کی کوئی ہیروئن بھی ایسی نہیں دیکھی۔ صوفیہ لورین' جینا لولو بریجیڈا' سلوانا منگانو۔ یہ سب تمہارے آگے پانی بھرتی ہیں۔ آخر تم فلموں میں کام کیوں نہیں کرتیں؟ ایسی فلمی ہیروئن تو اس ملک کو نصیب ہی نہیں ہوئی ہے۔"

یہ ہماری طویل تقریر کا خلاصہ تھا۔ خان صاحب اور بٹ صاحب تو چار پانچ منٹ تک ہماری شکل ہی دیکھتے اور ہماری تقریر سنتے رہے مگر لولو کا یہ عالم تھا کہ اس کا رواں رواں خوشی سے ناچ رہا تھا۔ اس قدر چرب زبانی کا مظاہرہ تو شاید کسی اطالوی دل پھینک نے بھی اس کے سامنے نہیں کیا ہو گا۔ دراصل گزشتہ چند روز کے اطالوی قیام کے دوران ہم نے اٹلی والوں سے یہی کچھ سیکھا تھا اور ہم نے دیکھا کہ ہماری یہ ترکیب انتہائی کارگر ثابت ہوئی۔ لولو تو جیسے مسمریزم کا شکار ہو گئی۔ اس لمحے کے بعد اس نے نہ تو خان صاحب کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا اور نہ ہی بٹ صاحب جیسے جوان خوشنما کو گھاس ڈالی۔ بڑی بے تکلفی سے ہمارے نزدیک آئی۔ ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی اور ہمارے بازو میں اپنا بازو ڈال دیا۔ اگر خان صاحب کے پاس پستول وغیرہ ہوتا اور وینس میں ڈوئیل لڑنے کا دستور موجود ہوتا تو شاید وہ ہمیں اسی وقت چیلنج کر دیتے اور ہمیں جان سے مارے بغیر دم نہ لیتے۔ بٹ صاحب اس معاملے میں غیر جانبدار تھے۔ بلکہ وہ خان صاحب سے خاصے جیلس ہو رہے تھے۔ لڑکی ان کے ہاتھ سے نکلتے دیکھی تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا۔

لولو کہنے لگی "آؤ تمہیں "وی نیزیا" دکھاؤں" اور ہمیں بازو سے کھینچ کر آگے چل پڑی۔

ہم نے شرمندگی سے خان صاحب کی طرف دیکھا اور کہا "ان لوگوں کو بھی ساتھ لے لیں۔ یہ ہمارے دوست ہیں اور پاکستان سے ہمارے ساتھ آئے ہیں۔"

وہ بگڑ گئی "فضول باتیں مت کرو' ہم الیکشن میں ووٹ دینے تو نہیں جا رہے۔ ہم تو گھومنے جا رہے ہیں۔ سیر کریں گے اور موج اڑائیں گے۔" اس کے بعد ہم نے پلٹ کر اپنے دوستوں کی جانب نہیں دیکھا۔

ہم بانہوں میں بانہیں ڈالے تنگ اور پیچ دار گلیوں میں چلتے رہے۔ وہ نہایت نازک اندام اور خوشبو دار لڑکی تھی۔ ظاہر ہے اس میں اس کی اپنی خوشبو کے ساتھ ساتھ

سینٹ کی خوشبو بھی شامل تھی۔ وہ چلتے چلتے رک جاتی' کسی عمارت' چوک یا ریستوران کے متعلق بتانے لگتی' پھر خوب ہنستی اور پھر بازو پکڑ کر آگے بڑھ جاتی۔

انگریزی وہ بس واجبی سی جانتی تھی مگر اپنا مطلب واضح کر دیتی تھی اور اس کی زبان سے یہ شکستہ انگریزی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ ہم نے سوچا کہ انگریزی تو دراصل یہ اطالوی لڑکی بول رہی ہے۔ انگریز کیا خاک انگریزی بولتے ہیں اٹک اٹک کر نہایت کرخت لہجے میں باتیں کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم انگریز ہیں۔ انگریزی زبان ہماری کنیز ہے۔

ہم چلتے چلتے سمندر کی طرف نکل گئے۔ جہاں بھرپور ہواؤں نے ہمارا استقبال کیا۔ اس کے بال ہوا کے ساتھ اڑنے لگے اور اس کی ہنسی میں اور زیادہ بے ساختگی اور بے باکی پیدا ہو گئی۔

کہنے لگی "پتا ہے یہ وینس کس طرح تعمیر ہوا تھا؟"

"پتا نہیں' ہم تو پہلی بار یہاں آئے ہیں۔"

بولی "کسی زمانے میں یہاں بہت سے جزیرے تھے جن میں ملاح اور ماہی گیر رہا کرتے تھے۔ بے چارے بہت غریب لوگ تھے یہاں کی زمین بہت خراب اور دلدلی تھی جو مکان بناتے وہ زمین میں دھنس جاتا تھا۔ وہ بہت پریشان ہوئے۔ آخر سوچ سوچ کر کسی عقلمند نے یہ ترکیب نکالی کہ اگر درخت کاٹ کر ان کے تنے زمین پر بچھا دئے جائیں تو ان پر مکان بنائے جا سکتے ہیں۔ درختوں کی تو ان جزیروں میں کمی نہیں تھی۔ انہوں نے ہزاروں لاکھوں درخت کاٹ کر ان کی لاشیں زمین پر بچھا دیں اور پھر ان پر مکان بنانے شروع کر دئے۔ یہ ساری عمارتیں بعد میں اسی طرح بنائی گئی ہیں۔"

"کیا تمہارا مکان اور ہمارا ہوٹل بھی؟"

"اور کیا' کہا جو ہے کہ ساری کی ساری عمارتیں۔ تم بہت بیوقوف ہو۔"

اس نے اپنی شہادت کی انگلی سے ہماری ناک دبائی اور خوب ہنسی "اور تمہیں پتا ہے کہ یہاں پہلے سمندر کی دیوی رہا کرتی تھی" اس نے پوچھا۔

"ہاں ہاں پتا ہے۔"

"کس نے بتایا؟"

"تم نے"

"میں نے؟" وہ حیران ہو کر بولی۔ "میں نے تو ابھی دیوی کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا۔"

"تم ہی تو وہ دیوی ہو" ہمیں فلمی مکالمہ نگاری نے سہارا دیا "اگر تمہیں نہ دیکھتا تو شاید مجھے اس بات پر یقین نہ آتا۔"

وہ حیرت زدہ اور ہکا بکا ہو کر مجھے دیکھنے لگی' پھر زور زور سے ہنسی اور لپٹ گئی۔

"تم بہت چالاک ہو' کیا تم اطالوی ہو؟"

"بالکل نہیں' میں پاکستانی ہوں۔ یہ اطالوی ہمارے سامنے کیا بیچتے ہیں۔ ہم لوگ ہر کام میں اول نمبر ہیں۔"

"واقعی' میں مانتی ہوں۔"

میں نے کہا "آؤ' کہیں قہوہ پئیں۔"

"چلو۔ تمہیں پتا ہے وینس میں سب سے اچھا قہوہ کہاں ملتا ہے؟"

"نہیں"

"میں تمہیں بتاتی ہوں"

یہ ایک چھوٹا سا ریستوران تھا۔ کافی کی خوشبو ہال میں بسی ہوئی تھی اور دو خوبصورت لڑکیاں ویٹریس کے فرائض سر انجام دے رہی تھیں۔ شاید ریستوران کی مالکائیں یا اس کی صاحب زادیاں تھیں۔ لولو نے انہیں بے تکلفی سے پکارا اور اطالوی میں کافی دیر تک طولانی تقریر کی۔ اس دوران میں وہ بار بار میری طرف اشارے کرتی اور ہنستی۔ دونوں لڑکیاں بھی ہنسی سے بے قابو ہوئی جا رہی تھیں۔ اور بار بار حیرت و استعجاب بھرے فقرے اور آوازیں پیدا کر رہی تھیں' پھر وہ دونوں چلی گئیں۔

"پتا ہے میں نے ان سے کیا کہا ہے؟" وہ پوچھنے لگی۔

"یہی کہ میں تمہیں اچانک مل گیا ہوں۔ بہت باتونی اور جھوٹا ہوں اور تمہاری بہت زیادہ تعریف کرتا ہوں اور بہت دلچسپ آدمی ہوں اور یہ کہ تم مجھے پسند کرنے لگی ہو۔"

حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ چند لمحے وہ سانس روکے مجھے دیکھتی رہی پھر گھونسا مار کر بولی "یہ سب تم کو کیسے معلوم ہوا؟ کیا تم اطالوی جانتے ہو؟"

"بالکل نہیں، مگر میں بہت چالاک آدمی ہوں"

ہم دونوں ہنسنے لگے۔ لڑکیاں کافی لے آئیں۔ ایک کافی لے کر آئی۔ دوسری بسکٹوں کی ٹرے لائی اور میز پر رکھ کر دونوں کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئیں۔ لولو کہنے لگی "یہ کہتی ہیں کہ ان چیزوں کے دام نہیں لیں گی۔ یہ میری سہیلیاں ہیں۔ کہتی ہیں کہ تمہارا دوست عینک تو لگاتا ہے مگر اچھا لگتا ہے"

میں نے کہا "ان سے کہو یہ بہت پڑھا لکھا آدمی ہے۔ قابل ہے"

اس نے ان سے کہا تو وہ مزید حیران ہو کر سوالات کرنے لگیں۔ لولو نے کہا "یہ پوچھتی ہیں کیا تم پروفیسر ہو یا بچوں کو پڑھاتے ہو یا پھر فلسفی ہو۔"

"میں رائٹر ہوں"

وہ خوشی سے چیخ پڑی اور سہیلیوں سے کہنے لگی "پتا ہے؟ یہ رائٹر ہے"

پھر بولی "ارے، میں نے ان کا تعارف تو تم سے کرایا ہی نہیں۔ یہ مینڈی ہے اور یہ ہے اینڈی۔ یہ میری بہترین سہیلیاں ہیں۔ اپنے ہر بوائے فرینڈ سے سب سے پہلے مجھے ملاتی ہیں۔ کیوں اچھی ہیں نا؟"

ہم نے فوراً فلمی مکالمے کا سہارا لیا "ہاں، بہت اچھی ہیں۔ مگر تم سے زیادہ نہیں۔"

اس نے ایک مکا میرے بازو پر رسید کیا اور دانت کچکچا کر بولی "باتیں خوب بناتے ہو، لگتا ہے تم بھی پہلے کبھی اطالوی تھے۔"

ہم نے کہا "پہلے جنم میں اور شاید تم پاکستانی تھیں"

"وہ کیسے؟"

"تم پاکستانی لڑکیوں کی طرح شرماتی ہو۔ وینس میں رہ کر بھی تمہارے اندر حیا ہے۔"

خوشی کے مارے اس نے اپنے دونوں حنائی ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اس سے یہ اندازہ ہوا کہ اسے کم از کم شرمانے کا انداز ضرور آتا تھا۔ ویسے بھی وہ خاصی مشرقی ٹائپ کی لڑکی تھی۔ لباس تو اس کا مغربی تھا۔ وہی اسکرٹ، بلاؤز، کم سے کم لباس، کٹے ہوئے بال، بے باکی اور بے تکلفی۔ مگر پھر بھی کوئی بات ایسی ضرور تھی۔ جو اسے دوسری یورپی لڑکیوں سے مختلف اور ممتاز بنا رہی تھی۔ ایک تو یہی کہ اس نے میرے اور اپنے درمیان فاصلہ قائم کر رکھا تھا۔ دوسرے اپنی تعریف سن کر خوش ہو جاتی تھی۔ یہ خوبی یورپ کی لڑکیوں میں اب معدوم ہو چکی ہے۔ اول تو ان کے پاس حسن و جمال کی تعریف سننے کے لئے وقت ہی نہیں ہے اور اگر آپ ان کے سامنے حسن و جمال کا تذکرہ بھی کریں تو یوں لگتا ہے جیسے بھینس کے آگے بین بجا رہے ہیں۔ خوش ہونا اور شرمانا تو کیا وہ درمیان میں ہی بات کاٹ دیتی ہیں۔ مثلاً آپ بہت جذباتی اور رومانٹک ہو رہے ہیں "تمہارے بال کتنے سنہرے اور آنکھیں کتنی نیلی ہیں، بالکل جھیل کی طرح اور تمہارے ہونٹ......

وہ فوراً بیزاری سے بات کاٹ دیں گی "اوہ۔ کم آن۔ ڈونٹ بی سلی زمین پر واپس آ جاؤ۔" مگر لولو میں یہ بات نہیں تھی سچ جانئے، یہ لڑکی مجھے زیادہ اچھی لگی تھی۔

ریستوران سے نکلے تو دونوں سہیلیوں نے خوب ہنس ہنس کر اسے رخصت کیا اور اپنی زبان میں خدا جانے کیا کیا شوخیاں کیں۔ لولو کا تو ہنسی کے اور شرم کے مارے برا حال ہوا جا رہا تھا وہ ہنستی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی "بس، بس کرو"

ہم دونوں نے پھر چلنا پھرنا شروع کر دیا۔ آس پاس دوسرے لوگ بھی گھوم رہے تھے۔ کلیساؤں کے گنبدوں اور چوراہوں پر کبوتر اٹکھیلیاں کرتے پھر رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اتنے ہزاروں لاکھوں کبوتر مر کر کہاں جاتے ہیں۔ یہ اپنے وجود سے شہروں کی رونق تو ضرور بڑھاتے ہیں مگر گندگی اور بدبو کا سبب بھی بنتے ہیں۔ پھر یہاں کے لوگ بھی ان سے کبھی نہیں اکتاتے اکثر تو یہ کبوتر سیاحوں کے خرچ پر ہی پلتے ہیں۔ مگر کبھی تو مقامی لوگوں کو بھی ان کے خورد و نوش کا انتظام کرنا ہوتا ہو گا۔ ہم مختلف گلیوں، راستوں اور پلوں سے گزرتے رہے اور لولو مجھے بتاتی رہی کہ وہ کون سی جگہ ہے۔ اس کی خصوصیت کیا ہے؟ بہت لمبی چوڑی تقریر وہ نہایت سنجیدگی سے کر رہی تھی۔ مگر یہاں کون کافر سن رہا تھا، ایسے رومانی اور سحر انگیز ماحول میں۔ لولو جیسی ہم سفر کے ہوتے ہوئے ان فضول باتوں پر کون کان دھرے گا بھلا؟ چنانچہ ہم نے بھی سوائے ہوں ہاں کرنے کے اور کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالا "وہ سامنے پلازہ روما ہے"

"اچھا"

"وہاں پر وہ کشتیاں دیکھ رہے ہو۔ یہاں سے کشتیاں اور اسٹیمر چلتے ہیں اور یہاں آ کر کاریں وغیرہ رک جاتی ہیں۔"

"اچھا۔ وہ کاریں وہاں رک کر کیا کرتی ہیں؟" ہم نے بے خیالی سے پوچھا۔

"کرتی ہیں' بس کھڑی رہتی ہیں انتظار میں۔ وہاں سے لوگ پانی کی سواریوں میں سوار ہو جاتے ہیں۔ آس پاس پول اور ہوٹل بھی ہیں اور کیمپنگ کے لئے بھی مقامات ہیں جہاں بہت سے سیاح خیمے لگا کر رہتے ہیں۔"

"اچھا!"

"اچھا کیا' کچھ اور بھی تو بول۔"

"اچھا اچھا۔" ہم نے دو بار "اچھا" کہہ دیا۔ پھر پوچھا "لولو! یہ بتاؤ کہ اٹلی کے لوگ اتنے جرائم پیشہ کیوں ہوتے ہیں؟"

وہ چونک کر میرے بازو سے الگ ہو گئی۔ "کون کہتا ہے؟"

"ساری دنیا کہتی ہے۔ دیکھو نا تمہارے ملک کے بہت سے علاقے تو اسمگلروں مجرموں اور بدمعاشوں کے لئے ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ سسلی کو دیکھ لو' میں نے تو نہیں دیکھا مگر سنا ہے کہ اس پہاڑی علاقے میں سبھی مجرم ہوتے ہیں۔"

"جھوٹ بکتے ہیں لوگ۔ دیکھو مجرم تو ہر جگہ ہوتے ہیں چھوٹے بھی' بڑے بھی۔ سسلی میں بھی ہوتے ہیں۔ دراصل سسلی ہمارے جنوب میں بہت غریب اور گرم علاقہ ہے۔ روزگار بھی کم ہے۔"

ہم نے کہا "اسی لئے لوگ اسمگلر بن جاتے ہیں اور پھر باقی سب غریبوں کو کام پر لگا دیتے ہیں۔ تم نے مافیا کا نام تو سنا ہو گا ساری دنیا میں لوگ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں مافیا کے نام سے اور امریکا میں بھی تمہارے اٹلی کے مافیا والوں نے خوب نام پیدا کیا ہے۔"

"اچھے برے لوگ تو سبھی جگہ ہوتے ہیں" اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔

"مگر یہاں کے لوگ تو بہت خراب ہیں۔ سنا ہے عورتوں کے ہاتھ سے پرس چھین کر بھاگ جاتے ہیں' سیٹیاں بجاتے ہیں' انہیں چٹکیاں کاٹتے ہیں اور آوازے کستے ہیں۔"

لولو کا چہرہ غصے سے تمتمانے لگا۔ کہنے لگی "تم کیونکہ نئے نئے ہو اس لئے کچھ نہیں جانتے۔ یہ سب حرکتیں ہمارے لوگ سیاح عورتوں کو دیکھ کر ہی کرتے ہیں۔ مقامی عورتوں سے تو وہ بہت احترام سے پیش آتے ہیں اور یہ جو ہزاروں آوارہ گرد عورتیں نئے نئے حلئے بنا کر اور ننگے ننگے لباس پہن کر ہمارے ملک میں آتی ہیں' وہ اسی لئے تو آتی ہیں۔ وہ ان حرکتوں کو پسند کرتی ہیں۔ شاید ان کے ملکوں میں ان کے مرد اپنی عورتوں کی طرف توجہ نہیں دیتے ان سے محبت نہیں کرتے۔ اٹلی کے مردوں کی ان حرکتوں پر ہی تو یہ جان چھڑکتی ہیں بہت خراب اور بدمعاش ہوتی ہیں یہ عورتیں۔ ہمارے ملک میں بھی انہوں نے بے ہودگی پھیلا دی ہے۔ اب دیکھو نا' ان کو دیکھ کر ہمارے ہاں کی لڑکیاں بھی خراب ہو رہی ہیں' مگر ہمارے ملک میں پھر بھی شرم ہے لحاظ ہے لوگ اپنے بزرگوں کا اور بڑوں کا احترام کرتے ہیں۔ ہم سب ایک خاندان کی طرح ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ ماں' بیٹا' بہو' بچے۔ ان باہر کے ملکوں میں تو سب ہی مادر پدر آزاد ہو گئے ہیں۔ تمہیں تو معلوم ہو گا کہ ماں باپ بچے پیدا کر کے کتے بلی کے مانند چھوڑ دیتے ہیں۔ خون کے رشتے اور رشتوں کی محبت تو ختم ہو گئی ہے ان ملکوں میں۔ ہمارے مرد جو تم دیکھتے ہو نا' یہ سب سیاح عورتوں کا دل بہلانے اور ان سے روپیہ بٹورنے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ اپنے لوگوں کے ساتھ یہ بہت شرافت سے پیش آتے ہیں۔" پھر وہ آواز نیچی کر کے بولی "سینور! ایک اور شرم کی بات بتاؤں تمہیں؟"

"ہاں ہاں بتاؤ"

اس کی آواز نے سرگوشی کی شکل اختیار کر لی "یہ جو عورتیں ہیں نا' جو باہر سے سیر کے لئے آتی ہیں' یہ تو محبت کرنے کا معاوضہ بھی دیتی ہیں ہمارے مردوں کو۔"

"اچھا!" ہم نے حیرت کا اظہار کیا۔

"اور کیا۔ پیسے دیتی ہیں۔ کپڑے' جوتے' تحائف دیتی ہیں اور اپنا جسم بھی تحفے میں پیش کر دیتی ہیں۔ بڑی خراب ہیں۔ پتا نہیں ان کے گھر والے انہیں کیوں نہیں روکتے۔ دیکھتے نہیں بوڑھی کھوسٹ عورتوں کے سوا سبھی تقریباً اکیلی پھرتی ہیں یا پھر لڑکیوں کی ٹولیاں ہوتی ہیں۔ بڑی عمر کی عورتیں کم عمر لڑکوں کے اخلاق کو خراب کرتی ہیں۔" لولو کو انگریزی میں زیادہ دسترس نہیں تھی مگر اس نے ملی جلی انگریزی اور اطالوی میں اپنی لمبی سی تقریر ختم کر کے ہی دم لیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور مارے غصے کے وہ تیز تیز سانسیں

لے رہی تھی۔

"میرا خیال ہے تم تھک گئی ہو' کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔ تم کیا پیو گی؟"

"وائین' مگر انگور والی۔"

"وہ تو شراب ہوتی ہے۔"

"بالکل نہیں' ہمارے ہاں بچے بھی شربت کی طرح پیتے ہیں۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ ہمارے ملک میں انگور کے باغ بہت زیادہ ہوتے ہیں اور یہاں کی انگور کی شراب اور وائین ساری دنیا میں مشہور ہے۔"

میں نے کہا "مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ دراصل ہم لوگ مسلمان ہیں۔ شراب وائین وغیرہ نہیں پیتے۔"

وہ حیران ہو گئی "بالکل نہیں پیتے؟ کوئی بھی نہیں؟"

ہم نے کہا "تھوڑے بہت لوگ پیتے ہیں مگر انہیں کوئی اچھا نہیں سمجھتا۔"

"تو کیا تم نے واقعی کبھی شراب نہیں پی' کبھی بھی؟"

"ایمان سے' تمہارے سر کی قسم" میں نے اس کے سنہری بالوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"سچ' تم تو بہت عجیب آدمی ہو' سینٹ لگتے ہو۔ کیا کوئی راہب ہو؟"

"نہیں' عام آدمی ہوں۔"

وہ کچھ دیر کے لئے رک گئی۔ پھر بولی "ایک بات بتاؤ گے بالکل سچ سچ؟"

ہم نے کہا "بولو"

"ایسے نہیں' میرے سر کی قسم کھاؤ۔"

"تمہارے سر کی قسم" ہم نے بڑی فراخدلی سے سوچے سمجھے بغیر کہہ دیا۔

"تم ناراض تو نہیں ہو جاؤ گے؟"

"کہہ جو دیا کہ نہیں۔"

"کیا تمہاری شادی ہو گئی ہے؟"

"ہت تیرے کی' اس بات کے لئے اتنی قسمیں اور وعدوں کی کیا ضرورت تھی نہیں بھئی ذرا دیر ہو گئی ہے مگر ابھی شادی نہیں ہوئی۔"

اس نے سر سے پیر تک مجھے دیکھا "عمر تو تمہاری کم نہیں ہے۔"

"ہاں تیس بتیس ہو گی۔"

"تو شادی کیوں نہیں کی؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے"

"پیار ہو گیا تھا کسی سے؟ اس نے کسی اور سے شادی کر لی"

"ارے نہیں' بس ایسے ہی کچھ گھریلو پرابلمز تھیں' پھر میں بیمار ہو گیا۔"

"گھریلو پرابلمز؟ مگر تمہاری تو شادی ہی نہیں ہوئی؟"

"سنو لولو! تم ہمارے ملک کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں' ہم لوگ' خاندان کے سب لوگ ایک ہی جگہ رہتے ہیں۔ ماں باپ' بہن بھائی' ان کے بچے اور سب مل کر اپنے کنبوں کو پالتے ہیں۔ وہی ہمارا گھر ہوتا ہے۔ شادی کے بعد بیوی بھی اکثر اسی گھر میں رہتی ہے۔"

وہ حیران ہو گئی "خاندان کے لوگ تو ہمارے ہاں بھی اکثر ایک ساتھ رہتے ہیں مگر سب اپنا اپنا خرچ اٹھاتے ہیں۔"

"بس یہی فرق ہے مغرب اور مشرق میں۔ شاید کچھ عرصے بعد ہم بھی تمہارے جیسے ہو جائیں۔"

ہم ایک فٹ پاتھ کے ریستوران میں جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے دودھ منگوایا۔ شاید میرے احترام میں اس نے بھی کوک طلب کیا "جھینگے کھاؤ گے؟"

"میں نہیں کھاتا"

"مچھلی؟"

"اگر کانٹے دار نہ ہو تو کھا لوں گا۔"

وہ ہنسنے لگی "نخرے بہت کرتے ہو' تمہاری بیوی بہت پریشان رہا کرے گی۔"

پھر وہ ایک دم سیریس ہو گئی "تم نے سچ سچ بتانے کا وعدہ کیا تھا نا؟"

"بھئی بتا تو دیا"

"ابھی تو میں نے پوچھا ہی نہیں ہے۔"

"تو پھر پوچھو۔"

وہ بینچ نما کرسی پر میرے قریب کھسک آئی' پھر رکتے رکتے کہنے لگی "شادی تو

تمہاری ہوئی نہیں ہے۔"

"ہاں' وہ تو ہے"

"اور تمہاری عمر بھی کم نہیں ہے۔"

ہم نے سر ہلا دیا۔

"تم نے کبھی لڑکیوں سے دوستی کی ہے' میرا مطلب ہے عورتوں مردوں والی دوستی۔"

"تمہارا مطلب ہے افیئر؟" ہم نے اس کی مشکل آسان کر دی۔

"ہاں۔"

"نہیں' ہمارے ہاں اس کو گناہ سمجھا جاتا ہے۔"

وہ بے حد تعجب سے مجھے دیکھنے لگی "سچ کہتے ہو؟"

"تمہارے سر کی قسم" میں نے پھر اس کے سنہرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایک لمحے وہ مجھے دیکھتی رہی' پھر میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہنے لگی "تم کتنے عجیب آدمی ہو"

میں نے کہا "ہمارے ملک میں یہ کوئی عجیب بات نہیں ہوتی زیادہ تر لوگ ایسا ہی کرتے ہیں" وہ بے یقینی سے میرا چہرہ دیکھتی رہی' پھر میرا ہاتھ اپنے سر سے ہٹا کر اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور مدھم آواز میں بولی "میرا دل بھی یہی کہتا تھا کہ تم اچھے اور نیک آدمی ہو' تم تو پادریوں سے بھی زیادہ نیک ہو۔"

میں کچھ جھینپ سا گیا۔ بات ٹالنے کے لئے کہا "تم یہاں کس کے ساتھ رہتی ہو؟"

"میری دادی ہے' میرے پپا روم میں کام کرتے ہیں' آتے رہتے ہیں' میری مما نہیں ہے' ایک بہن تھی وہ امریکا چلی گئی ہے۔"

"وہ کس لئے؟"

"اس کی شادی ہو گئی تھی۔ تم جانتے ہو؟ امریکا میں رہنے والے اطالوی بھی شادی کے لئے اپنے ملک میں آتے ہیں اور یہاں کی لڑکیوں سے شادی کر کے انہیں لے جاتے ہیں۔ وہاں کی لڑکیوں کو وہ پسند نہیں کرتے۔ ہمارے اور ان کے طور طریقوں میں بہت فرق ہے۔"

اتنی دیر میں ہم پھر نہر پر پہنچ گئے تھے۔ اس نے ایک گنڈولے والے کو آواز دی اور کچھ مول تول کرنے کے بعد ہم گنڈولے میں بیٹھ گئے۔

"میری دادی اور پپا بہت اچھے ہیں۔ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔"

"خاک خیال رکھتے ہیں' اتنی دیر سے تم میرے ساتھ گھوم رہی ہو اور انہیں فکر ہی نہیں ہے۔"

"تو کیا ہوا" وہ سر جھٹک کر مسکرائی "انہیں مجھ پر بھروسا ہے۔ میں تمہیں ایک بات بتاؤں؟"

"بتاؤ"

"میں نے کبھی گناہ نہیں کیا۔ کیا تم یقین کرو گے؟"

"کیوں نہیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ نہایت صاف شفاف اور بے داغ آنکھیں تھیں۔

"شکریہ سینور!" اس نے پھر میرے بازو سے سر ٹکا دیا۔ "ہمارے ملک میں زیادہ تر لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ اسے ہم گناہ سمجھتے ہیں۔ خیر پیار کرنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ کیوں؟"

میں نے کہا "ہاں' بہت چھوٹا گناہ ہوتا ہے مگر ہمارے ملک میں تو اسے بھی اچھا نہیں سمجھتے۔"

وہ ایک دم جھٹکے کیساتھ اٹھ کر بیٹھ گئی "تمہارا ملک تو بہت عجیب و غریب ہے۔ لگتا ہے وہاں کوئی خراب آدمی نہیں ہوتا۔"

میں نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی "کیسا ہے تمہارا ملک پاکستان؟"

"بہت خوبصورت' بہت اچھا ہے۔"

"اپنا ملک تو سبھی کو اچھا لگتا ہے" اس نے ایک آہ بھری۔

"یہ بات نہیں ہے' میرا ملک واقعی بہت اچھا ہے۔"

"ٹھیک ہے' کبھی دیکھوں گی تو پتا چلے گا۔"

ایک گنڈولا والا ہمارے نزدیک سے گزرا اور پانی کی چھینٹیں ہمارے اوپر آئیں۔ میں نے چونک کر دیکھا تو خان صاحب اور بٹ صاحب ہاتھوں سے پانی اچھال رہے تھے۔

بٹ صاحب ہنس رہے تھے۔ خان صاحب کے چہرے پر بھی ناراضگی کے آثار نہیں تھے" عیش کرو بچو!" انہوں نے نعرہ لگایا "واپس کب آؤ گے؟"

ہم نے کہا "جب فرصت ملے گی" ان کا گنڈولا مخالف سمت میں آگے چلا گیا "تمہارے دوست بہت اچھے ہیں" وہ بولی۔

"دوست تو سبھی اچھے ہوتے ہیں مگر سنو۔ تم نے خان صاحب کے ساتھ زیادتی کی ہے"

"کون' وہ لمبے سے اونچے قد والے جو بالکونی میں ورزش کر رہے تھے؟"

"ہاں وہی۔ وہ تمہیں پسند کرنے لگے تھے۔"

"میں بھی انہیں پسند کرتی ہوں مگر تم زیادہ پسند ہو مجھے۔"

ہمارا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ یکایک پھر جھٹکے سے اٹھی اور ننھا سا گنڈولا ڈول گیا "چلو' گھر چلتے ہیں' تمہیں اپنی دادی سے ملاؤں؟"

"چلو"

پتا نہیں کن راستوں' نہروں اور گلیوں سے گزر کر ہم پھر اپنے ہوٹل پہنچ گئے۔ وہ میرا ہاتھ تھام کر اپنے گھر کی طرف لے گئی "تھوڑی سی انگریزی بھی جانتی ہیں دادی۔ دو سال لندن میں رہی تھیں۔"

چوبی دروازے پر ایک کنڈا سا لگا ہوا تھا۔ مکان یہ بھی سنگ مرمر اور پتھروں کا بنا ہوا تھا۔ کنڈا بجا کر اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھول دیا "آ جاؤ" میں ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہو گیا سامنے ایک گیلری تھی جس کے دونوں طرف دروازے تھے۔

"دادی' دادی" اس نے آواز دی "دیکھو کون آیا ہے؟"

ایک کمرے سے دادی کی آواز آئی۔

"سپولا؟"

شاید لولو کے باپ کا نام تھا۔ ہم دونوں کمرے کے دروازے پر پہنچ کر رک گئے۔ اندر قالین کا فرش تھا اور پرانی طرز کا فرنیچر سجا ہوا تھا۔ سامنے ایک آرام دہ بڑے سے صوفے پر ایک گوری چٹی بھاری جسم کی بڑی بی تشریف فرما تھیں اور انگور کے دانے کھا رہی تھیں۔ بال ان کے قریب قریب سفید ہو چکے تھے' بہت دلکش شخصیت تھی۔ انہوں نے ہاتھ کا چھجا بنا کر ہمیں دیکھا اور پھر پوچھنے لگیں "یہ کون ہے "یونیورسٹی کا دوست ہے کوئی؟"

ان کی اطالوی کا لولو نے ترجمہ کر کے سنایا پھر ان سے کہا "دادی! یہ بہت نیک آدمی ہیں۔ سینٹ ہیں پورے۔"

دادی نے ایک بار پھر غور سے دیکھا "سینٹ اور اتنا کم عمر اور داڑھی بھی نہیں ہے۔"

لولو ہنسنے لگی۔ مجھے مطلب بتانے کے بعد دادی کو بتایا کہ یہ پاکستان سے آئے ہیں جو بہت دور ہے۔

"ہاں' ہاں۔ جانتی ہوں' ترکی اور روس کے پاس ہے۔"

وہ شاید ترکستان سمجھ رہی تھیں۔

"نہیں' یہ انڈیا کے پاس ہے' تاج محل کے پاس ہے۔"

وہ سرہلانے لگیں "تو یہ کہو کہ انڈیا سے آئے ہیں" لولو نے وضاحت کرنی چاہی مگر میں نے روک دیا۔ "اچھا دادی! اب انہیں مزے دار کافی پلانی ہے اور کیک کھلانا ہے۔"

"سبز وائین رکھی ہے۔"

"یہ وائین' کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ کہتے ہیں گناہ ہے اور سنو دادی! انہوں نے کبھی کسی لڑکی سے دوستی بھی نہیں کی۔ شادی جیسی دوستی۔"

دادی نے بے اعتباری سے دیکھا' پھر سرہلا کر چپ ہو گئیں انگوروں کی پلیٹ ہاتھ سے رکھ کر وہ گھٹنوں پر دونوں ہاتھ ٹیک کر کھڑی ہو گئیں اور منہ ہی منہ میں کچھ کہتی ہوئی ایک طرف کو چل دیں۔ لولو لپک کر ان کی جگہ پر نیم دراز ہو گئی اور اشارا کر کے مجھے بھی اپنے پاس بٹھا لیا۔

"شائد دادی نے مجھے پسند نہیں کیا" میں نے کہا۔

"ارے نہیں' دراصل انہیں میری بات کا یقین نہیں آیا ہے کہ تم ایسے ہو سکتے ہو۔ اچھا سنو' میں تمہیں کیسی لگتی ہوں؟"

"بہت اچھی۔"

"سنو' مجھ سے شادی کرو گے؟"

میرا سارا جسم ایک دم جھنجھنا اٹھا۔ ایک غیر ملک میں اس قدر خوبصورت لڑکی خود ہی مجھے شادی کا پیغام دے رہی تھی۔ زندگی میں ایسا پہلا اتفاق ہوا تھا۔ میں تو بوکھلا کر خاموش ہی رہا۔

"کیوں، مجھے پسند نہیں کرتے کیا؟"

"یہ بات نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ماں باپ اور گھر والوں کی مرضی کے بغیر شادی نہیں ہوتی۔"

اس کی حیرانی میں اور اضافہ ہو گیا "اور اگر وہ منع کر دیں؟"

"تو شادی نہیں ہوتی۔"

"ٹھیک ہے" اس نے ایک لمبی سانس لی "تم واپس جاؤ گے تو ان سے پوچھنا۔ میں تمہیں اپنی تصویر دے دوں؟"

"ہاں ضرور۔"

"اور اپنا ایڈریس بھی دے دوں گی۔ تم مجھے خط لکھو گے؟"

"کیوں نہیں۔"

"تم واپس کب جاؤ گے؟"

"ابھی تو مجھے اور بھی کئی جگہ جانا ہے ایک ڈیڑھ مہینے بعد واپس گھر پہنچوں گا۔"

"اوہ، بہت لمبا انتظار کرنا پڑے گا۔ خیر اگر سینٹ مہربان ہو گئے تو کوئی مشکل بھی نہیں ہے۔ تم سینٹوں پر یقین رکھتے ہو؟"

"ہمارے ہاں پیر فقیر ہوتے ہیں۔ وہ بھی سینٹ ہی ہوتے ہیں مگر میں ان پر یقین نہیں رکھتا۔"

"وہ کیوں؟"

"میں صرف خدا پر یقین رکھتا ہوں کیونکہ سب کچھ صرف اسی کے اختیار میں ہے۔"

وہ آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھتی رہی۔ کافی دیر دیکھتی رہی، پھر میرا بازو تھپک کر کہنے لگی "تم بہت عجیب آدمی ہو۔ پتا نہیں ایسے آدمی سے شادی کرنی بھی چاہئے کہ نہیں؟"

"ابھی تو سوچنے کے لئے بہت وقت پڑا ہے۔"

اتنی دیر میں دادی اماں ٹرالی گھسیٹتی ہوئی آ گئیں۔ ٹرالی میں وائین بھی تھی، دودھ کا جگ بھی تھا، کیک بھی تھا، بیئر کے ڈبے بھی تھے۔ انہوں نے سبز رنگ کی بڑی خوبصورت بوتل اٹھا کر ایک نازک سے شیشے کے گلاس میں انڈیلی اور بولیں "اپنے دوست سے کہو، بہت اچھی میٹھی وائین ہے۔"

"نہیں دادی! یہ وائین نہیں پیتے، بیئر بھی نہیں۔ انہیں دودھ دے دو۔"

اس نے خود اٹھ کر ایک نازک سے شیشے کے گلاس میں دودھ انڈیلا اور مجھے دے دیا۔ بڑی بی نے سبز وائین کا گلاس اس کی طرف بڑھایا مگر اس نے سر ہلا کر انکار کر دیا "دادی! یہ تم پی لو میں بھی دودھ پی لوں گی۔"

دادی کی جہاندیدہ اور حیران نگاہیں باری باری اسے اور مجھے دیکھنے لگیں، پھر ان کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔ مسکرا کر انہوں نے اطالوی میں کچھ کہا اور لولو مسکرانے لگی، پھر سر ہلا کر اطالوی میں کچھ جواب دیا اور پھر خاموش ہو گئی دادی اماں نے سبز وائین کا گلاس اٹھایا اور شربت کی طرح گھونٹ گھونٹ پینے لگیں۔

لولو نے کہا "اس کے بعد کافی بنا لاؤں گی۔"

شام ہو گئی اور ہم دونوں بلکہ ہم تینوں کافی پیتے رہے، کیک کھاتے رہے اور نہ جانے کیا کیا باتیں کرتے رہے۔ دادی اپنی جوانی کے زمانے کے قصے سناتی رہیں اور لولو ترجمہ کرتی رہی۔ لولو اٹلی اور وینس کی داستانیں سناتی رہی۔ میں انہیں پاکستان کے بارے میں سناتا رہا۔ اپنے ملک کے رسم و رواج، موسموں، لوگوں کے متعلق بتاتا رہا۔ وہ بہت حیرانی اور دلچسپی سے سن رہی تھیں۔ درمیان میں سوال بھی کرتی جاتی تھیں۔ اس طرح شام ڈھل گئی دادی نے اسپاگیٹی بنائی اور انڈوں کو پھینٹ کر فرائی کر لیا پھر روٹی کے ٹکڑے کاٹ کر لے آئیں۔ پنیر، جام اور مچھلی بھی تھی میں نے پہلے ہی اطمینان کر لیا تھا کہ حلال خوراک ہی موجود ہے "ہم لوگ سور نہیں کھاتے۔ ہمارے مذہب میں حرام ہے" وہ دونوں مزید حیران ہو گئیں۔

لولو پر تو جیسے سحر سا طاری ہو گیا تھا "تم تو واقعی سینٹ ہو، کیا تمہارے ملک میں سبھی لوگ ایسے نیک اور پرہیزگار ہوتے ہیں؟"

"زیادہ تر" میں نے کہا۔

"اور تم اتوار کو گرجا بھی جاتے ہو عبادت کے لئے۔"

میں نے انہیں نماز کے بارے میں بتایا۔ ان کی حیرانی بڑھتی جا رہی تھی "واقعی! تم ہر روز پانچ بار عبادت کرتے ہو۔ اپنے گھر میں بھی' دفتر میں بھی' گرجا میں بھی؟" انہوں نے اتنی حیران کرنے والی گفتگو شائد پہلے کبھی نہیں سنی ہو گی۔

کھڑکی میں سے شفق نظر آئی' پھر اندھیرا چھا گیا اور روشنیاں جگمگانے لگیں۔ گھڑی دیکھی تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ دادی جمائیاں لیتی ہوئی اپنے بیڈ روم کی طرف چلی گئیں۔ ہم دونوں کمرے میں اکیلے رہ گئے۔ دونوں خاموش تھے۔ شاید ہمارے پاس الفاظ اور معلومات ختم ہو گئی تھیں یا پھر ہم بولتے بولتے تھک گئے تھے۔ کچھ دیر اسی طرح خاموشی میں گزر گئی' پھر لولو نے ہولے سے کہا "اب تم اپنے ہوٹل جاؤ۔ میں تمہیں چھوڑ آتی ہوں۔"

سامنے ہی تو ہوٹل تھا۔ ہم دونوں ہوٹل کے پاس جا کر ایک سنگ مرمر کے ستون سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ نہ جانے کو جی چاہ رہا تھا نہ رکنے کو۔

"اچھا' خدا حافظ" اس نے ہولے سے کہا اور میرا ہاتھ دبایا۔

"خدا حافظ۔ تم اپنی تصویر اور ایڈریس کب دو گی؟"

وہ کچھ دیر چپ رہی' پھر بولی "میں تم سے شادی نہیں کر سکتی تم انسان نہیں ہو کچھ اور چیز ہو اور پھر تمہارے رسم و رواج اور طریقے ہم سے الگ ہیں۔"

اس کی سوجھ بوجھ اور ہوش مندی نے مجھے بہت متاثر کیا۔ ظاہر ہے اس کے ساتھ شادی کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ میں نے اس بارے میں ایک لمحے کے لئے بھی سنجیدگی سے نہیں سوچا تھا مگر جب اس نے صاف انکار کر دیا تو میرا دل اداس ہو گیا یک بیک ایک تھکن اور غم کے احساس نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس نے بڑی حقیقت پسندانہ بات کی تھی۔ وہ بہت سمجھدار اور باشعور لڑکی تھی۔ میں نے تو اسے حیرت زدہ کیا ہی تھا مگر اس نے بھی مجھے حیران کر دیا تھا۔

ہم دونوں نے مصافحہ کیا اور رخصت ہو گئے۔ وہ بھاگتی ہوئی اپنے گھر کی جانب چلی گئی۔ دروازے پر رک کر پلٹ کر دیکھا' ہاتھ ہلایا اور غائب ہو گئی۔ میں وہیں کھڑا سوچتا رہا' آج کا دن ایک حقیقت تھی یا خواب؟ کہیں یہ میرا واہمہ یا تصور تو نہیں تھا مگر اس کی

خوشبو میرے ہاتھوں میں بسی ہوئی تھی اور سامنے اس کے گھر کے دروازے کا کنڈا اب تک آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔

یہ میری زندگی کا عجیب و غریب اور بالکل انوکھا تجربہ تھا۔

آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا میں ہوٹل میں داخل ہوا۔

معلوم ہوا کہ کمرے کی چابی اوپر ہی ہے۔ کمرے کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ کھولا تو خان صاحب اور بٹ صاحب صوفوں پر منتظر بیٹھے تھے اور شاید اونگھ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بالکل چاق و چوبند اور ہوشیار ہو گئے "سناؤ' کیسی گزری؟ تم تو شاید اب زندگی بھر یہاں سے نہیں جاؤ گے استاد؟"

میں خاموش ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں میری یہ حالت دیکھ کر حیران رہ گئے "کیا بات ہے۔ خیریت تو ہے؟"

"خیریت ہی ہے۔ ہم لوگ کل صبح جا رہے ہیں۔"

"کیا؟" وہ دونوں بیک آواز بولے۔

"بس یار! سب کچھ تو دیکھ لیا۔ اب وینس میں رہ کیا گیا ہے۔ دیکھنے کو؟"

"او لولو......؟"

"وہ اسی موسم کا پرندہ ہے۔ یہیں رہنے دو اسے۔ یہ آب و ہوا ہمیں راس نہیں آئے گی۔"

"سچ کہتے ہو" بٹ صاحب نے انگڑائی لی "میرا بھی جسم ٹوٹ رہا ہے صبح سے بڑی مرطوب آب و ہوا ہے"

"کہتے تو ٹھیک ہو یار!" خان صاحب بولے "وینس تو اب دیکھ لیا' بلاوجہ وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ اور شاید تمہاری بھی لڑائی ہو گئی ہے اس لونڈیا سے؟"

میں نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ خاموشی سے لباس تبدیل کرنے غسل خانے چلا گیا۔ واپس کمرے میں آیا تو وہ دونوں جا چکے تھے۔

کافی دیر نیند نہیں آئی۔ یہ عجیب لڑکی مجھے کیوں مل گئی؟ یہاں زیادہ دیر نہ رہنا ہی بہتر ہے۔ اسے تو اپنی عقل کی ہمراہی حاصل ہے مگر شاید جذبات مجھے عقل سے بے گانہ کر دیں؟ وہ ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ ہم دو مختلف دنیاؤں کی مخلوق ہیں۔

چلو' جو ہوا' اچھا ہی ہوا۔

میں کروٹ لے کر سو گیا۔ صبح ہم لوگ ناشتے سے فارغ ہو کر ہوٹل سے رخصت ہونے لگے تو سامنے والی بالکونی کی محراب دار کھڑکی بند تھی شاید وہ ابھی تک سو رہی تھی۔

خان صاحب نے کہا "یار! اسے خدا حافظ تو کہنا چاہیئے کتنی بد اخلاقی ہے"

"وہ تو کل ہی کہہ دیا تھا۔ اسے جگانے سے کیا فائدہ۔"

ہم سامان لٹکائے ہوئے گلی میں پہنچ گئے۔

"مگر تم دونوں اتنی دیر تک رہے کہاں؟ اور بات بگڑ کیوں گئی ایک دم؟"

خان صاحب کی سمجھ میں یہ مسئلہ نہیں آ رہا تھا۔ اب انہیں کیا بتاتا کہ بات بگڑی نہیں تھی بلکہ ڈر یہ تھا کہ کہیں بات بن گئی تو کیا ہو گا؟

گنڈولا' پھر اسٹیمر اور پھر ویگن اور اس طرح ہم وینس کی دیوی کو پیچھے چھوڑ کر آگے چل پڑے۔